ادب شناسی

ملک مقبول احمد

ادب شناسی

ملک مقبول احمد

MAQBOOL ACADEMY
مقبول اکیڈمی، لاہور

انتساب

پروفیسر، ممتاز ادیب اور دانشور

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

☆☆☆

صحافی، دانش ور، کالم نگار

جناب سرفراز سید

☆☆☆

ممتاز ادیبہ، ناول نگار

محترمہ عذرا اصغر

☆☆☆

ناول نگار، سفر نامہ نگار

محترمہ بلقیس ریاض

☆☆☆

اور

ان سب دوستوں کے نام
جن کی تحریروں کی خوشبو سے یہ کتاب معمور ہے

☆☆==☆==☆☆

فہرست

پیش لفظ

میں اپنی خودنوشت سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' کے ابتدائی ایڈیشنوں میں اپنی کم علمی کا اعتراف کر چکا ہوں اور یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ یہ سوانح عمری مجھ سے میرے پوتے پوتیوں اور نواسیوں نے لکھوائی ہے۔ اور اس کی اشاعت میری زندگی کا اس لیے اہم ترین واقعہ ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی پوری اردو دنیا میں وسیع پیمانے پر ہوئی۔ یہ میرا اعزاز ہے کہ ایک سو سے زیادہ دانشور اہل قلم نے اس کتاب پر تبصرے لکھے اور میری سادہ صدق بیانی کی تحسین کی۔ چنانچہ تقاضا کیا جاتا رہا کہ اس کے نئے ایڈیشنوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اب تک جو تبصرے لکھے جا چکے ہیں وہ تین کتابوں ...... ''پذیرائی'' ...... ''اہل قلم کے خطوط'' ...... اور ''شناسائی'' میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

میرے دوستوں کی کرم فرمائی کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور زیر نظر کتاب ''ادب شناسی'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میں اپنے ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری معمولی سی کاوش کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ زیر نظر کتاب ''ادب شناسی'' میں نئے تبصروں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کتاب میں سابقہ کتابوں کے دوست بھی آپ کو موجود نظر آئیں گے اور آپ ان کے خیالات و تصورات سے بھی آگہی حاصل کر سکیں گے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں پیشہ ور مصنف نہیں ہوں۔ ''سفر جاری ہے'' میں نے شوقیہ لکھی تھی اور اپنے بچوں کی فرمائش پوری کی تھی لیکن یہ تجربہ اتنا روح پرور ثابت ہوا کہ

میں قلم اور قرطاس کی دنیا میں عملی طور پر آ گیا اور بڑھاپے کا یہ عشق اب مجھے تازگی اور توانائی عطا کر رہا ہے۔ لیکن میں اب بھی اپنی کم علمی کا اعتراف کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری کسی کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشاندہی سے گریز نہ کریں۔ میں دانشور اہل قلم حضرات کا خدمت گزار ہوں اور اپنی اس حیثیت پر نازاں ہوں۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

ملک مقبول احمد

سدید نامہ

یہ ''سدید نامہ'' پڑھنے کے بعد' آپ میرے ساتھ ضرور اتفاق کریں گے کہ مقبول اکیڈمی لاہور کے ناشر' ملک مقبول احمد قدرت کا کرشمہ ہیں اور یہ کرشمہ اس وقت ظہور میں آیا جب ملک صاحب کے باطن سے اچانک ایک ادیب نکل آیا اور وہ ملک کے بے شمار نامور ادیبوں' افسانہ نگاروں' شاعروں اور دانشوروں کی کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے اور اشاعت کی کامیاب منزل سے گزارنے کے بعد اپنی کتابیں بھی چھاپنے لگے اور دیکھتے دیکھتے متعدد ضخیم کتابوں کے مصنف اور مؤلف بن گئے۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' میں انہوں نے اس کا کریڈٹ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسیوں کو دیا ہے' جو اپنے دادا ابو سے ان کی زندگی کے کامیاب سفر کی کہانیاں سنتے تو ایک دن کہنے لگے ''دادا ابو' آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنی سوانح حیات لکھیں''۔ پہلے تو ملک مقبول احمد یہ کہہ کر انکار کرتے رہے کہ وہ ادیب نہیں ہیں اور آپ بیتی لکھنا تو بڑا جان جوکھوں کا کام ہے لیکن آخر انہیں اپنی دوسری نسل کے بچوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور انہوں نے یہ فرمائش ''سفر جاری ہے'' لکھ کر پوری کردی۔ ان کے معمول کے اس عمل کی غیر معمولی بات یہ ہے کہ اس کتاب کو کسی ناشر کی نہ صرف پہلی سوانح عمری تسلیم کیا گیا بلکہ اُردو دنیا میں جس قلم کار کے پاس یہ کتاب پہنچی اس نے اپنی جچی تلی بے لاگ رائے کتاب پر لکھ کر ضرور دی اور پھر ان تبصروں پر مشتمل ایک اور کتاب معرض وجود میں آ گئی جس کا نام ہے ''پذیرائی''۔

ملک صاحب نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے دوران اس ادیب کو زندہ رکھا جو گزشتہ نصف صدی سے کتابوں اور مصنفوں کی معیت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ کرشمے کی بات یہ ہے کہ وہ ''پذیرائی'' میں ایک خاکہ نگار کی حیثیت میں بھی سامنے آئے اور انہوں نے اعتراف تشکر کے لئے مقبول اکیڈمی سے وابستہ ادیبوں کے تعارفی خاکے بھی اس کتاب میں شامل کر دیئے اور پھر اس صنف ادب میں ایسے رواں ہوئے کہ ایک اور کتاب ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' کے عنوان سے پیش کر دی۔ ترکی کے سفر پر گئے تو واپسی پر اس سفر کی یادداشتوں پر مبنی ایک سفرنامہ لکھ دیا۔ یوں تو وہ کہتے ہیں کہ اب انہوں نے مقبول اکیڈمی کے طباعتی اور اشاعتی امور اپنے بچوں کو سونپ کر ''ریٹائرمنٹ'' اختیار کر لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ادیب کی حیثیت میں ایک نئی زندگی شروع کی ہے' جس کی تابانیاں اتنی پھیل چکی ہیں کہ جناب صہیب مرغوب نے روزنامہ ''جنگ'' میں ۲۰۱۱ء کے ادبی واقعات کا ایک جائزہ پیش کیا تو اس میں ملک مقبول احمد کا بطور مصنف تذکرہ کیا۔ انفرادی نوعیت کی ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو انشائیہ کے ایک بنیاد گزار اور معروف نقاد پروفیسر جمیل آذر نے ''سفر جاری ہے'' میں اپنی دیہی زندگی کے نقوش دیکھے تو ملک مقبول احمد پر ایک بھرپور کتاب ''رہ نوردِ شوق'' کے عنوان سے لکھ ڈالی اور انہیں ناشرین کی وسیع برادری میں ایک مصنف کے طور پر متعارف کرایا جس کا شعلہ اظہار جوانی کی بہار گزر جانے کے بعد بھڑکا تھا اور اب اپنی خرگوش رفتاری سے ساری زندگی ادب کی ریاضت کرنے والے ادیبوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس حقیقت کی صداقت ان تبصروں سے بھی ہمارے سامنے آتی ہے' جو زیرنظر کتاب میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ فن اور شخصیت کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کے متعدد ادیبوں پر نظر افروز کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی ادیب کو

اپنی کسی ایک معروف ترین تصنیف پر اتنی بڑی تعداد میں تبصرے نصیب نہیں ہوئے جتنے ملک مقبول احمد کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں اور تبصروں کی یہ کتاب بھی اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ میں یہ ''سدید نامہ'' ان تبصروں کے حوالے سے ہی لکھ رہا ہوں۔

واضح رہے کہ ملک مقبول احمد اب زندگی کے اس دور سے گزر رہے ہیں جب آخرت سنوارنے کا خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور زندگی کے گزرے ہوئے دور کی باتیں، وارداتیں اور حکایتیں یاد آتی ہیں تو باطن سے یہ آواز بھی آتی ہے کہ کاش! اس دور میں ایسا نہ ہوتا۔ احساس کے اس مقام پر اکثر لوگ خیر کثیر کی تقسیم کبیر کرنے لگتے ہیں۔ ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے ہموار زندگی گزاری ہے اور اب فلاحِ عامہ کے لئے ایسی کتابیں چھاپ کر بلا قیمت تقسیم کر رہے ہیں جو صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ ان کی کتاب ''پیغمبر عالمؐ'' ایسی ہی ایک راہنما کتاب ہے جس میں عشق رسولؐ کے پھول ہی پیش نہیں کئے گئے بلکہ پورا گلشن کھلایا گیا ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر اظہار احمد گلزار، امین راحت چغتائی، پروفیسر جمیل آذر، افتخار مجاز، حافظ حسین احمد حقانی، مرزا خلیل احمد بیگ، سعید بدر قادری، سید شبیر حسین شاہ زاہد، محمود جمال، علی سفیان آفاقی، علامہ عبدالستار عاصم اور انور سدید نے اظہار خیال کیا ہے۔ ممتاز صحافی علی سفیان آفاقی نے لکھا ہے:

> ''رسولِ کریم ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں اب تک بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ زیرِ نظر کتاب (پیغمبر عالمؐ) اس سمندر میں ایک بوند کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس ایک بوند میں مصنف (ملک مقبول احمد) نے سیرت کی بے شمار کتابوں کے مطالعے اور تحقیق کے بعد سیرت النبیؐ کے بارے

میں اپنی ایک مختصر مگر جامع کتاب پیش کی ہے جس کا مطالعہ کرنے
کے بعد...... آنحضورؐ کی حیات طیبہ کے بارے میں ہم ضروری
معلومات حاصل کر سکیں گے۔''

ہندوستان کے نامور نقاد مرزا خلیل احمد بیگ کا انداز دعائیہ ہے:

''اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی حسنات سے نوازے اور اس
کتاب کو بہت سے لوگوں کی ہدایت اور ایمان کا موجب بنائے اور
ان کی زندگیوں میں ایک تغیر پیدا کر دے جو آنحضرتؐ کی بعثت کا
مقصد عظیم تھا کہ ہم اسی خدا کے حضور میں جھکنے والے بن جائیں۔''

ملک مقبول احمد کی کتاب ''سیاحت نامہ ترکی'' پر ملک محمد محبوب الرسول قادری،
ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ، علامہ عبدالستار عاصم اور نذیر حق کے تبصرے
تحسین سخن شناس کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس سیاحت نامے کو جناب امین راحت چغتائی نے
ایسی کتاب شمار کیا ہے جس میں تاریخ اور سیاحت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی
رائے میں:

''ملک مقبول احمد ایک یا چند جملوں میں پتے کی بات کہنے کا سلیقہ
رکھتے ہیں۔ نہایت سادہ مگر دل نشیں اسلوب میں یہ سفرنامہ خاصے کی
چیز ہے...... مصنف کی راست روی اور سچائی نے نہ صرف اسے
ژولیدگی سے محفوظ رکھا ہے بلکہ کسی طرح کی تعلّی اور خودنمائی کو راہ
دینے کی بجائے اس کی بنیاد عجز، انکسار اور اخلاص و محبت پر استوار کی
ہے۔''

''پچاس نامور ادبی شخصیات'' پر تبصروں کی تعداد انگلیوں کی تعداد سے زیادہ

ہے۔ ان میں انجم ابصار‘ راجہ عدیل بھٹی‘ پروفیسر جمیل آذر‘ حکیم عزیز الرحمان جگرانوی‘ جسٹس (ر) عباس خان‘ ڈاکٹر تنویر حسین‘ میاں محمد ابراہیم طاہر‘ انوار قمر‘ خالد ابن یزدانی اور حمید اختر کے تبصرے بے حد اہم ہیں۔ اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کے تجزیے کے مطابق:

''ملک مقبول احمد کی یہ کتاب (پچاس نامور ادبی شخصیات) خاکہ اور مضمون نگاری کی ملی جلی پیشکش ہے۔ کچھ لوگ تو واقعی نامور ہیں۔ کمیوں کو ملک مقبول احمد نے نامور بنا دیا ہے۔ احسان دانش‘ میرزا ادیب‘ حمید اختر اور باقی سب صاحبان انہیں کسی نہ کسی اشاعتی حوالے سے ملے۔ ملنے والے کی عزت اور وضعداری سے گھائل ہوئے۔ ملک مقبول احمد ان کی محبت اور بے لوث خلوص کے قائل ہوئے...... ملک مقبول کی تحسین کہیں ان کے اندر سے پھوٹی ہے۔''

ایک اور کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' ہے جس میں کتابوں کے ایک ممتاز ناشر کا واسطہ قسم قسم کے ادیبوں سے پڑتا ہے اور یہ خلوص کی شمعیں جلاتے ہیں تو بعض ادبائے کرام اغراض اور مقاصد میں بھی لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تبصرہ نگاروں...... آصف بھلی‘ ڈاکٹر اختر شمار‘ اعتبار ساجد‘ پروفیسر جمیل آذر‘ شفیع ہمدم‘ ڈاکٹر صابر آفاقی‘ عبدالقیوم نے اس کتاب کو گہری نظر سے پڑھا اور پر لطف نکتہ آرائی کی۔ مثلاً پروفیسر غلام نبی اعوان نے مصنف اور ناشر کے تعلق کو ''ساس اور بہو'' کے حوالے سے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد تشنہ کو ان خطوط میں دو باتیں بڑے تواتر سے پڑھنے کو ملیں:

''اول...... مسودے کی کتابی شکل میں آنے کی جلدی

دوم...... دبی زبان سے معاوضے کی ادائیگی کا تقاضا۔''

لیکن دوسری طرف یہ اعتراف بھی کیا:

''اہل قلم کے خطوط' ادب میں یقیناً پہلی کوشش ہے جس میں ادیبوں نے مختلف انداز' ندرتِ پیرائے اور عمدہ اسلوب میں اظہار خیال کیا ہے۔''

انوار قمر صاحب نے اپنی رائے باندازِ دگر دی ہے:

''یہ بات بڑی عجیب ہے کہ ادیب اور مصنف ملک صاحب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیوں کہ انہوں نے مصنفوں کی عزت اور وقار کا خیال رکھا ہے...... ویسے لاہور میں کئی ایسے ناشر بھی گزرے (اور ان حروف کے لکھنے والے کے ذاتی تجربہ کے مطابق آج بھی موجود ہیں) جن کے مسلک میں مصنف کو معاوضہ دینا حرام ہے۔''

متذکرہ بالا چند اقتباسات کے بعد اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے اور اس کتاب کے درمیان حائل نہ رہوں اور آپ ان کی کتابوں ''شناسائی''، ''گلشن ادب''، ''گمشدہ افسانے''، ''ارمغانِ غزل''، ''نیا علم شفا بخشی''، ''آپس کی باتیں'' اور ''بر سبیل گفتگو'' کے تبصروں کے ایک دو اقتباسات پر قناعت نہ کریں بلکہ ملک صاحب کی تصنیف و تالیف کے عالم کو دیکھیں کہ وہ اشاعتی کاروبار سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کتنی مصروف زندگی گزار رہے ہیں اور علم و ادب کے پیاسوں کی خدمت کتنے استقلال' خلوص اور محبت سے کر رہے ہیں۔

بلاشبہ ملک مقبول احمد لاہور کے ناشرین میں مقام امتیاز رکھتے ہیں اور اب ادیبوں کی قلمی برادری میں شامل ہوئے ہیں تو ان کی انفرادیت تسلیم کی جا رہی ہے۔ دُعا ہے کہ ان کا گلشن کتب مہکتا رہے۔

انور سدید

۱۷۲- ستلج بلاک' اقبال ٹاؤن

لاہور (۵۴۵۷۵)
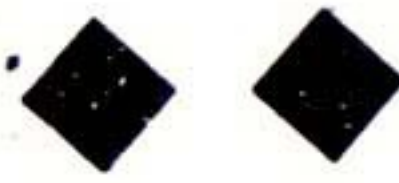
فون: ۰۳۳۴-۹۷۱۹۲۷۸

سفر جاری ہے

◆◆

فہرست

.......o.......

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

DR. A. Q. KHAN
N I & BAR, HI

"Mountain View"
207, Hillside Road,
E-7, Islamabad
Pakistan
Date: 24.1.2011

''سفر جاری ہے''

جناب ملک مقبول احمد صاحب کی نہایت دلچسپ کتاب بلکہ سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' جب کھولی بند کرنا مشکل ہو گیا۔ آپ نے دوستوں، عزیزوں کے بارہ میں نہایت دیانت داری سے سیدھے سادھے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے بہت سے حضرات سے میری بھی شناسائی رہی ہے اور اس کتاب میں ملک صاحب کی گہری نظر اور مردم شناسی کی درخشاں مثال ہے۔ حالی نے شاید ملک صاحب کے لیے یہ پیارا شعر کہا تھا۔

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

آپ کی زندگی کا سفر مسلسل محنت اور جدوجہد کی درخشاں کہانی ہے آپ نے ایک طویل دلچسپ سفر کو قلم بند کر کے ایک دریا کو تاریخ کے ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔
آپ کا پبلشنگ ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' ایک اہم قومی ادارہ بن گیا ہے جس کی زندہ مثال اس ادارہ کی ڈیڑھ ہزار سے زیادہ شائع کردہ مطبوعات ہیں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب نے اپنا فن علم اور تجربہ اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شمع کو ہمیشہ ہمیشہ روشن رکھے اور پاکستانی عوام کے لیے مشعل راہ بنائے رکھے۔ (آمین)

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

بانو قدسیہ
داستان سرائے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

''سفر جاری ہے''

ملک مقبول احمد صاحب کی خودنوشت پڑھنے کو ملی۔ اس کتاب کے شروع میں اُنہوں نے ''روسو'' کی تحریر سے جو اقتباس درج کیا ہے۔ یہ کتاب اس پر پوری اُترتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ جب بزرگی عمر کو پہنچتے ہیں۔ تو وہ اپنی کامیابیوں سے اتنے معزز ہو جاتے ہیں کہ پھر اپنی ذات کے بارے میں سچ بولنا اور لکھنا اُن کے لیے بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔ مقبول صاحب نے اپنی ذات کے بارے میں سچ تو ضرور بولا ہے لیکن بڑی سادگی کے ساتھ۔ اُنہوں نے ذاتی سچ کو افسانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔

میری ساری زندگی اپنے ذاتی اور ادبی دوستوں کے ساتھ اس بحث میں گزری کہ وہ اپنے بارے میں سچ ضرور بولیں لیکن دوسرے کے پوتڑے سرِ راہ دھونے سے اجتناب برتا کریں۔ مقبول صاحب کو جن لوگوں کے نامناسب رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اس کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن اُن لوگوں کے نام ظاہر نہ کر کے اعلیٰ درجے کی شرافت کا ثبوت مہیا کیا ہے اس شرافت کا تعلق ان کی اپنی ذات سے بھی ہے اور ان کی وراثت سے بھی۔ زندگی میں ہمیں ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوتا ہے۔ جو کچھ خوبیوں کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ مقبول صاحب نے بھی ایسے چند لوگوں سے ہمیں روشناس کروایا ہے۔ ان کا نام بھی بتایا ہے۔ اور ان کی زندگی کی پہچان بھی کروائی ہے اور وہ لوگ جس جگہ یا مقام پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کو ظاہر کرنا بھی مناسب سمجھا گیا۔

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد
گوشۂ محققین، ننکانہ صاحب:

خوشبو کی طرح پذیرائی

مشہور اہل قلم، صحافی، افسانہ نگار، افسانہ منزل کے باسی جناب منشا یاد کی ضخیم کتاب میرے محترم ملک مقبول احمد صاحب نے مجھے صرف میری نگاہِ پسندیدگی پر پیش کی۔ تو میں سوچتا رہ گیا کہ وسیع القلب، وسیع الظرف، صاحبِ ذوق، مربّی اور علم پرور لوگ اگر ہوتے ہیں تو انہیں ملک مقبول احمد جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔ میری ''منشایئے'' کی پسندیدگی کی وجہ جناب منشا یاد کا وہ مضمون تھا جس کا عنوان ہے خوشبو کی طرح ''پذیرائی'' یہ مضمون منشایئے کے صفحات 158 تا 168 پر موجود ہے اور یہ مضمون جناب ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کے جائزے و مشاہدات پر ایک نادر تحریر ہے۔

''سفر جاری ہے'' دراصل ملک مقبول احمد صاحب کی شگفتہ بیانی اور شستہ تحریر میں ان کی زندگی کے احوال کا قلمی بیان ہے۔ جس پر بیسیوں پچاسوں تبصرے اور ایک مبسوط کتاب بھی لکھی جا چکی ہے۔ ملک صاحب خود بھی کمال کے آدمی ہیں مگر ملک صاحب کی کتاب نے بھی کمال کر دیا ہے۔ جو بھی اسے پڑھتا ہے اس کی توصیف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ کتاب میں دلکشی ہو یا نہ ہو ملک صاحب کا طرزِ گفتگو حسنِ اخلاق، آؤ بھگت کا انداز، دل میں گھر کر لینے والے الفاظ (Remarks)، میٹھی آواز، مسکراتا چہرہ تو یاد کرتے

بھی دلکش لگتا ہے۔ جو عملاً ملک صاحب کے ان خصائص سے لطف اندوز ہوگا وہ آپ کی محبتوں کا بھلا کیوں نہ شکار ہوگا؟ ملک صاحب ایک عام ملک صاحب سے ایک خاص ملک صاحب کیسے بنے؟ ایک کم تعلیم یافتہ نو وارد اور بیکار شخص سے ایک دل موہنے والی شخصیت کے مالک اور کار آمد صحافی، مدیر، قلم کار، پبلشر اور خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں صاحبِ حیثیت علم پرور کیسے بنے؟ اس سب کا ارتقائی استقصاء کیا گیا ہے۔ ''سفر جاری ہے'' میں اور اس ''سفر جاری ہے'' پر جائزہ سطور قلمبند کی ہیں۔ معروف قلمکار اور افسانہ نگار منشاء یاد نے اپنی کتاب ''منشائیے'' میں مضمون ''خوشبو کی طرح پذیرائی'' میں۔

منشا یاد صاحب نے 14 تبصرہ نگاروں کے صرف نام اور اٹھارہ تبصرہ نگاروں کی تحریروں سے اقتباس یا چند لفظی مغز اپنے تبصرے میں شامل کر کے گویا یہ اعلان کر دیا ہے۔

اک زمانہ ہے ان کا رطب اللسان
پڑھ لے جائزہ اور پھر اس کو تُو مان

منشا یاد صاحب کو ''سفر جاری ہے'' کے بعض جملوں کی سچائیوں نے چونکا دیا اور بے اختیار ان قلبی احساسات کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گئے مثلاً ملک صاحب کا اپنے ننھیال جا کر اپنی منگیتر سے ملاقاتوں کا احوال اور پھر محترمہ کا ملک صاحب کے دل کی پنہائیوں میں مستقل آبادی کا ذکر، پھر سکولوں میں سامان کی سپلائی کے ٹھیکوں کے بل پاس کروانے کے سلسلے میں اپنے ''ذرائع'' استعمال کرنے کا اقرار وغیرہ وغیرہ۔

منشا یاد صاحب نے اپنی ادیبانہ زبان میں ملک مقبول احمد صاحب کی ''سفر جاری ہے'' سے کئی کار آمد اور دلچسپ باتوں کے مشاہدے کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً:

''ادیبوں کے خطوط، تبصرے، تصویریں، مصنفین کے حالاتِ زندگی اور تصویریں، کتابوں پر تبصرے، حج بیت اللہ کا سفر نامہ، انٹرویوز، حکومتی اہلکاروں کی

چٹھیاں، بعض کتابوں کے بارے میں معلومات، جیسے آزادئ ہند اور تمدن عرب
کی اشاعت اور اسلامی کتابوں اور تاریخی ناولوں کے قصے، بعض مصنفین سے
ملاقاتوں کا احوال اور ان کے رویوں کے بارے میں انکشافات:
ملک صاحب نے ان حضرات (تبصرہ نگار) کی کہیں بھی بے جا اور غیر واجب
توصیف نہیں کی ہر ایک کے بارے میں بہت جچے تلے انداز میں اپنی رائے دی
جو جیسا ہے اسے ویسا ہی پیش کیا ہے......"

آخر میں منشا یاد صاحب ملک مقبول احمد صاحب کی خود نوشت "سفر جاری ہے"
کی اہمیت، وقعت اور مقبولیت کے اسباب گنواتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ایک تو یہ کہ
ملک مقبول احمد صاحب کے حالات زندگی بہت دلچسپ تھے اور ہر کامیاب اور سیلف میڈ
(Self Made) شخص کی طرح ان کے پاس بھی بتانے اور دوسروں سے شیئر
(Share) کرنے کو بہت کچھ تھا۔ دوسرے اس میں پہلی بار ایک پبلشر نے مصنفین سے
متعلق معاملات و مسائل اور اپنے تجربات بیان کیے ہیں جو مصنفین اور ناشران کے لئے
مشعل راہ بن سکتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ایسی کتاب ("سفر جاری ہے" کی طرح کی)
صرف وہی پبلشر لکھ سکتا ہے جو محض تاجر نہ ہو بلکہ کتاب سے سچی محبت کرتا ہو اور اس کی قدر و
قیمت کو پہچانتا ہو جس کی شائع کی ہوئی کتابیں معیاری ہوں اشاعتی ادارہ باوقار اور قابل
اعتماد ہو اور جس نے مصنفین سے معاملات اور معاہدے خوش اسلوبی سے نبھائے ہوں۔"
"سفر جاری ہے" ایک شیخ کے قلم سے اس کے بارے میں احوال واقعی کی محض
تدوین نہیں ہے بلکہ ایک معاشرے کا "ویروا" ہے۔ ایک شخص کے احساسات کا آئینہ ہے۔
اس کے مشاہدات کا کتابچہ ہے، اس کے ملفوظات کا خریطہ ہے، اس کے خلوص و محبت کا
خاکہ ہے اس کی قدم بقدم ترقی اور کوئی کوئی قدم تنزلی کی ڈائری ہے۔ اس کے دوستوں کا

اچھا بُرا ساتھ ہے۔ دوستوں کے بارے میں اس کی کرسٹل کلیئر (Crystal Clear) رائے ہے۔ اس کے مہربانوں کی مہربانیوں کا احاطہ ہے اس کے عزیز واقارب کے رقیبانہ اور عصرانہ سلوک وحسن سلوک کا توقیعہ ہے اس کی زندگی کے نشیب وفراز (Ups & Downs) ہیں۔ اس کے تلخ وشیریں تجربات ہیں۔ غرض ''سفر جاری ہے'' پر ابھی ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ منشا یاد صاحب بھی یقیناً لکھ سکتے تھے۔ پھر انہیں اپنی ہر کتاب میں ''سفر جاری ہے'' کا جائزہ کے آخر پر ''جاری ہے'' لکھنا پڑتا۔ یا پھر محترمی پروفیسر جمیل آذر صاحب کی طرح ''راہ نوردِ شوق'' بننا پڑتا خیر! یاد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، محبوب لکھا ہے، مرغوب لکھا ہے اور اگر انہوں نے اس کو نقطہ اختتام پر لا کے چھوڑا ہے تو کوئی ان سے پوچھے کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ شعر کی زبان میں مَیں یہی کہوں گا:

لکھے جو میں نے شوق سے مقبول کے احوال
جاری سفر کو دیکھ کے میں ہو گیا بے حال
کیا خوب لطف دے رہی تھی ان کی یہ کتاب
ہے نام جس کا ''جاری سفر'' بہت لا جواب
ہمت، اُمید اور خوشی جس کا ہو مقصود!
ہر ماہ اکیڈمی پہ ہو حاضر و موجود!
وہاں ملک مقبول سے پھر کر لے قیل و قال
''سفر جاری'' کا لطف وہ پائے گا بہرحال!
ایک عالمِ حبیاں وہ دیکھے گا اس جگہ!
اور مجلسِ مقبول کو پائے تماشا گاہ!

یہی میرا ہے شوق جاؤں جب بھی میں لاہور
حضرت ملک مقبول کی مجلس میں بیٹھوں اور
زاہدؔ ایسوں کے دم سے ہے قائم زمانہ آج
اخلاق اور مروت کی قائم جو رکھیں لاج!

☆☆☆

پذیرائی کے بعد شناسائی

ملک مقبول احمد کی خود نوشت سوانعمری ''سفر جاری ہے'' اردو ادب کے پہلے پبلشر کی آپ بیتی ہے۔اس سے قبل کسی پبلشر کا خیال اپنی آپ بیتی لکھنے کا نہیں آیا۔ملک صاحب کو اپنی زندگی کی کہانی لکھنے کی ترغیب ان کے پوتے پوتیوں اور دوستوں نے دی تھی۔ان کی سرگزشت جب قرطاس پر نمودار ہوئی تو اسے اس کی اتنی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوئی کہ ملک اور ملک سے باہر کے ادباء اور دانشوروں نے اس پر اتنی تیزی سے مضامین تحریر کیے کہ ایک کتاب ''پذیرائی'' کے عنوان سے نمودار ہوئی جس میں ''سفر جاری ہے'' پر مختلف معروف ادباء کے مضامین شامل ہیں۔مضامین تحریر کرنے کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اس کے بعد دوسری کتاب ''شناسائی'' کے عنوان سے عالم وجود میں آئی اس کتاب میں بھی ملک اور بیرون ملک کے ادبا شعراء کے مضامین شامل ہیں۔

پروفیسر جمیل آذر نے اس آپ بیتی پر اپنے بچپن کا دور، دوست اور اپنے گاؤں کی گلیاں کوچوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھا تو ان کے قلم نے ''راہ نوردِ شوق'' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کر ڈالی۔بین الاقوامی شہرت کے حامل سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان ''سفر جاری ہے'' پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''آپ کی زندگی کا سفر مسلسل محنت اور جدوجہد کی درخشاں کہانی

ہے آپ نے ایک طویل دلچسپ سفر کو بند کر کے ایک دریا کو تاریخ
کے ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔''

ناول راجہ گدھ کی خالق بانو قدسیہ جوصف اوّل کی افسانہ نگار بھی ہیں اور بہت سے ناولوں کی مصنفہ بھی ہیں ان کی شہرت کا پرند اردو ادب کے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے ملک صاحب کی آپ بیتی کے بارے میں ایک جگہ تحریر کرتی ہیں۔

''ہمارے معاشرے میں لوگ جب بزرگی کی عمر کو پہنچتے ہیں تو وہ
اپنی کامیابیوں سے اتنے معزز ہو جاتے ہیں کہ پھر اپنی ذات کے
بارے میں سچ بولنا اور لکھنا ان کے لیے بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔
مقبول صاحب نے اپنی ذات کے بارے میں سچ تو ضرور بولا ہے
لیکن بڑی سادگی کے ساتھ۔ انہوں نے ذاتی سچ کو افسانہ بنانے کی
کوشش نہیں کی۔''

معروف کالم نگار کئی اخبارات اور رسائل کی ادارت کا فریضہ انجام دینے والے اور اردو کے دو شعری مجموعوں کے خالق جباز مرزا نے ''سفر جاری ہے'' پر اپنے تاثرات کتنے دلکش انداز میں پیش کیے ہیں۔ آپ کی سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' میرے لیے فردوس نظر بنی جس مہارت سے زندگی کے مشاہدات و تجربات کو آپ نے قرطاس پر اُتارا ہے لائق تحسین ہے میرے لیے یہ بات بھی کسی کرامت سے کم نہیں کہ ساغر صدیقی کی پوری زندگی کو آپ نے پندرہ سطروں میں بیان کر دیا ہے۔''

خبر قبیلہ، انوار جمیل، شہید پاکستان، معاشی بدحالی اور زکوٰۃ اور بہت سی کتابوں کے مصنف علامہ عبدالستار عاصم ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ وطن عزیز کے

علاوہ دنیا کے کئی ادیبوں، شاعروں نے اس پر تبصرے کیے اور ''سفر جاری ہے'' کے بطن سے تین کتابوں نے جنم لیا اور راہ نورد شوق پذیرائی اور شناسائی منظر عام پر آئیں۔''

اردو کے ممتاز صحافی اور ممتاز شاعر انوار فیروز نے ''سفر جاری ہے'' پر الفاظ کا جادوگر کے عنوان سے جو مضمون تحریر کیا ہے وہ قابل ستائش بھی ہے اور قابل مطالعہ بھی۔ اس مضمون کی چند سطور:

> ''مجھے کتاب پڑھ کر کہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ ایک کم پڑھے لکھے شخص نے لکھی ہے بلکہ یہ محسوس ہوا کہ یہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مستند ادیب نے لکھی ہے انہوں نے جگہ جگہ اشعار استعمال کیے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ اعلیٰ شعری ذوق کے حامل ہیں اور موقع محل کے حساب سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔''

صائمہ نورین بخاری کا تعلق معروف علمی ادبی سادات گھرانے سے ہے ان کے بزرگوں میں خواجہ حسن نظامی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں صائمہ نورین بخاری کی افسانوں کا ایک مجموعہ ''منظر، خواب، دریچے'' اور ایک شعری مجموعہ ''سفر آغاز کرتے ہیں'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو کر اہل ذوق سے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے۔

> ''اور ناشرین ملک مقبول احمد جیسے با اخلاق، صاف گو، ہمدرد اور با اصول ہوں تو پارس خود راستہ ہو جاتے ہیں۔ منزلیں آسان لگنے لگتی ہیں۔ راہ گزر پتھر کی ہو اور ہم سفر شیشے کا ہو بھی ہر قدم پُرعزم ایک نیا منظر امید سجا دیتی ہے۔''

کئی زبانیں جاننے والی عنبریں تبسم شاکر جنہوں نے پروفیسر جمیل آذر کی

انشائیہ نگاری پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور ان کی سرپرستی میں انشائیہ تحریر کر رہی ہیں وہ ''سفر جاری ہے'' کو ایک مبصر کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

''ملک مقبول احمد صاحب کی سرگزشت سیدھی سادھی، سلیس مگر شگفتہ زبان میں سامنے آئی ہے رسمی اور روایتی تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود ان کی تحریر، زبان و بیان کی اغلاط سے پاک ہے بلکہ بعض محاورے اور ضرب المثال جو معروف اہل قلم بھی غلط استعمال کرتے ہیں مقبول صاحب نے صحیح برتے ہیں۔''

ملک کے معروف دانشور اور ادیب گوہر ملسیانی جن کا مزاج دینی ہے ان کی نعتوں کے تین مجموعے اہل ذوق کی دست و دامن کی زینت بن کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں انہوں نے بچوں کے لیے نو کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ وہ نوائے وقت میں سماجی اور تہذیبی مسائل پر کالم بھی لکھتے ہیں انہوں نے ''سفر جاری ہے'' محبت و محنت کی زنبیل کے عنوان سے ملک صاحب کی آپ بیتی پر مضمون تحریر کیا ہے جس کی چند سطور ملاحظہ کیجیے۔

''خوش قسمت ہیں ملک مقبول احمد جن کی ذرّیت نے علم کی کمی کے دریا کو پاٹ کر اپنے محترم و مکرم والد کی آرزوؤں کے چراغ جلا کر روشنی پھیلائی، اپنی وسعت علمی اور معراج آگہی سے ایک سدا بہار گلشن مہکا دیا ہے۔''

اردو کی واحد صاحب کتاب انشائیہ نگار جنہوں نے انشائیوں کے دو مجموعے اردو ادب کے دامن میں ڈال کر انشائیے کو اور بھی معتبر کر دیا ہے۔ ان کے انشائیے ملک کے صف اول کے رسائل اوراق، تخلیق اور ادبیات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ افسوس آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر اپنی تخلیقات کی وجہ سے ہمیشہ

ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی ۔"سفر جاری ہے" پر ان کے انشائی اسلوب کے تبصرے کی چند سطور ملاحظہ کیجیے۔

"اسلوب بیان کی سادگی اور پرکاری میں ایک ادبی حسن ،لطیف چاشنی ہے۔تصنع وتکلف سے مبّرا صداقت اور سچائی سے واقعات کے بیان نے قاری کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ان خصوصیات کی بنا پر اردو کی نمایاں آپ بیتیوں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔"

معروف افسانہ نگار اور ناول نگار جن کے ناول "اندر جال" نے بہت مقبولیت حاصل کی ۔دردانہ نوشین خان شاعرہ ،کالم نویس اور تبصرہ نگار بھی ہیں ان کے افسانوی مجموعہ "ریت میں ناؤ" اہل ذوق سے پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔"سفر جاری ہے" کے بارے میں انکے مضمون کی ان سطور پر غور کیجیے۔

"دعا پر یقین ،اسلامی کتب کی اشاعت پر اظہار مسرت ، نیک نیتی پختہ ارادہ ،حج اور عمرہ کی بار بار سعادت ایسے رنگ ہیں جن کی آمیزش سے باوقار ، پرعزم ، سچے مسلمان کا پیکر تکمیل پاتا ہے ۔کیا خوب لکھتے ہیں۔میں نے کسی کام کو اپنی دسترس سے کہیں دور نہیں دیکھا۔"

ایم آر شاہد اپنے ایک خط میں ملک مقبول احمد صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

"ہماری علمی ادبی اور اشاعتی دنیا میں بہت کم کم ہوا ہے کہ ایک آدمی بیک وقت ایک اچھا پبلشر بھی ہو اور ادیب بھی۔آپ کی محترم

شخصیت میں تمام خوبیاں یکساں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ
تعالیٰ کی آپ پر خاص عنایت اور پیارے حبیبؐ کا صدقہ ہے یہ
عزت واحترام ومقام آج کی دنیا میں بہت کم لوگوں کے حصے میں
آتا ہے۔''

ماہر تعلیم اور تین زبانوں، اردو، فارسی اور گوجری میں مہارت رکھنے والے ڈاکٹر صابر آفاقی جو معروف شاعر بھی ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' پر تبصرہ تحریر کیا ہے جس کی چند سطور پیش خدمت ہیں۔

''ملک صاحب ،نہایت خوش اخلاق ،خدا پرست اور بزرگوں کی
پرانی روایات کے حامل ہیں۔ ان میں عام ادیبوں یا ناشروں جیسا
غرور نام کو نہیں وہ جب دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں تو مخاطب
کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔''

شہزاد منیر احمد نے ملک مقبول احمد کی آپ بیتی پر جو تبصرہ کیا ہے اس کی چند سطور حاضر خدمت ہیں۔

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد صاحب کی خودنوشت اور غیر
معمولی ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک صاحب کی پہلی
کاوش ہونے کے باوجود ایک معیاری کتاب ہے۔ یہ ان کی زندگی
کی کہانی ہے جس میں رشتوں کی چاشنی بھی ہے اور رشتوں ہی
میں ملنے والی حوصلہ شکنی بھی ہے جسے پڑھ کر قاری ان کی ہمت اور
کامیابی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

رئیس احمد رئیس بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انہوں نے غزل کو نیا لہجہ اور نیا

اسلوب عطا کیا ہے اور جدید غزل میں اپنا منفرد اسلوب بنایا۔ ''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ علمی وادبی ذوق کا حامل ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''ان کی نثر میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، شگفتگی بھی ہے اور روانی بھی فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی...... سحر بھی ہے اور تاثیر بھی اپنی منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے فن میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے وہ کردار نگاری اور اپنے مافی الضمیر کے فن میں بھی بے مثل اور یکتا ہیں۔''

معصوم شرقی ایک معروف شاعر ہیں ان کے دو شعری مجموعے کاغذی لباس میں ملبوس ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ''تراشیدہ'' ان کی تنقیدی تخلیقی مضامین کی کتاب ہے۔ ''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ بھارت کے معروف جریدہ ''انشا'' کی زینت بن چکا ہے۔ تبصرہ کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے۔

''انکے قلم اور انداز بیان کا اعجاز ہے کہ انہوں نے شخصیت کا کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہیں رکھا اور زیب داستان سے دامن بچاتے ہوئے اپنی کتاب زیست کو انکسار اور صداقت سے پیش کر دیا ہے۔ سادگی و پرکاری اور لطافت زبان اس خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔''

رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''آپکی سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' بے حد دلچسپ ہے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ کر دم لیا۔ آپ نے اپنی دنیا آپ پیدا کی ہے اور دیگر لوگوں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا پیغام

دیا ہے۔"

معروف مزاح نگار، انشائیہ نگار اور تبصرہ نگار عبدالقیوم اپنے خط میں ملک صاحب کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

"10 مئی کو صبح سے آپ کی آپ بیتی کا مطالعہ شروع کیا تو مسلسل پڑھ کر شام 5 بجے پوری کتاب پڑھ ڈالی حالانکہ میں اکثر کتاب وقفے وقفے سے پڑھتا ہوں، بہت کم کتابیں مجھے مسلسل پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں آپ نے جس سادگی، خلوص اور سچائی سے مختصراً حیات مستعار کے شب و روز کو الفاظ میں ڈھالا ہے وہ قابل ستائش ہے۔"

ملک صاحب نے "سفر جاری ہے" میں اپنے غریب رشتہ داروں کو نہ تو بھلایا ہے اور نہ ہی ان سے پہلوتہی کی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ معاشرے میں جب کہ اہم مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو غریب رشتہ داروں کو اپنی قلمرو سے باہر نکال دیتے ہیں اگر خونی رشتوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جائے تو ان پر ملمع چڑھا کر پیش کرتے ہیں مگر ملک صاحب نے اپنے خاندانی کی ویسی ہی تصاویر پینٹ کی ہیں جیسی کہ ہیں انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو خفیہ رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی اور نہ ہی اپنی پسند کی عینک لگا کر انہیں دیکھا ہے اور دکھایا ہے اس لیے "سفر جاری ہے" اُردو کی بہترین سوانح عمریوں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

☆☆☆

غلام نبی اعوان

کھلی کتاب سا آدمی

ڈاکٹر انور سدید' ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر وحید قریشی' حمید اختر' اے حمید' علی سفیان آفاقی' اظہر جاوید' جمیل آذر' خواجہ محمد زکریا' امجد اسلام امجد اور محمد منشا یاد' یہ اک ستاروں بھری کہکشاں ہے۔ اِن ستاروں میں سے کئی دوسرے سے فکری و نظریاتی اعتبار سے بعد المشرقین کے فاصلے پر ہیں۔ لیکن کسی زبردست مقناطیسی قوت نے اُنہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا ہے۔ یہ وہ باراتی ہیں جو باہمی اختلاف بھلا کر اک متفقہ علیہ ادبی دولہا کی بارات میں آئے ہوئے ہیں اور بڑھ چڑھ کر سہرے پڑھ رہے ہیں۔ یہ کتنا مشکل کام تھا جو ملک مقبول احمد صاحب نے آسانی سے کر ڈالا' اور ادباء ہیں کہ جوق در جوق کھچے چلے آ رہے ہیں۔

تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

''سفر جاری ہے'' پر اک طائرانہ سی نظر ڈالنے پر میں سوچ میں پڑ گیا کہ انسان اور انسانیت آج اِس گئے گذرے قحط الرجال میں بھی عظیم تر قوتیں ہیں۔ انسانیت کے سب سے بڑے علمبردارؐ نے جب اہل مکہ سے کہا کہ اگر میں تمہیں کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے دشمن کا اک لشکر جرار تمہاری طرف بڑھ رہا ہے تو کیا تم مان جاؤ گے۔ قبائلی عصبیت اور باہمی منافرتوں کا بعد المشرقین حاضرین کے درمیان موجود تھا مگر سب نے یک زبان ہو کر سہرا

پڑھا کہ ہم تمہاری بات کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ تم صادق ہو اور امین ہو۔ اُس رحمتہ العالمینؐ نے درجہ کمال تک پہنچنے کیلئے کس قدر ریاضت و محنت کی ہو گی اُس کا تصور بھی محال ہے۔ لیکن اُس سوہنے نبیؐ کے نقش کف پا آج بھی انسان کیلئے ناموری اور نیک نامی کمانے کے راستوں کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک مقبول احمد کی آج کی نیک نامی اُسی نقش پا کو اپنا راہنما تسلیم کرنے کا چھوٹا سا صلہ ہے۔ آج اتنے صاحب علم و فضل ادیب اور دانشور بلا خوفِ تردید اگر ملک صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں تو یہ ملک صاحب کی اک لمبی سیرت و کردار کی تپسیا کا نتیجہ ہے۔

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

ممکن ہے یہ میری کم علمی ہو۔ لیکن اُردو ادب کی تاریخ میں پہلی دفعہ میں نے اک ایسے مصنف کو پڑھا ہے جس کو بے شمار دانشوروں نے بیک زبان ہو کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ملک صاحب کو یہ رتبہ بلند اور وقار و عظمت کا یہ مقام اُن کے اپنے کردار کی بدولت حاصل ہوا ہے۔

''سفر جاری ہے'' اک سادہ مرادے اعوان کی سوانح عمری ہے۔ صدق و صفا میں نتھرے ہوئے اِس شخص نے پوری کتاب میں کہیں بھی صوت و آہنگ اور علم و ادب کے طوطا مینا بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک ایک لفظ میں عجز و انکساری اور نفیِ ذات کا رنگ جھلکتا ہے۔ اپنی علمی و ادبی اہلیت کے بارے میں ملک صاحب کو کوئی خوش فہمی نہیں۔ اگر اپنی ادبی شدھ بدھ کے بارے میں کوئی بات کہنی پڑ جائے تو وہ اپنی اِس حیثیت کو اپنے صاحب علم دوستوں کی محبت کا ثمر قرار دیتے ہیں۔ ''کتاب اور اُس کا تعارف'' میں ملک مقبول احمد کے درجِ ذیل الفاظ اُن کی خاندانیت اور عجز و نیاز کا خوبصورت نقشہ کھینچتے ہیں:

''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم' کوئی جھجک اور رکاوٹ نہیں

ہے کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹوں، ڈگریوں اور دستاویزی حوالوں سے انتہائی کم علم ہوں۔ لیکن پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبودار ہو جانے والی مٹی کی طرح میں بھی ادباء، شعراء، مصنفین، مترجمین، معلمین، محققین اور عالی ظرف انسانوں اور کتابوں کے داخلی جمال سے فیض یاب ہوا اور میں خود بھی ایک کتاب بن کر رہ گیا۔"

کوئی انکساری سی انکساری ہے اور یہی عاجزی "سفر جاری ہے" میں قدم قدم اور ورق ورق پھولی سرسوں کی طرح تا حد تخیل پھیلی ہوئی ملے گی۔ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ملک صاحب کا قلم اور بھی زیادہ "نیواں" ہو کر چلنے لگتا ہے اور حرف حرف اِن کامیابیوں کو ملک صاحب اپنے والدین اور بالخصوص "بے جی" کی دُعاؤں کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ عمر کے اِس حصے میں جہاں اُن کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں جوانی کی جانب بڑھ رہے ہیں جب ملک صاحب اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا قلم اشک بار ہو جاتا ہے۔ یہ میرے اللہ کی عطا کردہ توفیق ہے جو احترام والدین کیلئے مولا پاک اپنے مقرب بندوں کو ودیعت کر دیتا ہے۔ ماں باپ کیلئے یہی سوز و گداز خدا کے نیک بندوں کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے والدین تو ایک طرف ملک صاحب تو اُس چھوٹے بھائی کے غم کو نہیں بھولے جو کہیں بچپن میں داغِ مفارقت دے گیا تھا اور یقیناً اِس سانحے کو ساٹھ ستر سال گذر چکے ہیں۔

اصنافِ ادب میں ہر صنف کے کچھ بنیادی پیمانے ہیں جن میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ترمیم و اضافے تو ہوتے رہتے ہیں لیکن بنیادی ڈھانچہ وہی رہتا ہے جو تمام اہل علم و ادب کیلئے مسلمہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی بھی اک ایسی ہی صنف ہے جس میں سوانح نگار کچھ مبادیات کو ذہن میں رکھ کر قلم اُٹھاتا ہے۔ میری ناقص رائے میں سوانح نگاری اک

مشکل صنف ادب ہے کیونکہ اِس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں، جہاں سے لکھاری کو اپنا دامن بچا کر نکلنا پڑتا ہے۔ اک ذراسی لغزش سے آپ بیتی کا سارا ڈھانچہ زمین پر آ رہتا ہے۔ لہٰذا اک باخبر لکھاری اپنی سوانح ضبط تحریر میں لانے سے مہینوں پہلے تحریر کی نشست و برخاست پر غور کرتا ہے اور پھر پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے ہوئے کام کا آغاز کرتا ہے۔ اُسے زبان کے درو بست کا خیال رکھنا ہے۔ دلچسپی کا پہلو بھی مدنظر رکھنا ہے۔ پھر واقعات و حالات کی ترتیب کو بھی تزئین دینا ہوتی ہے۔ اہم اور غیر اہم واقعات کی قطع و برید اور اُن کی ''کیٹیگرائزیشن'' کو بھی تنقیدی نظر سے دیکھنا ہوتا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی آمیزش یا مبالغے کی حدود پر بھی توجہ دینا پڑتی ہے اور رنگ آمیزی کیلئے کسی سلیقے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ شاعری یا افسانہ تخیل کی بلندی و پستی اور تصوراتی نشیب و فراز کی بھول بھلیوں سے ہو کر گذرتے ہیں لہٰذا اُن کا کینوس اور پھیلاؤ بے کراں ہو سکتا ہے۔ جب کہ سوانح نگاری کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانح عمری کی جانچ پرکھ کے ترازو بڑے کڑے اور کھرے ہیں۔ نتیجتاً بہت کم آپ بیتیاں ادب میں راہ پاتی ہیں اور اپنا مقام بناتی ہیں۔ لیکن یہ مندرجہ بالا خیال یا رائے اُن ادیبوں کی تحریروں سے متعلق ہے جو اپنے رُتبے سے باخبر ہوتے ہیں اور ہر لفظ تول تول کر کاغذ پر اُتارتے ہیں...... ملک مقبول نے سوانح عمری کے تمام مجوّزہ اور مروّجہ قواعد کو بیک نظر ایک طرف رکھ دیا ہے اور اپنے داخلی صدق و صفا کے بل بوتے پر جو کچھ کہنا چاہا، انتخابِ لفظی میں پڑے بغیر سیدھے سبھاؤ بیان کر دیا۔ سچائی اور دیانت سے جو کچھ خود پر بیتی اُسے سادہ لفظوں میں کاغذ پر اُتار دیا۔ ملک صاحب کی یہی خوبی پڑھنے والے کے دِل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے۔ دیہاتی زندگی میں روزمرہ کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کے جو جو مناظر اُنہوں نے سپردِ قلم کئے ہیں، یقین کریں مجھے اپنے بچپن اور اپنا گاؤں اتنا یاد آیا کہ میرے آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے اور پھر مجھے ایک بھولا بسرا شعر یاد آ گیا۔

میں وحشی بھلا مجھ کو میرے صحرا میں پہنچا دو
کہ میں پابند آدابِ گلستاں ہو نہیں سکتا

دیہاتوں میں اک زندگی چوپال کی بھی ہوتی ہے۔ یہ زندگی شام ڈھلے جاگتی ہے اور رات کے پہلے پہر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چوپال گاؤں کے چوہدری کا وہ کھلا ڈیرہ ہوتا ہے جہاں شام سے ہاتھوں میں حقے تھامے دہقان آنا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر دن بھر کے واقعات پر تبصرے اور سارے دن کی آپ بیتیوں کے بیان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔
ملک مقبول احمد کی زیرِ تبصرہ کتاب اُسی چوپال میں سُنائی جانے والی اک کہانی ہے جسے سوانح عمری کی شکل دی گئی ہے۔ دیہاتی پس منظر رکھنے والے لوگ اِس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ دن بھر علمی مشقت کرنے والا دیہاتی مقبول کندھے پر یادداشتوں کی کدال رکھے مشاہدات کا حقہ گڑگڑاتے ہوئے چوپال میں داخل ہوتا ہے۔ پہلے سے بیٹھے لوگ چھوٹتے ہی فرمائش کرتے ہیں: ''سُنا بھئی مقبول احمد ہ اج سارا دن کی کجھ کردا رِھیا ایں؟'' مقبول احمد حقے کا اک لمبا کش لیتا ہے اور پھر اُس دن کی روداد شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہے ''سفر جاری ہے'' کا تاثر جو مجھ جیسے اک نیم خواندہ دیہاتی کے پردۂ ذہن پر اُبھرتا ہے۔ بیانیہ سادگی کی شدت اور بے ساختہ پن نے اِس آپ بیتی کو چیز دگر بنا دیا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھے ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم بہت یاد آئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب بات سادہ سے بڑھ کر سادہ اور خستہ لفظی سے کہی جائے تو وہ منہ سے نکلتے ہی سننے والے کے دِل میں گھر کر جاتی ہے۔
ملک مقبول احمد کی سادہ بیانی اپنے قاری کو مکمل طور پر گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ ملک صاحب کی انگلی پکڑ کر کتاب کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اگرچہ ملک صاحب کا یہ اسلوبِ نگارش کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں۔ لیکن آپ بیتیوں کے مروجہ سٹائل سے بالکل ہی مختلف ہونے کی بناء پر اِس سوانح عمری نے اک نئے رجحان Trend کو جنم دیا ہے۔ اچھا پھر کمال

کی بات یہ ہے کہ اِس سادگی میں ڈرتے ڈرتے ملک صاحب نے ربط وضبط کا اک نیا نظام تخلیق کر ڈالا ہے۔ یعنی جملے سے جملہ اِس طرح جڑا ہوا ہے جیسے رواں ندی میں چہروں کے اُتار چڑھاؤ کی ترتیب۔ کہیں بیان میں کوئی لوچ نہیں ہے اور کسی جگہ پر قاری کی توجہ بور نہیں ہونے پاتی۔ کہیں پر کوئی دوراز کار جملہ یا واقعہ اور کوئی جملہ معترضہ نہیں ملتا۔ ملک صاحب نے بلاکم وکاست اپنی داستانِ حیات اِس طرح فٹک جھٹک سے بیان کر دی ہے جیسے ایک دیہاتی سکول کی کلاس میں پینڈو طالب علم کھڑا ہوتا ہے۔ نماز کی طرح ہاتھ باندھتا ہے اور آنکھیں بند کر کے فرفر تیرہ (۱۳) کا پہاڑہ غلطی کیے بغیر سُنا ڈالتا ہے۔ ملک صاحب نے کہیں بھی تو غلطی نہیں کی۔ ادبی بزرجمہر اِس تحریر میں کیڑے نکالتے رہیں۔ لیکن میری ایماندارانہ ذاتی رائے یہ ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اتنی بھرپور سادگی اور خلوص میں تر بہ تر کتاب دیکھی اور پڑھی ہے۔ مصنف کی کرو بیانہ معصومیت پوری خواندگی کے دوران کلکاریاں مارتی رہی ہے۔ ملک صاحب کی یہ معصومیت بڑی کاملانہ اور عاملانہ ہے۔ دوسرے معنی میں اِسے اسم بامسمیٰ معصومیت کہہ سکتے ہیں۔ فون پر جب ملک صاحب بات کر رہے ہوتے ہیں تو اُن کی عاجزی وانکساری اور معصومیت چھپائے سے نہیں چھپتی۔

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ملک مقبول کوئی زاہد خشک خو نہیں ہیں۔ اُن کا دِل محبت سے لبالب ٹھاٹھیں مارتا دریا ہے اور اُن کے پیار کے یہ رشتے بابا خیرو کی لڑکی شمی سے لے کر مجھ گمنام اوران پڑھ شخص تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ملک صاحب دِل دینے میں اک ساعت کی دیر نہیں کرتے۔ بس دیکھا اور فٹ سے دِل ہتھیلی پر رکھ کے پیش کر دیا۔ شمی پہلی نظر میں اچھی لگی۔ انہوں نے اپنا دِل پیش کر دیا۔ ابھی اُس کی طرف سے کوئی ہل جل نہیں ہوئی تھی کہ وہ اللہ کو پیاری ہوگئی اور

ملک صاحب بن کھلے غنچوں پہ حسرت کرتے رہ گئے۔ پھر ہمارے سادہ دِل دوست بیک وقت دو بہنوں پر عاشق ہو گئے۔ وسعت قلبی دیکھئے کہ وہ دونوں کو دِل کی رانیاں بنانا چاہتے تھے ایک کو قضا لے گئی اور دوسری کو کھیڑے لے گئے اور رانجھا پھر سے دِل بدست ہو کر کسی نئی ہیر کا انتظار کرنے لگا۔ اپنے اِن ابتدائی معاشقوں کا اظہار ملک صاحب نے بڑے محجوب اور ملفوف لفظوں میں کیا ہے۔ میری چشم تصور دیکھتی ہے کہ جب وہ اِن معاشقوں کا ذکر کر رہے ہیں تو اُن کی نگاہیں نیچی ہیں۔ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ہے اور کانوں کی لوئیں سُرخ ہیں لیکن ساتھ ہی دبے لفظوں میں اعتراف بھی کر رہے ہیں: ''میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا''۔ پھر نظیر بیگم کہانی میں آجاتی ہیں۔ نظیر بیگم ماموں زاد جس سے ملک صاحب کی بچپن میں منگنی ہو گئی تھی۔ اب ملک صاحب عمر کے اُس حصے سے گذر رہے تھے جب انسان کے اندر سے خوشبوئیں پھوٹنے لگتی ہیں اور وہ مشکی سانپ کی طرح اِن خوشبوؤں میں مست و سرشار پھر رہا ہوتا ہے۔ اندر بوٹی اتنا شور برپا کر دیتی ہے کہ باہر سے کان پڑی آواز بھی گھبرو جوان کو سُنائی نہیں دیتی۔ ہمارے ملک صاحب کا دِل تو ویسے ہی ہتھیلی پر دھرا کسی کے انتظار میں مسلسل دھڑک رہا تھا۔ ماموں کے گھر چک ۸۶ شمالی سرگودھا پہنچے تو پہلی نظر میں آپ کا دِل اُڑا اور نظیر بیگم کے کندھے پر جا بیٹھا۔ اپنی اُس کیفیت کا اظہار ملک صاحب اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اٹھارہ برس کے اِس رومانوی مزاج نوجوان کے تمام شیر گرم دِھیمے اور میٹھے میٹھے احساسات اُسی کے لئے تھے۔ بلاشبہ وہ میرے ماموں کی دُختر نیک اختر تھی مگر میری زندگی کی ساتھی اور میرے گھر کی مالک بننے والی تھی۔ اِس لئے وہ اس دور میں ہی میرے دِل کی پہنائیوں میں مستقل طور پر آباد ہو گئی تھی۔ میرے ننھیال جانے کے ارادوں اور

پھر تمام سفر کے دوران وہ ذہن کے پردوں پر رقصاں رہتی۔ میں اُسے اپنی سچی اور گہری دوست سمجھتا تھا۔ بڑی سی حویلی کے کسی گوشے میں ہم گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ ہم دن کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کی نظروں کے دائرے میں گذارتے۔ خواتین بھی چونکہ ہمارے ہونے والے رشتے کے متعلق جانتی تھیں، اس لئے وہ ہمیں ایک جگہ بیٹھے دیکھ کر مسکرا کر رہ جاتیں۔ اُس کی قربت کی میٹھی میٹھی آنچ انوکھی نوعیت کی تھی۔ وہ دُبلی، پتلی، گوری، متناسب الاعضاء اور صاف شفاف چہرے والی لڑکی تھی۔ میری نظر میں وہ دنیا بھر کی لڑکیوں سے زیادہ حسین تھی۔"

پھر ملک صاحب کے ہاں طلوعِ خورشید ہوا۔ جو سراپا ملک صاحب نے بیگم خورشید مقبول کا کھینچا ہے، مجھے یقین ہے کہ اِس عمر میں اُسے پڑھ کر بھاوج صاحبہ شرم سے جھینپ گئی ہوں گی۔ بیگم خورشید آج سے باون سال پہلے ملک صاحب کی رفیق حیات بنیں۔ مگر کتاب کے آخر تک دُولہا میاں نے بیگم صاحبہ کے ایسے ایسے گُن گائے ہیں جیسے وہ چند گھنٹے پہلے انہیں سدروں اور آسوں کے ساتھ بیاہ کر لائے ہوں۔ میری نظر میں خورشید دنیا کی خوش نصیب ترین خاتون ہیں ورنہ اِس عمر میں میاں بیوی اک دوسرے کا چہرہ دیکھ دیکھ کر "نکونک" آئے ہوتے ہیں۔ دراصل ملک صاحب شیریں محبت کا اک چھلکتا ہوا پیالہ ہیں۔ صرف نظیر بیگم اور خورشید بیگم پر ہی موقوف نہیں ملک صاحب نے اپنے بچوں اور اُن کے بچوں سے لے کر ہر ملنے والے اور ہمہ شمہ کو اتنا پیار دیا ہے کہ پوری دنیا اِتراتی پھر رہی ہے کہ ملک صاحب اُس سے پیار کرتے ہیں...... مجھے تو ملک صاحب کی محبت ایسے ہاتھ لگی جیسے اندھے کے ہاتھ بٹیرا لگ جائے۔ اُس کی تفصیل پھر سہی۔

''سفر جاری ہے''

مقبول اکیڈمی لاہور کے روح رواں ملک مقبول احمد نے ''سفر جاری ہے'' کے نام سے اپنی خودنوشت شائع کی ہے سفر تو جاری رہے گا۔مگر مسافر وہی کامیاب و کامران ہوگا جس نے خلوص، عشق اور دیانت کو اپنا رہبر تسلیم کرلیا ہو ورنہ یہ سفر بھی اکارت جائے گا اور منزل بھی نہیں ملے گی۔اسی حقیقت کے پیش نظر ملک مقبول احمد نے اپنی خودنوشت میں وہی لکھا جو سچ تھا۔عظمتِ حرف کی توقیر کا انہوں نے پورا پورا لحاظ رکھا۔ان کی اس خودنوشت کو پڑھ کر ایک عام پاکستانی شہری، عام طبقہ کے نوجوانوں اور طالب علموں میں ایک بے پایاں حوصلہ اور ہر حال میں زندہ و رواں دواں رہنے کا عزم ملے گا۔تحریر میں شاعرانہ حسن اور ادیبانہ چاشنی نے اس خودنوشت کو ایک منفرد اور اچھوتی خودنوشت بنادیا ہے۔

ملک مقبول احمد کے بچپن اور جوانی کے حالات و واقعات اور ان کی اپنی سوچ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک شاعر طبع، آئیڈیل ازم کے قائل اور راست گو انسان ہیں مگر دنیا اور بالخصوص موجودہ صدی کا پاکستانی معاشرہ ایک شاعرانہ رویہ اور دانش ورانہ سوچ رکھنے والے انسان کے لیے مشکل اور کٹھن ماحول دیتا ہے۔یا شاید دنیا ہر دور میں ایسی ہی رہی ہے کہ بالکل سیدھے سادھے اور سچے کھرے خیالات رکھنے والے انسان عام معاشرہ میں ان فٹ ہوتے ہیں اس لیے انہیں اپنی عملی زندگی میں بالخصوص شادی کے بعد کے معاملات اور اپنی اولاد کو پالنے پوسنے کے لیے رزق حلال کے حصول میں کڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے ایسے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے جو اس کے ذہن، سوچ اور ذوق کے عین منافی

ہوتے ہیں اور اسے اپنی طبیعت کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

معاشرہ میں حلال روزی اور دیانتدارانہ کاروبار کرنے کے محاذ پر جن مشکلات و تکالیف کا سامنا ایک سٹیٹ فارورڈ انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو ملک مقبول احمد جوانی سے لے کر اب تک کر ہی رہے ہیں۔ ان کا گھر واقعی ایک جنت ہے۔ ماشاءاللہ۔

دنیا کی بے حسی اس قدر برداشت کرنا پڑی کہ ایک رات بے گناہ جیل بھی کاٹنا پڑی اپنا آبائی ضلع چھوڑ کر لاہور میں کاروبار شروع کرنا پڑا۔ لاہور میں ایک کم وسائل رکھنے والے کاروباری شخص کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ ہمارے معاشرہ میں دھوکہ دہی، فراڈ، وعدہ خلافی اور اپنے کم فائدے کے لیے دوسرے کا زیادہ نقصان کرنے والے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ ان تمام تلخ حقائق کا ملک مقبول احمد جیسے سادہ لوح شخص کو بے شمار مقامات پر سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ لوگوں کے بار بار دھوکہ دینے، نقصان کرنے کے باوجود آج وہ ایک اچھے کاروبار کے مالک ہیں۔ میں جس چیز، آسائش یا راحت کی طلب کرتا ہوں خدا کی ذات وہ راحت و آسائش عنایت فرمادیتی ہے۔ انہیں حج اور عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ملک مقبول احمد کی علمی، ادبی، سماجی اور مذہبی خدمات تاریخ کا روشن باب ہے۔ انہوں نے زندگی بھر دو ہزار سے زائد کتب شائع کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ لازوال خدمات کے پیشِ نظر پاکستان کی کئی سماجی، ثقافتی تنظیموں نے انہیں اعزازات دینا اپنے لیے اعزاز سمجھا۔ 2 فروری 2010ء کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل لاہور میں شیخ القرآن، شیخ الحدیث، مفکر عالم اسلام ممتاز مذہبی سکالر مفتی اعظم پاکستان ڈاکٹر غلام سرور قادری سینئر مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان، سابق صوبائی وزیر مذہبی امور کی زیر نگرانی قرآن وامن کانفرنس منعقد ہوئی جو جنگ گروپ کے پلیٹ فارم پر انعقاد پذیر ہوئی اس کانفرنس میں پاکستان بھر

سے سینیٹرز، ارکان پارلیمنٹ، قومی لیڈروں نے شرکت کی۔ جن میں قاضی عبدالقدیر خاموش سربراہ PDF، سینیٹر میر محبت خان مری، محترمی سینیٹر ریحانہ یحییٰ بلوچ، محترمی سینیٹر رتنا بھگوان داس، رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ، مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے مرکزی امیر پروفیسر ساجد میر، سہیل وڑائچ وغیرہ کی موجودگی میں:

ملک مقبول احمد کو **لائف اچیومنٹ ایوارڈ** مسلم لیگ کے مرکزی رہنما سینیٹر میر محبت خان مری نے اپنے دست مبارک سے دیا۔

اس موقع پر انہوں نے ملک صاحب کی مایۂ ناز خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور تمام رہنماؤں نے ملک مقبول احمد کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کی اور درازئ عمر کی دُعا دی۔ اس کے علاوہ:

قلم فاؤنڈیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے راقم نے بھی ملک مقبول احمد کو اُن کی ہمیشہ یادرہنے والی خدمات پر **گولڈ میڈل** دیا۔

العجم بوائے سکاؤٹس کی جانب سے عالمی شہرت یافتہ دانشور، ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار: ڈاکٹر انور سدید نے عظیم آراء فاؤنڈیشن کی طرف سے ملک مقبول احمد کو **گولڈ میڈل ایوارڈ** دیا۔

ملک مقبول احمد کی 82 سالگرہ کے موقع پر گورے ہوٹل جوہر ٹاؤن میں ان کے اعزاز میں ایک پُروقار تقریب منعقد ہوئی۔ جہاں مقصود احمد چغتائی بانی وچیئرمین عظیم آراء فاؤنڈیشن نے پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب کی جانب سے ڈاکٹر **عبدالقدیر خاں ایوارڈ** دیا۔

اور کہا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ساری قوم ملک مقبول احمد کی طرح محنت ودیانتداری کو اپنا وطیرہ بنائے تو بہت جلد ہم ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہو سکیں اور اس قومی ہیرو پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

☆☆☆

صائمہ نورین بخاری
ضلع خانیوال ڈویژن ملتان

خوشبو کا سفر

کتاب کی خاموش زبان سے شناسائی اور اس کے باطن میں چھپی دانش سے آشنائی رکھنا اور اس کی گویائی کے سمندر سے آنے والی پر اسرار ہواؤں سے باتیں کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں..... یہ دل فریب کام اگر فلسفی، شاعر، ادیب، نقاد اور اہل دانش کریں تو علم کی جادو نگری میں فکر و احساس کی سحر انگیز فضا جنم لیتی ہے..... تخلیق کا عمل الفاظ تراشنے لگتا ہے اور اگر یہی کام، فکر و احساس کی اس قوس و قزح کو سمیٹنے والا، الفاظ کو کتاب کے سانچے میں ڈھالنے والا طابع (پبلشر) کرے تو علم کی نگری میں کتاب کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے..... اور اگر یہ کہیں کہ جناب ملک مقبول احمد صاحب سلطنت علم کی ایسی ہی جادو نگری کے سچے، رحم دل، انصاف پسند اور مہربان بادشاہ سلامت ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔.......

مجھے جناب ملک مقبول احمد کی مشفق، علم دوست اور مہربان شخصیت سے اُردو ادب کے بلند پایہ ادیب، انشائیہ نگار و نقاد جناب جمیل آذر کی کتاب ''راہ نوردِ شوق'' نے متعارف کروایا۔ جناب جمیل آذر کی یہ منفرد، خوبصورت انشائی تنقید پڑھ کر ایک عجیب سا حیران کن مگر خوش گوار سا احساس دل کو بوجھل کر گیا..... یونہی الجھتے سلجھتے

سوچا...... کیا؟ ادبی سیڑھیوں اور سہاروں کے اس دور میں یہ ممکن ہے کہ کوئی کتاب ایک ادیب ونقاد کو اس قدر متاثر کرے کہ وہ نارسی سس کی طرح اس کے حسن کی جھیل میں غرق ہو جائے؟..... کتاب پر کتاب تخلیق ہو جائے؟ اور یہ الجھن...... ایک حیرانی میں اس وقت تبدیل ہوگئی جب اس امر پر غور کیا کہ ''راہ نوردِ شوق'' نے کسی باقاعدہ مصنف کی تحریر سے متاثر ہو کر نہیں جنم لیا بلکہ اس کتاب کے پیچھے ''سفر جاری ہے'' کی آپ بیتی کا محرک کارفرما ہے........ جس کے مصنف تو ایک سادہ دل اور مقبول ومعروف پبلشر ہیں....، گویا...... ایک الجھن.... ایک گنجلک اور بڑھ گئی...... اس کرخت Blunt & Bold دور میں سادہ دلی اور مقبولیت ایک ساتھ...... کچھ سمجھ نہیں آیا..... ویسے ایک سچی بات بتاؤں بحیثیت قوم تو ہم ویسے ہی بہت سے مخمصوں، الجھنوں اور حیرانیوں کا شکار ہو چکے ہیں.... لیکن 1971ء کی جنگ کے بعد پیدا ہونے والی ''پاکستانی مخلوق'' تو بہت ہی دکھی ہے...... ہمیں بہت سی سیدھی باتیں بھی عجیب لگتی ہیں..... ہمارے بڑے جب ہمیں قیام پاکستان سے پہلے کے حالات واقعات بتاتے ہیں تو وہ ہمیں کسی Fairy Tale کی طرح محسوس ہوتے ہیں...... ہمیں اس وقت کے حادثات بھی...... آج کے خوفناک حالات کے مقابلے میں رومانوی واقعات کی کوئی کڑی معلوم ہوتے ہیں...... ہمیں اور بھی چیزیں حیران کرتی ہیں جیسے آمریت اور جمہوریت کا ساتھ ساتھ چلنا، سیاست دانوں اور افسروں میں سے کسی کا دیانت دار ہونا...... شادی یا مرگ کی محافل ورسومات میں کسی فردِ واحد کی تعریف پر سب کا متفق ہونا...... ہمارے زمانے کے ''عظیم'' گلوکاروں کی کلاسیکی موسیقی میں دلچسپی کی نشان دہی ہونا...... اداکاراؤں کا صرف اداکاری کرنا...... ہوش ربا مہنگائی میں کسی کا بے وجہ سخی ہونا کسی کا بے سبب اچھا ہونا، ڈاکٹر کا فیس نہ لینا، عاشقوں کا شادی شدہ ......

ہونا...... کتابوں کے بنڈلوں میں دبے ہوئے ادیب کا سر پھرا نہ ہونا، مشاعروں میں شعراء کرام کا ایک دوسرے کو داد دینا اور وہ بھی دل سے ایسے میں کسی پبلشر کا مصنف ہونا اور ایسی تہلکہ خیز ''آپ بیتی'' تحریر کرنا کہ برصغیر کے نامور ادیب نارسی سس بن کر اس کے حسن کی جھیل میں اپنا عکس دیکھنے لگیں اور ان کی خوشی ''پذیرائی'' جیسی ضخامت اختیار کر جائے Amazing......

مگر میری یہ حیرانی، حقیقی مسرت و انبساط میں اس وقت بدل گئی جب ملک مقبول احمد صاحب نے جناب پروفیسر جمیل آذر سے عقیدت کے سفر کو جاری وساری رکھتے ہوئے، مجھے یہ خوبصورت خود نوشت سوانح عمری تحفتاً ارسال فرمائی...... سچائی، سادگی، روانی اور سلاست سے بھرپور تحریر نے کچھ اس طرح توجہ کو سمیٹا کہ ایک ہی نشست میں کئی اوراق نگاہ میں اترتے چلے گئے...... یوں محسوس ہونے لگا کہ پہاڑوں سے لپٹی ہوئی برف، سورج کی سنہری کرنوں نے پگھلا کر رکھ دی ہے...... ہوا زرد چادر سے اپنے بکھرے بالوں کو ڈھانپے، گئے موسموں کو صدا دے رہی ہے...... تتلی، جگنو، پہاڑ، پرندے، گئے موسموں کا دکھ درد سمیٹے، اپنی اپنی کہانیاں سنا رہے ہیں اور زندگی کے جزیرے پر روحانی خوشی کی تلاش کا سفر جاری ہے...... مشقت، دیانت اور صداقت کا سفر...... جس میں بہت سی جسمانی، خوشیوں اور خواہشوں کی قربانی دے کر ہی روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے......

دکھوں، غموں، خوشیوں کے بادلوں میں اگر سچائی، اور سادگی کی روشنی پھوٹی پڑ رہی ہو تو وہ ''سفر جاری ہے'' کی نوید سناتی ہوئی ''پذیرائی'' کا گنبد بن جاتی ہے...... گویا

بھٹکے اس اندھی بھیڑ میں تنہا تمام عمر
لوٹے جب اپنی ذات میں ہم قافلہ ہوئے

اردو سوانح عمری دراصل تاریخ کا ایک شعبہ یا شاخ ہے۔ مناقب، سیرت اور تذکرہ سب اسی ریل میں شامل کیے جاتے ہیں...... اردو سوانح عمریوں کو اگر تین ادوار میں تقسیم کیا جائے تو پہلا دور وہ ہے جب دکنی یا قدیم اردو میں نظمیہ کتابیں رقم ہوئیں...... دوسرا دور وہ ہے جب نثر میں سوانح عمریاں مرتب کی گئیں، اور تیسرا دور وہ ہے جب جدید مغربی طرز پر سوانح عمریاں لکھی جانے لگیں...... حقیقت نگاری لازمی سمجھی جانے لگی اور تنقید کا وجود بھی ناگزیر ٹھہرا، سوانح عمری کی دو اقسام نمایاں رہیں:۔

(1) سیرت النبی ﷺ اور اکابرین سلف کی سوانح عمریاں

(2) ہم عصروں کی سوانح عمریاں...... جن میں مؤرخ، ادیب، مصلح قوم وغیرہ سب ہی شامل کئے جا سکتے ہیں...... مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مضمون میں 753 سوانح عمریوں کی تعداد فراہم کی ...... اور جناب نصیر الدین ہاشمی کے مضمون ''اردو زبان کی قدیم سوانح عمریاں (2949)'' تک تعداد اندازاً بارہ سو تھی۔

خودنوشت یا آپ بیتی لکھنے کا رجحان تیسرے اور جدید دور میں تیزی سے پروان چڑھا...... گویا مولانا الطاف حسین حالی کے بعد سوانح عمری تجدد کی دنیا میں داخل ہوگئی...... اُردو کی مقبول خودنوشت سوانح عمریوں میں جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، مرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری'' وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے'' پروفیسر آغا سہیل کی ''خاک کے پردے میں''، ''نشانِ جگر سوختہ'' اور ڈاکٹر سلیم اختر کی شامل ہیں......

ان سب آپ بیتیوں میں زندگی کے دل چسپ اور کٹھن سفر کی داستان کے

ساتھ ساتھ ادبی لطافت کی چاشنی اور اسلوب کی نیرنگی بھی شامل ہے۔ ملک مقبول احمد
کی خودنوشت ''سفر جاری ہے''...... ایک ایسے مصنف کی خودنوشت ہے جو کتاب کے
ہیروں کی کان کے مالک بھی ہیں...... اور ان کی علمی دولت اور عالمی شہرت کو مارکوئیس
پبلشنگ بورڈ نے اپنی سالانہ کتاب Who's who in the world....1999
میں تسلیم کیا ہے۔ اور ان کی اس آپ بیتی پر سینکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں...... کیونکہ
ان کے اسلوب میں ڈپٹی نذیر احمد ایسی سچائی خود بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایک انہی کی
طرح کے "Self made man" کی داستان ہے...... ان کی تحریر میں پریم چند کے
افسانوں جیسے دیہات کے معصوم اور حسین رنگ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت جلوہ گر ہوتے
ہیں...... اور ان کا رومان...... اے حمید کے ناولوں کی رومانوی یادوں کی طرح سحر انگیز
مہک سے لبریز نظر آتا ہے...... یوں لگتا ہے کہ ادب کے پھولوں کے درمیان رہ کر
خوشبودار ہو جانے والی مٹی خود بول اٹھی ہے کہ

''میری خوشبو کا سفر جاری ہے''

قارئین کرام! ہمارے ہاں عام طور پر عجز و انکساری، مجذوبوں فقیروں
اور مولاناؤں کا اسٹائل سمجھی جاتی ہے...... مگر پبلشرز کے ایک بہت بڑے اجارہ
دارانہ مقابلے "Monopolistic Competition" میں جناب مقبول احمد کی یہ
عجز و انکساری...... یہ عالمِ خودی و بے خودی، ذرا ان جملوں میں ملاحظہ کیجئے......

''میں ایک عام سا بندہ ہوں...... اس کے سوا میری کوئی خصوصیت نہیں
میں نہ تو دنیاوی علوم میں درک رکھتا ہوں اور نہ ہی دینی علوم میں مولوی یا
مولانا ہوں، میرے شعور کی آنکھوں نے جبر، ظلم اور استحصال کو کبھی پسند
نہیں کیا، میرے تمام مسائل بنی نوع انسان کے تمام لوگوں جیسے ہی رہے

ہیں......"

لہٰذا میری رائے کے مطابق تو ملک مقبول احمد نہ صرف مصنف و پبلشر بھی ہیں بلکہ جناب تو ایک ماہر معاشیات (Economist) بھی ہیں۔ جو ایک مصنف کے Budget بجٹ اور Savings بچت کا فرق بھی بخوبی جانتے ہیں اور اس استحصالی طبقے کو رائلٹی وقت پر اور بیشتر اوقات تو پہلے بھی ادا کر دیتے ہیں۔ اہل قلم کو اکثر کتابوں کا نایاب و انمول تحفہ اپنے (Expenditures) خرچوں پر عنایت فرماتے ہیں۔ گویا ان کے مسائل اور وسائل کو ایک وزیر خزانہ کی طرح نہیں بلکہ ایک اچھے معیشت دان کی طرح سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں...... ان کا واسطہ جن "امیروں" سے ہے وہ کتنے اداس رہتے ہیں۔

یہ خوش لباس بھی اکثر اداس رہتے ہیں
امیر لوگوں کی بستی غریب ہوتی ہے

آج کل ایسے "غریب شہر" میں فصلیں اتنی اونچی ہوگئی ہیں کہ سچے ستھرے گاؤں کی ٹھنڈی ہوا کا گزر بھی یہاں نہیں ہوتا...... محبت کے ارضی مفہوم کو "گلوبل ولیج" والے بھی بھلا بیٹھے ہیں...... شبنمیں گھاس، کھلتے پھول، پہاڑوں پہ جمی برف کی نیلی روشنیاں، برسات کے بھیگے بادل اور حشرات الارض کے شور میں ڈوبی چاند کو تلاش کرتی راتیں، کھلی فضاؤں میں اڑتی کونجوں کی ڈار، مکئی اور گندم کے بھنتے دانوں کی گرم گرم خوشبو...... ملک مقبول احمد صاحب...... آپ نے ان تمام گم شدہ سچائیوں کا ہمیں ادبی لوڈ شیڈنگ کے اس دور میں احساس دلایا...... اور وہ بھی اس طرح کہ اپنی منزل کے سفر کی کٹھنائیوں کو خود ترسی اور احساسِ برتری کے سیاہ رنگوں سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس آپ بیتی کو ہماری آنے والی نسلیں بھی اسی شوق و ذوق اور عزت و احترام

سے پڑھیں گی...... اور یہی کہیں گی جو جناب سید قاسم محمود صاحب کے الفاظ کہتے ہیں....

''کہ عام طور پر ناشرین کو کاروباری سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، چلئے کاروبار ہی سہی، لیکن وہ لوگ نہ ہوتے تو کہاں کا غالب اور اقبال، پریم چند اور رتن ناتھ سرشار، منٹو اور انتظار حسین، یہ سب کہاں ہوتے، ان کا وجود و قیام ظاہر ہے کہ ناشرین کے دم قدم سے ہے۔''

اور ناشرین ملک مقبول احمد جیسے با اخلاق، صاف گو، ہمدرد اور با اصول ہوں تو پاؤں خود راستہ ہوتے جاتے ہیں...... منزلیں آسان لگنے لگتی ہیں...... راہ گزر پتھر کی ہو اور ہم سفر شیشے کا ہو تو بھی، ہر قدم پر عزم و ہمت اِک نیا منظر امید سجا دیتی ہے......

روزنامہ ''نوائے وقت''

ماہنامہ ''تخلیق''

☆......☆......☆

سفر جاری ہے

ایک حقیقی اور خوبصورت بائیوگرافی وہی ہوتی ہے جس میں انسان اپنی خوبیوں اور اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی بیان کرے مگر فی زمانہ ہمارے ہاں جتنی بائیوگرافیاں یا خودنوشت لکھی گئیں اس میں لکھنے والوں نے خود کو فرشتہ بتایا۔ پاکستان کے ممتاز ادیب ممتاز مفتی نے جب ''علی پور کا ایلی'' لکھا تب وہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ یہ ان کا اپنا کردار تھا اپنی زندگی سے چند برس قبل انہوں نے اس کا اعتراف کیا تاہم یہ تمہید باندھنے کی نوبت اس لیے آئی کہ جس کتاب پر ہم تبصرہ کرنے جا رہے ہیں وہ ملک کے معروف دانشور ادیب اور پبلشر ملک مقبول احمد ہیں اور ''سفر جاری ہے'' ان کی ایسی خود نوشت ہے جس میں انہوں نے اپنی ذات کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ خود کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنی ذات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہیں بھی ڈنڈی نہیں ماری بقول ڈاکٹر عبد القدیر خان ملک مقبول نے ایک طویل دلچسپ داستان ''سفر جاری ہے'' لکھ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد نے اپنا فن علم اور تجربہ یہ سب اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ خصوصاً ان کی کتاب کا پہلا باب ''بچپن اور لڑکپن'' ان کی ذاتی زندگی اور بچپن کی محبتوں سے عبارت ہے جس پر لکھتے ہوئے ملک صاحب نے کسی طور بھی بخل سے کام نہیں لیا خصوصاً بابا خیرو کی لڑکی، شہناز اور شمشاد سے اپنے عشق کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ ملک صاحب کی خوبی یہ ہے کہ جب وہ اپنے بارے میں بھی لکھنے بیٹھتے ہیں تو ساتھ ساتھ اپنے دور کی تہذیب کلچر روایات رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقوں کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں اس طرح یہ کتاب

پڑھ کر جہاں ایک عظیم شخصیت کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے وہیں ان کے عہد کی کئی کہانیاں بھی سامنے آجاتی ہیں مثلاً ''چودھری صاحب اور ننھا'' والا واقعہ سالانہ میلہ اور سیف الملوک' بیری کا پیڑ یہ سب وہ موضوعات ہیں جن کے بارے میں پڑھ کر انسان کو اس دور کے طرز زندگی اور کلچر سے بھی آگاہی ہوتی ہے ''سفر جاری ہے'' کے حوالے سے اگر دریا کو کوزے میں بند کیا جائے تو وہ ڈاکٹر صفدر محمود کے ان الفاظ پر اختتام ہوسکتا ہے کہ میں تو ملک صاحب کو صرف ایک شریف النفس انسان اور ایک معروف اشاعتی ادارے کے مالک کی حیثیت سے ہی جانتا تھا مگر ان کی خودنوشت اور سوانح عمری کے مسودے کی جب ورق گردانی کی تو یہ راز کھلا کہ ملک صاحب صرف کتابیں چھاپتے ہی نہیں بلکہ کتابیں ان کے اندر بھی بستی ہیں اور وہ پبلشر ہونے کے باوجود کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ بہر طور ''سفر جاری ہے'' محض ملک صاحب کی خودنوشت نہیں بلکہ یہ ایک عہد کی داستان ہے اور جس کا بیان ملک صاحب کے الفاظ میں ہی اچھا لگتا ہے۔

(روزنامہ ''مشرق'' لاہور)
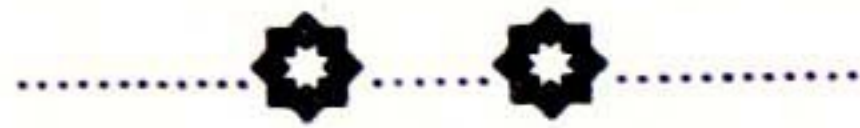
شہزاد ملک (بھولا پینڈو)

روزنامہ ''اپنا دیس'' میر پور (آزاد کشمیر)

''سفر جاری ہے''

ملک مقبول احمد کی سوانح عمری (سفر جاری ہے) کے علاوہ دس بارہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کی درویشی ان کی ایک ایک لائن سے عیاں ہے۔ اگر چہ میری ملک مقبول احمد سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے مگر میں ان کا قاری ہوں اور قاری اور لکھاری کا رشتہ اگر بے غرض ہو تو یہ بھی بڑا مقدس رشتہ ہوتا ہے۔ مگر ملک مقبول کی سوانح عمری (سفر جاری ہے) پر میرا مضمون لکھنے کی وجہ ان کی لکھی ہوئی یہ چند لائنیں بنی ہیں۔ اگر چہ بطور پبلشرز انہوں نے کئی کتابیں چھاپی ہیں۔ پچاس کی دہائی سے لیکر ایک طویل عرصے تک اپنا میگزین ''چودھویں صدی'' باقاعدگی سے شائع کرتے رہے ہیں ان کا تخلیقی سفر نصف صدی پہ محیط ہے مگر ان کی سوانح حیات میں لکھی گئی یہ چند لائنیں اپنے اندر کمال کی سچائی رکھتی ہیں۔ ملک مقبول احمد لکھتے ہیں ''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹس، ڈگریز اور دستاویزی حوالوں سے انتہائی کم علم ہوں مگر پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبودار ہو جانے والی مٹی کی طرح شعراء، مصنفین، مترجمین، محققین اور عالی ظرف انسانوں اور کتابوں کے داخلی جمال سے فیضیاب ہوا اور میں خود بھی ایک کتاب بن گیا، تقریباً پچاس سالوں سے میرا اُٹھنا بیٹھنا اور سونا کتابوں کے ساتھ ہے۔ مجھے اپنے ہر سانس کے ساتھ اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے پروردگار نے

مجھے اہلیتوں، کاوشوں اور کاروباری جدوجہد اور میری کارگزاریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ مولا کریم نے مجھے میری ماں (بے جی) کی دعاؤں کے نتیجے میں دیا ہے"۔

ملک مقبول احمد کی مذکورہ بالا لائن کے بعد میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آتے ہیں کبھی سوچتا ہوں کہ ڈگریز اور ڈنگروں میں کیا فرق ہے اور ڈگریز ڈنگروں کے گلے میں ڈال دی جائیں تو کیا وہ انسان بن جاتے ہیں اور ہمارے ہاں ڈگریز والے ڈنگروں کی تعداد کیا ہے۔ آج وقت کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ تعلیم عام ہونے کے باوجود بھی انسانی اقدار کمزور اور ہمارا معاشرہ آلودہ ہے ایسے میں ملک مقبول جیسے انڈر میٹرک جگنو نہیں چراغ ہیں ہمیں ایسے ہیروں کی قدر کرنی چاہئے۔ انہیں پڑھنا اور ان کے فن کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہئے، بطور بھولا پینڈو میں جب پینڈو لوگوں یا پھر حالات و معاشرے کی ٹھوکروں سے تراشے ہوئے ہیروں سے ملتا ہوں تو میں ان کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کرتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین ضرور پیش کرتا ہوں۔ اس لئے میں اپنی آج کی اس تحریر کو ملک مقبول احمد کے نام کر رہا ہوں۔

قارئین محترم! میں اپنی اس تحریر کو تبصرہ اس لئے نہیں کہوں گا کہ کتاب پر سینئر ترین لوگوں کے تبصرے موجود ہیں جن میں ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، اے حمید، شعیب بن عزیز، طارق اسماعیل ساگر، سید واجد رضوی، ابوالامتیاز ع،س مسلم، قاضی ذوالفقار احمد، قمر نقوی، ڈاکٹر اللہ بخش وغیرہ کے علاوہ مشاہیر کی آراء میں بھی بیسیوں لوگوں نے اظہار عقیدت کیا ہے جن کی تفصیل کتاب کے آخر میں موجود ہے سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل روشنی ڈالی ہے اپنے رومانوی، ازدواجی اور ادبی حالات و واقعات کے علاوہ میگزین ''چودھویں صدی'' اور ''احباب کے یارانے'' سب کچھ اس کتاب میں شامل ہیں اور یہ سب کچھ پڑھ کر مزا آتا ہے۔ یہ کتاب ہمیں ایک روشن چراغ سے ملواتی ہے۔ اس لئے قارئین کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔

قارئین کرام! ایک کتاب لکھنے میں لکھاری کی صرف نیند ہی قربان نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا خون بھی سوکھتا ہے۔ کتاب صرف خوبصورت ٹائٹل قیمتی کاغذ اور دلکش جلد ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں لکھنے والے کے تجربات، مشاہدات، قلبی وارداتیں، دماغی عرق ریزیاں اور خون جگر بھی شامل ہوتا ہے اسی لئے لکھاری طبقے پر ہمیشہ چربی کی کمی پائی جاتی ہے۔ میں اس شاندار کاوش پر ملک مقبول احمد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دُعا گو ہوں کہ ان کا یہ کامیاب سفر ہمیشہ جاری رہے اس میں انہیں نہ تو کبھی کوئی تھکاوٹ محسوس ہو اور نہ ہی کوئی رکاوٹ آئے۔

آخر میں اپنے قلم کار دوست راجہ عدیل بھٹی کا شکر گزار ہوں کہ ان سے مجھے اکثر اس قسم کی اچھی کتابیں مل جاتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر تازگی ملتی ہے اور جن پر لکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔

روزنامہ ''اپنا دیس''

میر پور (آزاد کشمیر)

............☆☆............

شناسائی

◆◆

فہرست

...........o...........

شناسائی

لاہور کے اردو ناشرین کے حلقے سے کچھ عرصہ قبل ملک مقبول احمد ایک مصنف کی صورت میں رونما ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اشاعتی سفر کی کہانی آپ بیتی کی صورت میں لکھی اور اسے ''سفر جاری ہے'' کا عنوان دیا۔ اس کتاب کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ملک صاحب نے اپنے ادارے مقبول اکیڈمی کے مصنفین کے تذکرے کو بھی اس کتاب میں نمایاں اور باوقار حیثیت دی اور اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ وہ اہل قلم نہیں ہیں لیکن مصنفین اور ان کی کتابوں کے درمیان بیٹھ کر ان کو بھی قلم اٹھانے اور کاغذ پر اپنے خیالات اتارنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شوق بھی ان کے باطن سے خود پیدا نہیں ہوا بلکہ اس طرف انہیں ان کے پوتے پوتیوں نے لگایا جو دادا سے ان کی زندگی کی کہانی سنتے تو تقاضا کرتے کہ یہ لکھ ڈالئے۔ اب یہ لاہور کی اشاعتی زندگی کا بے مثال واقعہ ہے کہ اس کتاب ''سفر جاری ہے'' پر مصنفین نے اتنے تبصرے اور مضامین لکھے کہ ایک نئی کتاب ''پذیرائی'' کے عنوان سے بن گئی اور اب ''شناسائی'' بھی اسی تسلسل میں شائع ہو رہی ہے۔ اب یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ ''سفر جاری ہے'' ممتاز ادیب جمیل آذر نے پڑھی تو انہوں نے ایک تبصراتی کتاب ''راہِ نوردِ شوق'' لکھ ڈالی جس کا مرکزی کردار ملک مقبول احمد صاحب ہیں۔ زیر نظر کتاب ''شناسائی'' میں اول الذکر تینوں کتابوں یعنی ''سفر جاری ہے''، ''پذیرائی'' اور ''راہِ نوردشوق'' پر لکھے گئے تبصرے پیش کئے گئے ہیں۔

لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان، بانو قدسیہ، علامہ عبدالستار عاصم، دردانہ نوشین خان، پروفیسر شفیع ہمدم، صائمہ نورین بخاری، گوہر ملسیانی اور متعدد نامور ادیب شامل ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے تبصروں کو بھی نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب مطالعے کا انوکھا مواد فراہم کرتی ہے اور سابقہ کتابوں کے مطالعے پر بھی راغب کرتی ہے۔

روزنامہ "نوائے وقت"

۲۰ نومبر ۲۰۱۱ء

............☆☆............

ڈاکٹر طارق عزیز

۱۴۶۔ حسیب بلاک، اعظم گارڈنز، ملتان روڈ، لاہور

شناسائی

''شناسائی'' ملک مقبول احمد کی تازہ تصنیف ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔
حصہ اول اُن آراء پر مبنی ہے جو نامور اہل قلم نے اُن کی خودنوشت سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' پر دی تھیں۔ ''سفر جاری ہے'' کو اتنی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کی مختلف جہتوں پر اس تواتر سے لکھا گیا کہ ان تحریروں اور تبصروں کو یکجا کرنا لازمی ٹھہر، لہٰذا اِن حروف پذیرائی کو ''پذیرائی'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ لیکن ملک مقبول احمد نے اس میں جدت یہ پیدا کی کہ ہر تبصرہ نگار کے سوانح اور اُس کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کے حوالے سے مکمل تعارف بھی شامل کر دیا۔ اس رنگ جدید کی وجہ سے ''پذیرائی'' کو بھی قارئین اور ملک مقبول احمد کے چاہنے والوں نے از بس سراہا۔ ان حروفِ ستائش کو ''شناسائی'' کے حصہ دوم کی زینت بنا گیا ہے۔

حصہ سوم پروفیسر جمیل آذر کی ''راہ نوردِ شوق'' پر معروف ادیبوں کی آراء اور تبصروں پر مشتمل ہے۔ ''راہ نوردِ شوق'' ملک مقبول احمد کے ساتھ پروفیسر جمیل آذر کا اظہار و اقرارِ عشق ہے جسے انہوں نے کمال مہارت کے ساتھ کتابی شکل میں مجسم کیا ہے۔ ہر عشق کوئی نہ کوئی گل کھلاتا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر اور ملک مقبول احمد کے عشق نے ''راہ نوردِ شوق'' کو جنم دیا ہے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''شناسائی'' ملک مقبول احمد کے اُن ''شناساؤں'' کی

تحاریر اور تعارف پر مشتمل ہے جو اُن کے ادبی سفر کے گواہ اور تخلیقی اپج کے مداح ہیں۔ وہ ادیب اور شاعری جو پہلے صرف ملک مقبول احمد کے احباب میں شامل تھے، اِن تعارف ورق در ورق اتنا دراز ہوا ہے کہ ملک مقبول احمد اب ''مقبول بکس'' کی بجائے ''مقبول Facebook'' کے نام سے پہچانے جائیں گے۔

............☆☆............

پروفیسر جمیل آذر

پذیرائی سے شناسائی تک

فرانسیسی نقاد رولاں بارت (Roland Barthes) نے کہا تھا کہ لکھت لکھتی ہے"۔ میں نے اس کی بات کو بڑھاتے ہوئے کہا "تخلیق" تخلیق کرتی ہے یا "کتاب، کتاب لکھتی ہے" میرے قول کی تصدیق ملک مقبول احمد کی کتاب "سفر جاری ہے" نے کردی۔ انہوں نے یہ کتاب جنوری 2007ء میں شائع کی۔ یہ کتاب اُن کی اپنی آپ بیتی ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کو اِس ہنروری سے سپردقلم کیا جس میں انہوں نے نہ صرف اپنے اور اپنے وقت کے بارے میں لکھا ہے بلکہ تمام لوگوں اور تمام وقت کے بارے میں لکھا ہے۔ جونہی یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی تو اہل نظر نے اِسے کشادہ دلی سے پذیرائی بخشی اور کم و بیش سو(100) کے قریب ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور نقادوں نے اپنے خیالات کا تحریری طور پر خلوصِ نیت کے ساتھ اظہار کیا۔ ان مشاہیر کی تحریریں اتنی صداقت پر مبنی تھیں کہ مصنف نے انہیں "پذیرائی" کے نام سے شائع کردیا۔ "پذیرائی" کی اشاعت میں مصنف نے کمال یہ کیا کہ ان کی تحریروں کے ساتھ مصنفین کا تعارف اِس خوبصورتی سے کرایا کہ ادب میں "تعارف نامہ" کے نام سے ایک نئی صنف ظہور میں آگئی۔ ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ہو یا "پذیرائی" اِن میں اُن کے خلوص، محبت اور حسن کا بے پایاں دخل ہے۔ جن ادیبوں نے اُن کی کتاب "سفر جاری ہے" پر اپنے پرخلوص تاثرات کا اظہار کیا اُن میں ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد منشا یاد، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر طارق عزیز، اے حمید،

شعیب بن عزیز، ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم، قمر نقوی اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک جیسے متعدد مشاہیر شامل ہیں۔

مارچ 2007ء میں مجھے ڈاکٹر انور سدید نے ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' کا ایک نسخہ ارسال کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں اس پر اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار ضرور کروں۔ میں ان دنوں علیل تھا اور طبیعت لکھنے کی طرف مائل نہیں تھی کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب کا یاد نامہ آ گیا اور تاکیداً کہا کہ جلد از جلد اپنی رائے کا اظہار تحریری طور پر انہیں ارسال کر دوں۔ میں بغیر کتاب پڑھے اس پر تبصرہ یا رائے دینے کو پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اب جوں جوں میں کتاب پڑھتا گیا توں توں میں اِس کتاب کی تخلیقی خوشبو سے سرشار ہوتا چلا گیا۔ میں نے ایک طویل تبصرہ سپردِ قلم کر کے ڈاکٹر انور سدید کو ارسال کر دیا۔ جب ملک مقبول احمد صاحب نے میرا تبصرہ پڑھا تو انہوں نے محبت سے لبریز اپنی نرم شیریں آواز میں مجھے ٹیلیفون کیا اور میرے تبصرے کو بے حد پسند فرمایا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اوپر مذکورہ سطور میں کہا ہے کہ تخلیق، تخلیق کرتی ہے۔ میں نے پھر ''سفر جاری ہے'' پر پوری کتاب سپردِ قلم کی اور اسے ''راہ نوردِ شوق'' کے نام سے مکتبہ فکر و خیال، لاہور نے 2008ء میں شائع کیا۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اچھی آپ بیتی تمام لوگوں اور تمام وقت کے لئے ہوتی ہے۔ ''سفر جاری ہے'' نے میرے اندر کے واقعات و مشاہدات کو اتنا تخلیقی طور پر بیدار کیا کہ میں ملک مقبول احمد کی شخصیت میں گم ہو گیا یا ملک مقبول احمد میری ذات میں تحلیل ہو گئے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ جب ہم پرانی باتوں کو یاد کرتے ہیں تو ایک طرح کی ناسٹلجائی کیفیت ہم پر طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے ''راہ نوردِ شوق'' کا اختتامیہ ان الفاظ پر کیا:۔

''میرا اور ملک مقبول احمد کا محبت اور دوستی کا پراسرار روحانی رشتہ ہے۔ میری

اس دوستی کو آج پورا ایک سال ہو گیا ہے۔ آج بروز جمعہ 16 مئی 2008ء کو
جب میں اِس کتاب کے اختتامیہ الفاظ سپرد قلم کر رہا ہوں تو میں اپنی دوستی کی پہلی
سالگرہ (First Anniversary) منا رہا ہوں۔ پورے ایک سال میں اُن
کی خودنوشت سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' کا ہم سفر رہا ہوں، میں رات دن
ملک صاحب کی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔ جب گزشتہ نومبر 2007ء کو
میں اپنے چھوٹے بیٹے گوہر جمیل سے ملنے دوبئ گیا تب بھی اپنے ساتھ اُن کی
کتاب کو لے گیا۔ مطالعہ کے دوران کئی مرتبہ میری آنکھوں سے آنسو چھلکے
میرے خیالوں اور خوابوں میں ملک مقبول احمد اور اُن کی تحریر رہی اور میں اس پر
غور و فکر (Contemplation) کرتا رہا۔ حیرت ہے کہ ہر زاویہ سے مجھے اپنا
ہی عکس جمیل نظر آیا۔ میری اُن سے اب تک بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن اُن
کی نرم اور شیریں محبت سے لبریز آواز ٹیلیفون پر سنتا ہوں تو خوشی و مسرت سے
سرشار ہو جاتا ہوں۔ اب پتہ نہیں میری یہ کتاب اُن کی سوانح حیات ہے یا میری
یا ہم دونوں کی یا ہمارے پورے معاشرے کی جس میں ہم سب رہ رہے ہیں اپنی
پوری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ!۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ملک مقبول احمد کی
داستانِ حیات حسن و صداقت کی کہانی ہے ''حسن سچ ہے اور سچ ہی حسن ہے''۔

ملک مقبول احمد نے ''پذیرائی'' کے حوالے سے اپنے پرستاروں کا تعارف اس
نفاست، خوبصورتی، محبت اور یگانگت سے کیا ہے کہ وہ بذاتِ خود ادب پارے بن گئے ہیں۔
دیکھئے ڈاکٹر انور سدید کا تعارف وہ کس محبت سے کراتے ہیں:۔

''میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید دریا دل انسان ہیں انہیں کسی
ستائش اور صلے کی تمنا نہیں، اُردو ادب کی خدمت ان کا مشن ہے اور وہ انتھک

محنت کے ذریعے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے تاکہ وہ مزید ادبی اور تخلیقی کام کرسکیں۔ (آمین)''

اظہر جاوید صاحب کو وہ محبت و عقیدت کے ساتھ اس طرح یاد کرتے ہیں:

''اظہر جاوید عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے، لیکن میں اس کا احترام بڑوں کی طرح کرتا ہوں۔ وہ جب کبھی مقبول اکیڈمی پر آتے ہیں تو میں اس کا استقبال دروازے پر کرتا ہوں اور خود اس کے دفتر میں جاؤں تو دروازے پر دستک نہیں دیتا تاکہ اظہر جاوید اپنی مسند پر کھڑے نہ ہو جائے۔ اظہر جاوید سے دوستی کا یہ رشتہ سالہا سال سے چل رہا ہے......''

ملک مقبول احمد کے ہاں حسن لطافت اور حسنِ مزاح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کی ایک مثال علامہ عبدالستار عاصم کے تعارف سے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے ''پذیرائی'' کے حوالے سے کرایا ہے:

''علامہ عبدالستار عاصم میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے، میرا خیال ہے کہ عبدالستار عاصم کے پاس ضرور کوئی گیدڑ سنگھی ہے کہ کئی ویلے مشٹنڈے، آوارہ گرد، اٹھائی گیرے، فلمی اداکار، صحافی، ادیب، صنعت کار، سیاستدان، علماء، وکیل، شاعر وغیرہ ان کے گردیدہ ہیں، وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت لاہور میں وہ واحد ادیب صحافی ہیں جن کا کوئی دشمن نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دشمن سے بھی ملیں تو اس کو پہلے مٹھائی کا ڈبہ پیش کر دیتے ہیں......''

''پذیرائی کی اشاعت کے بعد شناسائی کی اشاعت اِس لئے ضروری ہوئی کہ ''سفر جاری ہے'' کے حوالے سے بعض مشاہیر ادباء کے، جو باوجوہ اپنے تبصرے ارسال نہ کر

سکے تھے، تبصرے اور خطوط موصول ہونے لگے۔ اِن مشاہیر میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے مایۂ ناز پاکستان کے نامور ایٹمی سائنسدان اور مشہور افسانہ و ناول نگار بانو قدسیہ بھی شامل ہیں۔ ملک صاحب ان دانشوروں کے تبصرے، خطوط یا تاثرات کتاب میں یونہی نہیں چھاپ دیتے بلکہ ان مصنفین کا تعارف اتنی خوبصورتی اور ہنروری سے کراتے ہیں کہ تبصرہ نگار کی پوری شخصیت آئینہ ہو جاتی ہے جو ان کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ ''شناسائی'' کے پیش لفظ میں ملک مقبول احمد لکھتے ہیں:۔

''میری آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' چھپ کر آئی تو اسے اہلِ ادب نے بے حد پذیرائی عطا کی۔ ڈاکٹر صفدر محمود، اے حمید، علی سفیان آفاقی، شعیب بن عزیز، ڈاکٹر طارق عزیز، ابوالا امتیاز ع۔س۔ مسلم اور ڈاکٹر انور سدید جیسے نامور ادیبوں نے اس کتاب کے پیش الفاظ لکھے۔ لیکن پھر پاکستان اور ہندوستان کے اکثر مقامات سے خطوط اور تبصرے آنے لگتے تو مجھے احساس ہوا کہ محبت اور دیانت سے گزاری ہوئی زندگی کا اپنا ایک جادو ہے۔ اس زندگی کے تذکرے میں پڑھے جانے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ بعض لوگوں کی رہنمائی بھی کرسکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اُردو کے نامور مصنف، انشائیہ نگار اور دانشور پروفیسر جمیل آذر نے میری دیہاتی زندگی میں اپنے گاؤں کی زندگی کے نقوش دیکھے اور ایک کتاب ''راہِ نوردِ شوق'' کے نام سے لکھی جس میں میری کتاب پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اور اس عمل میں انہوں نے اپنے آپ کو بھی دریافت کیا اور اپنی خود نوشت بھی لکھ ڈالی۔ ڈاکٹر انور سدید اور جناب آصف بھلی کی رائے کے مطابق ایسی کتاب انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی'' آگے چل کر ملک صاحب رقمطراز ہیں ''سفر جاری ہے'' پر اخبارات اور اہل ادب دوستوں کے تبصروں پر مشتمل کتاب ''پذیرائی'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس میں ادیبوں کے سوانحی خاکے بھی موجود ہیں۔ کئی صاحب علم دوستوں کے مطابق اس کتاب میں ادب کے طالب

علموں کے لئے بہت سا مواد موجود ہے''۔ بعد ازاں ملک صاحب ''شناسائی'' کی اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''دلچسپ بات یہ ہے کہ متذکرہ دو کتابوں کے چھپنے کے بعد بھی ارباب ادب کے خطوط اور ''سفر جاری ہے'' پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی اخبارات اور رسائل میں تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا۔ ''راہ نوردِ شوق'' (مؤلفہ پروفیسر جمیل آذر) پر تبصروں کی کیفیت الگ ہے، لیکن ان کا تعلق بھی کسی نہ کسی صورت میں سابقہ دو کتابوں سے قائم ہوتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ سب شناسائی کے نام سے ایک الگ کتاب میں جمع کر دیئے جائیں''

''شناسائی'' میں چونتیس (34) صاحبانِ فکر ونظر کے تبصرے شامل ہیں۔ مایہ ناز ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بڑی محبت اور ژرف بینی کے ساتھ ''سفر جاری ہے'' پر نہایت عمدہ اور دلنشین تبصرہ کیا ہے:۔

''جناب ملک مقبول احمد صاحب کی نہایت دلچسپ کتاب بلکہ سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' جب کھولی تو بند کرنا مشکل ہو گیا۔ آپ نے دوستوں عزیزوں کے بارہ میں نہایت دیانت داری سے سیدھے سادے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔ بہت سے حضرات سے میری بھی شناسائی رہی ہے اور میں ملک صاحب کی گہری نظر اور مردم شناسی کی درخشاں مثال ہے۔ حالی نے شاید ملک صاحب کے لیے یہ پیارا شعر کہا تھا۔

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

آپ کی زندگی کا سفر مسلسل محنت اور جدوجہد کی درخشاں کہانی ہے آپ نے ایک طویل دلچسپ سفر کو قلم بند کر کے ایک دریا کو تاریخ کے ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔ آپ کا

پبلشنگ ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' ایک اہم قومی ادارہ بن گیا ہے جس کی زندہ مثال اس ادارہ کی گیارہ سو سے زیادہ مطبوعات ہیں۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب نے اپنا فن علم اور تجربہ اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شمع کو ہمیشہ ہمیشہ روشن رکھے اور پاکستانی عوام کے لئے مشعل راہ بنائے رکھے۔ آمین

ممتاز نابغہ روزگار افسانہ و ناول نگار بانو قدسیہ ''سفر جاری ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں ''میری ساری زندگی اپنے ذاتی اور ادبی دوستوں کے ساتھ اس بحث میں گزری کہ وہ اپنے بارے میں سچ ضرور بولیں لیکن دوسرے کے پوتڑے سرِ راہ دھونے سے اجتناب کریں۔ مقبول صاحب کو جن لوگوں کے نامناسب رویوں کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے اس کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن اُن لوگوں کے نام ظاہر نہ کر کے اعلیٰ درجے کی شرافت کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ اس شرافت کا تعلق اُن کی اپنی ذات سے بھی ہے اور اُن کی وراثت سے بھی''۔

''شناسائی'' میں جن نامور ادیبوں کے تبصرے شامل ہیں اُن میں مذکورہ بالا شخصیتوں کے علاوہ محمد آصف بھلی، جبار مرزا، شفیع ہمدم، انوار فیروز، صائمہ نورین بخاری، دردانہ نوشین خان، ایم آر شاہد، صابر آفاقی، شہزاد منیر احمد، رئیس احمد رئیس، معصوم شرقی، علامہ عبدالستار عاصم، حکیم محمد عزیز الرحمٰن جگرانوی، پروفیسر ڈاکٹر علامہ ایاز ظہیر ہاشمی، حافظ حسین احمد، میاں محمد سعید شاد، مقصود احمد چغتائی، سید سلمان گیلانی، رانا عامر رحمٰن محمود، ابوالعمار بلال مہدی، اشفاق احمد وڑائچ، عبدالقیوم، مناظر عاشق ہرگانوی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں روزنامہ ''پاکستان''، روزنامہ ''نوائے وقت''، اور ماہنامہ ''چہار سو'' میں شائع شدہ خصوصی تبصرے بھی ''شناسائی'' کی زینت بنے ہیں۔ ان تبصروں سے آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ''سفر جاری ہے'' کو غیر معمولی پذیرائی ملی جس کی مجھے اپنے عہد میں نظیر نہیں ملتی۔

ڈاکٹر انور سدید اپنی ''عرض سدید'' میں لکھتے ہیں۔ ''پذیرائی'' کے بعد اب ملک مقبول احمد اہل ادب کے سامنے نئی کتاب ''شناسائی'' کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں۔ تو میں اپنی اس حیرت کو چھپا نہیں سکتا کہ ان کی کتاب ''سفر جاری ہے'' کو جو بالکل سادہ سی آپ بیتی ہے اتنا قبول عام کیسے حاصل ہوا؟''

آگے چل کر وہ اس سوال کا جواب بھی خود ہی دیتے ہیں:۔

''اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ ''سفر جاری ہے''، ''پذیرائی'' اور ''راہ نوردِ شوق'' کی اس بے پایاں مقبولیت کا راز کیا ہے؟ میرے خیال میں بنیادی وجہ تو ملک مقبول احمد کے برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیبوں سے روابط ہیں جو کتاب کی طباعت واشاعت اور پھر تقسیم تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ ذاتی دوستی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے قبل کسی ناشر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری شائع نہیں کی۔ ملک مقبول احمد نے اپنی نوعیت کی ایک الگ کتاب پیش کی تو اس نے ہر پڑھنے والے کو متاثر کیا۔ اب مجھے یہاں بھارت کے ممتاز مصنف نراد چودھری یاد آ رہا ہے۔ جس نے اپنی خودنوشت کا نام ''ایک عام آدمی کی سرگزشت'' رکھا اور یہ عنوان اتنا انوکھا تھا کہ اس عام آدمی کے حالات حیات پڑھنے کے لئے ہر شخص بے تاب ہو گیا۔ ملک مقبول احمد کی آپ بیتی نے بھی ایک ناشر کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب کے پیش الفاظ جب ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ع۔س۔ مسلم، سید واجد رضوی، قمر نقوی اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک نے لکھے تو کتاب پڑھنے والے ہر ادیب نے سوچا کہ میں اس برادری کے ارکان سے کیوں پیچھے رہوں۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنے مطالعے کے ثمرات ملک مقبول احمد صاحب تک پہنچانے کی کاوش کی۔ میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ تخلیق، تخلیق کرتی ہے یا کتاب، کتاب لکھتی ہے۔

''سفر جاری ہے'' کے نتیجہ میں ملک مقبول احمد نہ صرف ناشر سے ہر دلعزیز ادیب کی حیثیت سے نمودار ہوئے بلکہ اُن کے باطن سے ایک خوبصورت مؤلف بھی جلوہ گر ہوا۔ انہوں نے بقول ڈاکٹر انور سدید اپنے گمشدہ رسالے ''چودھویں صدی'' سے تین کتابیں ''گلشن ادب''، ''ارمغان غزل، اور ''گمشدہ افسانے'' برآمد کیں۔ ترکی سے وطن واپس آئے تو ''سیاحت نامہ ترکی'' میں اپنے مشاہدات جمع کیے۔ کچھ دوستوں کی فرمائش پر ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' کو اپنے روابط کی روشنی میں خاکہ نگاری کا موضوع بنایا، فلاح و بہبود عامہ کے لئے اسلامی کتابوں کی بلا قیمت تقسیم کا سلسلہ شروع۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ادیبوں کی صف میں اس وقت شامل ہوئے جب انہیں فرصت میسر آ گئی تھی اور اشاعتی کاروبار اُن کے ہنر مند بچوں نے سنبھال لیا تھا۔''

میں جب 2007ء میں ''راہ نوردِ شوق'' سپرد قلم کر رہا تھا تو میں نے اس میں ایک چیپٹر میں نے کہا تھا ''دو ہزار سات عیسوی کو دو فقید المثال شخصیات منصۂ شہود پر آئیں۔ ان میں ایک نشر و اشاعت کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ملک مقبول احمد کی دلکش شخصیت ہے اور دوسری عدالتِ عظمیٰ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی سحر انگیز شخصیت ہے۔ ملک مقبول احمد نے اپنی سچی اور دلچسپ خود نوشت سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' لکھ کر دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا اور جسٹس افتخار محمد چودھری نے ایک آمر مطلق کے سامنے سچ اور جرأت کا مظاہرہ کر کے وکلا برادری میں بالعموم نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔''

بس میری دانست میں ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کی کامیابی کا راز سچائی اور دلچسپی میں مضمر ہے۔ طباعت و اشاعت کتب اور ادب میں گرانقدر خدمات بجا لانے پر ملک مقبول احمد کو عظیم آرا فاؤنڈیشن کی جانب سے لائف اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ''شناسائی'' میں ''پذیرائی'' اور ''راہ نوردِ شوق'' پر دیئے گئے تبصروں اور تجزیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یوں ''شناسائی'' کے تین ابواب ہیں، پہلے حصے میں ''سفر جاری ہے'' پر

تبصرے ہیں تو دوسرے اور تیسرے حصے میں ’’پذیرائی‘‘ اور ’’راہِ نوردِ شوق‘‘ پر ہیں۔
’’پذیرائی‘‘ کے حوالے سے جن ادباء کے تبصرے شامل ہیں اُن میں اظہر جاوید، اعتبار ساجد، پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد، ڈاکٹر امجد پرویز، ڈاکٹر انور سدید، علامہ عبدالستار عاصم اور بدر منیر کے علاوہ روزنامہ خبریں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جن اصحاب نے ’’راہ نوردِ شوق‘‘ پر تبصرے سپرد قلم کئے ہیں۔ اُن میں اعتبار ساجد، ڈاکٹر امجد پرویز، ڈاکٹر انور سدید، شفیع ہمدم، صائمہ نورین بخاری اور رسائل اور روزناموں میں ’’قومی ڈائجسٹ‘‘ اور روزنامہ ’’نوائے وقت‘‘ شامل ہیں۔

’’شناسائی‘‘ معنوی اور صوری اعتبار سے ملک مقبول احمد کی یادگار کتابوں میں شمار کی جائے گی۔ یقیناً یہ کتاب طالم علموں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی!

............o............

سعید بدر

مقبول احمد کی شناسائی سے شناسائی تک

ملک مقبول احمد اب سکہ بند پبلشر سے ممتاز مصنف اور مؤلف کا بلند مقام حاصل کر چکے ہیں، حال ہی میں ''شناسائی'' کے عنوان سے اُن کی 14 ویں تصنیف منصۂ شہود پر آئی ہے۔ جن میں ملک صاحب کی ذات اور اُن کی تصنیف ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں اہل علم وادب اور ممتاز قلمکاروں کی آراء سامنے آئیں یا اخبارات وجرائد میں اُن کے بارے میں تبصرے اور جائزے چھپے۔ کتاب میں شامل نئی آراء کی تعداد تیس کے قریب تبصرے صرف تین یا چار ہیں۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ہم نے جن کو آراء میں شمار کیا ہے ان میں سے کئی واقعتاً تبصروں اور جائزوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں نامور سائنسدان اور وطن عزیز پاکستان کو ایٹمی قوت سے ہمکنار کرنے والے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سب سے اہم ہیں اور ان کا نام نامی اور اسم گرامی سب سے اوّل درجے پر ہے۔ اس کے بعد بانو قدسیہ، محمد آصف بھلی، جبار مرزا، ملک محمد محبوب الرسول قادری، عبدالستار عاصم، پروفیسر شبیر حسین زاہد، شفیع ہمدم، انوار فیروز، صائمہ نورین بخاری، شاہد بخاری، گوہر ملسیانی، پروین طارق، دردانہ نوشین، ایم آر شاہد، صابر آفاقی، شہزاد منیر احمد، رئیس الدین رئیس، حکیم عزیز الرحمٰن جگرانوی، ڈاکٹر علامہ سید ایاز ظہیر ہاشمی، حافظ حسین احمد، میاں محمد سعید شاد، مقصود احمد چغتائی، سید سلمان گیلانی، رانا عامر رحمٰن محمود، ابوالعمار بلال مہدی، اشفاق وڑائچ، عبدالقیوم اور مناظر عاشق ہرگانوی شامل ہیں۔

ملک مقبول احمد نے اپنی کتاب ''شناسائی'' کو ممتاز ادیب طارق عزیز، ناصر نقوی

اور ناچیز راقم سعید بدر کے نام معنون کیا ہے۔ ابتدائیہ ممتاز نقاد اور محقق، نامور ادیب اور بلند پایہ شاعر ڈاکٹر انور سدید نے ''عرض سدید'' کے نام سے لکھا ہے جو اپنے نام کے معنی کے اعتبار سے نہ سدید ہے اور نہ شدید۔ بلکہ وہ اپنے دامن میں تعریف و توصیف کے خوشنما پھولوں کا گل دستہ لئے ہوئے ہے۔ انہوں نے یہ دلچسپ سوال اُٹھایا ہے کہ ''سفر جاری ہے''، ''پذیرائی'' اور ''راہ نوردِ شوق'' کی اس بے پایاں مقبولیت کا راز کیا ہے؟ جس کا جواب وہ خود ہی پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں بنیادی وجہ تو ملک مقبول کے برصغیر پاکستان دھند کے نامور ادیبوں سے روابط ہیں جو کتاب کی طباعت و اشاعت اور پھر تقسیم تک محدود نہیں رہتے بلکہ ذاتی دوستی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے قبل کسی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری شائع نہیں کی۔ ملک مقبول احمد نے اپنی نوعیت کی واحد کتاب پیش کی تو اس نے ہر پڑھنے والے کو متاثر کیا...... ملک مقبول احمد کی آپ بیتی نے بھی ایک ناشر کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب کے پیش الفاظ حب ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر طارق عزیز، اے حمید، شعیب بن عزیز، طارق اسماعیل ساگر، ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم، سید واجد رضوی، قمر نقوی، اے حمید، شعیب بن عزیز اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک نے لکھے تو کتاب پڑھنے والے ہر ادیب نے سوچا کہ اس برادری کے ارکان سے کیوں پیچھے رہوں۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنے مطالعے کے ثمرات ملک مقبول احمد تک پہنچانے کی کوشش کی۔ آخری بات یہ کہ ملک مقبول احمد کو ان کے کسی دوست نے مشورہ دیا کہ جن دوستوں نے ان کی کتاب پر تبصرے کیے ہیں، ان کے ''تعارف نامے'' بھی کتاب میں شامل کرلیں۔ چنانچہ

ملک صاحب نے ہر قلمکار کے تعارف ان کے اوصاف کی روشنی میں کرایا تو سب
اتنے پسند کیے گئے کہ متعدد لوگوں کو اپنے بارے میں ملک صاحب کی رائے
جاننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا، نتیجہ یہ ہے کہ ملک صاحب کے باطن سے ایک
مؤلف اور مصنف برآمد ہو گیا اور کتاب سے کتاب بنتی چلی گئی۔''

ملک مقبول احمد نے اپنے پیش لفظ میں زیرِ نظر کتاب ''شناسائی'' کی اشاعت کی غرض وغایت یوں بیان کی ہے۔

''دلچسپ بات یہ ہے کہ ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' چھپنے کے بعد
ارباب ادب کے خطوط اور ''سفر جاری ہے'' پر تبصروں کا سلسلہ جاری ہے اور اس
کے ساتھ اخبارات ورسائل میں تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا......
میں نے مناسب سمجھا کہ قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ سب ''شناسائی'' کے نام
سے الگ کتاب میں جمع کر دیئے جائیں۔''

زیرِ نظر کتاب ''شناسائی'' میں بھی ملک صاحب نے ہر جائزہ نگار یا تبصرہ نگار کے بارے میں کم وبیش ایک صفحہ پر ''تعارف نامہ'' پیش کیا ہے۔ ملک صاحب کا کمال یہ ہے کہ ادیب کتنا ہی بڑا ہو یا اہم اور نامور ہو اُن کا تعارف نامہ ایک صفحہ سے کم ہو گا نہ زیادہ۔ ہر ادیب ودانشور کو اس لحاظ سے برابر رکھنے کا ''سانچہ''، ''تیشہ'' انہوں نے نہایت عمدگی سے گھڑ رکھا ہے۔ اور ''تیشۂ فرہاد'' کی طرح اسے ''تیشۂ مقبول'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے اس ''تیشۂ مقبول'' کے ذریعے تراشے ہوئے تمام ''تعارف نامے'' ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، خواہ وہ اپنے نام ومقام کے اعتبار سے ''محمود وایاز'' کا درجہ کیوں نہ رکھتے ہوں۔

ہر ادیب کے جاندار اور شاندار، الفاظ میں پیش کردہ ''تعارف نامے'' کے بعد، متعلقہ ادیب یا دانشور کا تبصرہ نظر نواز ہوتا ہے۔ جس سے ملک صاحب کے ذاتی کردار و

اوصاف کے علاوہ ان کے ''کارناموں'' پر اس قدر روشنی پڑتی ہے کہ نظر خیرہ ہو جاتی ہے۔ جناب ڈاکٹر انور سدید کے بقول جب کوئی نیا ادیب یا قلمکار مقبول احمد کا یہ شاہکار دیکھتا ہے تو وہ بھی اس 'صف مقبول'' میں شامل ہونے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ اس دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ علم وادب کے نامور ادب پارے معرضِ وجود میں آرہے ہیں۔ جنہیں ''شہ پارے'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان ادب پاروں اور شہ پاروں کے لکھنے کا سفر بھی انشاءاللہ طویل عرصہ تک جاری وساری رہے گا اور بقول علامہ اقبالؒ۔

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

دلچسپ امر یہ ہے کہ تبصرہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں ملک صاحب کی تصنیفات وتالیفات کی دل کھول کر تعریف وتحسین کی ہے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک صاحب کے اعمال وکردار کے مختلف گوشے سامنے آئے ہیں۔ صائمہ نورین بخاری نے ادبی انداز میں ملک صاحب پر تحسین کے پھول برسائے ہیں۔ انہوں نے ملک صاحب کی زندگی کے سفر کو ''خوشبو کا سفر'' کا خوب صورت نام دیا ہے۔ ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں:

''دکھوں، غموں، خوشیوں کے بادلوں میں اگر سچائی اور سادگی کی روشنی پھوٹی پڑ رہی ہو تو ''سفر جاری ہے'' کی نوید سناتی ہوئی ''پذیرائی'' کا گنبد بن جاتی ہے۔''

بھٹکے اس اندھی بھیڑ میں تنہائی تمام عمر
لوٹے جب اپنی ذات میں ہم قافلہ ہوئے

صائمہ نورین بخاری نے اپنے دلنواز تبصرہ میں اُردو سوانح عمری کو تعریف کا ایک شعبہ یا شاخ قرار دیا جائے اور اس کی دلچسپ مگر تاریخ بیان کردی ہے۔

انہوں نے بتایا ہے کہ:

''مولانا سید سلیمان ندوی کے مطابق سوانح عمریوں کی تعداد 753 ہے جبکہ نصیرالدین ہاشمی نے اُردو زبان کی قدیم سوانح عمریوں کی تعداد 1200 بیان کی ہے''۔

انڈیا (بھارت) کے ڈاکٹر معصوم شرقی نے ''سفر جاری ہے'' پر تبصرہ لکھتے ہوئے حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ:

برسبیل گفتگو عرض کرتا چلوں کہ مقبول صاحب نے اپنے بڑے بیٹے ڈاکٹر ظفر مقبول کو جسمانی اور ذہنی صحت کے تحفظ کی موعظت کرتے وقت غالب کا مقبولِ عام شعر:

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ شعر غالب سے منسوب چلا آرہا ہے مگر حقیقت یہ کہ شعر قربان علی سالک کا ہے۔ جو غالب ہی کے عزیز شاگرد تھے۔ شعر یوں ہے:

تنگدستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

لیکن بہتر ہوتا تو وہ یہاں اس کا مستند حوالہ بھی پیش کر دیتے جس سے بہت سوں کا بھلا ہوتا۔

حکیم محمد عزیز الرحمٰن جگرانوی نے اپنے خوبصورت انداز میں ملک مقبول صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد کسی شاعر کا عمدہ شعر درج کیا ہے۔ جو ملک صاحب کے بارے میں ہے:

مسکراہٹ دل نشیں اور شخصیت معقول ہے
نام بھی مقبول، اس کا کام بھی معقول ہے

''شناسائی'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں وہ مضامین اور تبصرے

شامل ہیں جو ''سفر جاری ہے'' سے متعلق ہیں۔ جبکہ دوسرے حصہ میں ان کی کتاب ''پذیرائی'' کے بارے میں 8 تبصرے موجود ہیں۔ اسی طرح تیسرے حصے میں ''راہنوردِشوق'' دراصل ملک مقبول احمد صاحب کی اپنی تصنیف نہیں۔ یہ پروفیسر جمیل آذر کے رشحات فکر کا نتیجہ ہے لیکن انہوں نے یہ کتاب ملک صاحب کی تصنیف ''سفر جاری ہے'' سے متاثر ہو کر لکھی جو بیک وقت ملک صاحب کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب انشائی طرز نگارش کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اس میں مصنف اور پبلشر دونوں یک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔ اس حصہ میں ڈاکٹر امجد پرویز کی تحریر بزبان انگریزی شامل کتاب ہے۔ جو ''راہنوردِشوق'' ہی کے متعلق ہے۔ کتاب کے آخر سے ذرا پہلے خوبصورت اور عمدہ تصاویر دی گئی ہیں جن میں ملک صاحب ملک کی بعض نامور شخصیات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان شخصیات میں خواجہ محمد زکریا، بشریٰ اعجاز، نادیہ بخاری، عمرانہ مشتاق، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر کیول دھیر، حمید اختر، ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری بخاری، پروفیسر سید حسن عسکری، علامہ عبدالستار عاصم، مقصود احمد چغتائی، اکرام اللہ عادل، میاں محمد سعید شاد، عبدالمجید منہاس، سعید بدر، حافظ حسین احمد شامل ہیں۔

آخر کتاب میں مختلف ادیبوں، شاعروں، تبصرہ نگاروں اور قلمکاروں کے ''تبصرہ نما مختصر جملے'' پیش کیے گئے جو زیادہ تر ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں ہیں۔ ان تبصروں پر ایک نظر سے ملک صاحب کی شخصیت اور ان کے کارنامے کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

بہرحال مجھے یہ کہنے میں باق نہیں کہ ملک صاحب کی زیر نظر کتاب ''شناسائی''، علم و ادب میں گراں قدر اور مفید اضافہ ہے البتہ ملک صاحب کے سخت احتیاط کے باوجود کتاب میں کہیں کہیں اغلاط رہ گئی ہیں۔ اُمید واثق ہے کہ علم و حکمت کے ذوق و شوق رکھنے والے حضرات اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

☆☆☆

علی شاہ

''شناسائی''

لاہور میں مقیم ممتاز ادیب، ناشر اور دانشور ملک مقبول احمد جہاں اپنے تخلیقی سفر کے ذریعے گزشتہ سالہا سال سے ادب کی خدمت میں مصروف ہیں وہاں بطور پبلشر مقبول اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے بھی علم و ادب کے فروغ و ترویج کے حوالے سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بابائے قوم نے فرمایا تھا کہ'' کام، کام اور صرف کام'' ملک مقبول احمد شہرت کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور شبانہ روز ادب کی خدمت کے لیے کوشاں ہیں۔ ملک مقبول احمد نے اپنے ادارے سے نہ صرف بے حد معیاری کتابیں شائع کیں بلکہ ان گنت باصلاحیت اور حقیقی تخلیق کاروں کو متعارف کرایا۔ سو انہوں نے پبلشنگ کے شعبہ کو ایک وقار عطا کیا۔ اتنا کام کرنے کے باوجود ملک مقبول احمد نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ آلودہ ہرگز نہ ہونے دیا بلکہ اپنی توانا تخلیقات کے ذریعے اپنی ذات کے کرب کا اظہار بھی گاہے بگاہے کرتے رہتے ہیں اور تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے قارئین کی خدمت میں کوئی نہ کوئی منفرد تصنیف پیش کرتے رہتے ہیں۔

محترم دوست بلال مہدی کے ذریعے ملک مقبول احمد کی کتاب ''شناسائی'' بطور تحفہ ملی۔ کتاب کے سرورق اور نام سے کتاب پر کسی رومانوی ناول کا گماں ہوا لیکن کتاب کا مطالعہ کیا تو یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ثابت ہوئی ''شناسائی'' تین حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ ملک مقبول احمد کے فن و شخصیت پر کیے گئے معروف اہل قلم کے تبصروں اور پر مغز آراء

پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں ملک مقبول احمد کے سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' پر مشتمل ادب کے صفِ اول کے شاہسواروں کے خطوط، اخباری مضامین اور مختصر تبصرے شامل ہیں۔ انہی مبصرین میں محسن پاکستان اور پاکستان کے شہرہ آفاق سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ''سفر جاری ہے'' پر خوبصورت تبصرے کا عکس بھی شائع ہوا ہے۔ ''سفر جاری ہے'' پر دیگر جن اہل قلم کے تبصرے شناسائی میں شامل ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید، بانو قدسیہ، محمد آصف بھلی، جبار مرزا، ملک محمد محبوب الرسول قادری، علامہ عبدالستار عاصم، پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد، شفیع ہمدم، انوار فیروز صائمہ نورین بخاری عنبرین تبسم شاکر، شاہد بخاری، گوہر ملیسانی، پروین طارق، دردانہ نوشین خان، ایم آر شاہد، ڈاکٹر صابر آفاقی، شہزاد منیر احمد، رئیس الدین رئیس، ڈاکٹر معصوم شرقی، حکیم محمد عزیز جگرانوی، چیئرمین حمایت اسلام طبیہ کالج، لاہور، ڈاکٹر علامہ سید ایاز ظہیر ہاشمی چیئرمین قومی امن کمیٹی برائے بین المذاہب ہم آہنگی پاکستان، حافظ حسین احمد جمعیت علمائے اسلام، میاں محمد سعید شاد، مقصود احمد چغتائی، سید سلیمان گیلانی صدارتی ایوارڈ یافتہ، رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ، ابولعمار بلال مہدی، اشفاق احمد وڑائچ، عبدالقیوم علاوہ ازیں جن اخبارات، رسائل و جرائد میں ''شناسائی'' پر ادبی کالموں میں تبصرے شائع ہوئے ہیں ان میں ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ بھارت روزنامہ ''پاکستان'' ''نوائے وقت'' ماہنامہ ''چہار سو'' راولپنڈی شامل ہیں۔

کتاب کا دوسرا باب ملک مقبول احمد کی ایک اور ادبی کاوش ''پذیرائی'' کی پذیرائی پر مشتمل ہے۔ پذیرائی ملک مقبول احمد کی سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' پر معروف دانشوروں کی آراء، تبصروں اور مکتوبات پر مشتمل ایک اور دلکش ایڈیشن ہے۔

''شناسائی'' کا تیسرا اور آخری حصہ ''راہ نورد شوق کے نام سے ہے۔ راہ نورد شوق بھی اپنی نوعیت کا منفرد کاوش ہے جو پروفیسر جمیل آذر نے ملک مقبول احمد کی سوانح حیات پڑھ کر اور اس سے متاثر ہو کر ترتیب دی۔ شناسائی کے تیسرے باب ''راہ نورد شوق'' میں نامور

دانشوروں کی طرف سے لکھے گئے بھرپور تبصرے شامل ہیں۔

قارئین کرام! شناسائی پر صرف پاکستانی اہل قلم نے رائے نہیں دی بلکہ دنیا بھر کے دانشوروں نے اپنی قیمتی آراء سے اس کتاب کو مزید جاندار بنا دیا ہے۔ کتاب میں ملک مقبول احمد کی مختلف اہم شخصیات کے ساتھ اور مختلف تقاریب کی یادگار اور نادر تصاویر بھی شامل ہیں۔ کسی بھی دانشور کا کسی ادیب کے فن و شخصیت پر یا کسی خوبصورت تصنیف پر مکتوب، اخبار یا کسی رسالہ و جریدہ میں تبصرہ اس اخبار یا رسالہ تک محدود رہ جاتا ہے، جب کہ ''شناسائی'' میں ملک مقبول احمد کی تصنیف پر دانشوروں کی آراء کو یکجا کر کے ایک خوبصورت کتاب کا روپ دے دیا گیا ہے اور ان آراء کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ کتاب جہاں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ادبی کاوش ہے وہاں تنقیدی ادب میں ایک خوبصورت اور گرانقدر اضافہ بھی ہے۔ اس تصنیف نے جہاں ملک مقبول احمد کو ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کر دیا ہے وہاں یہ کتاب ادب کے طالب علموں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ بھی ہے۔

قارئین کرام! میں نے اگرچہ تاحال ملک مقبول احمد کی سوانح حیات نہیں پڑھی ہے لیکن ''شناسائی'' کے مطالعہ سے جہاں مجھے ملک مقبول احمد کے فن و شخصیت سے بھرپور شناسائی ہوئی ہے وہاں ''سفر جاری ہے'' پڑھنے کے لیے بے تابیوں اور تجسس میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ میں آخر میں اپنے محترم دوست، ادیب، محقق، دانشور ابوالعمار بلال مہدی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے ''شناسائی'' کی صورت میں ایک خوبصورت تصنیف کا تحفہ مجھے عطا کیا جسے پڑھ کر ملک مقبول احمد جیسی قدآور علم و ادب دوست شخصیت سے مجھے آشنائی کا موقع ملا۔

☆☆☆

اظہر جاوید

''شناسائی''

بعض لکھنے والے شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں، مگر وہ چھل بل دکھاتی، دُور بھاگتی رہتی ہے۔ کچھ خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں، شہرت خود ان کا تعاقب کرتی ہے اور اُن کے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اپنے حصار میں لے کر ممتاز اور نام ور کر دیتی ہے......
ملک مقبول احمد بھی ایسے خوش نصیب اہل قلم ہیں۔ انہوں نے معصومیت میں اور سادگی سے اپنی آپ بیتی لکھی...... ''سفر جاری ہے''......انہیں خود بھی آسان گمان نہیں ہوگا کہ یہ کتاب ''بیسٹ سیلرز'' میں شمار ہو جائے گی، اور دوست تو دوست، ان جانے نقاد بھی چونک کر اس کی تعریف و تحسین کرنے لگیں گے۔

''سفر جاری ہے''......آپ بیتی کی صنف میں اضافے کا سبب بنی یا نہیں، مگر اپنی انفرادیت اور مکمل سچائی کی وجہ سے اس نے ادب میں خاص مقام پا لیا۔ اب کیا تھا......تبصروں اور آرا کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ ایک نہ دو...... دس نہ بیس...... ان گنت تبصرہ...... بے شمار توصیف...... حیرت ہے ملک مقبول کا مزاج اینٹھا نہیں، اُن میں ہم چوں ما دیگرے نیست، کا زعم پیدا نہیں ہوا، انہوں نے وہی مدھم انداز رکھا، ویسا ہی وضع داری کا رویہ اپنائے رکھا...... دوستوں اور تنقید نگاروں کی تحریروں کو خوش دلی اور خوش

اسلوبی سے ''پذیرائی'' کا عنوان دے کر ایک کتاب شائع کروائی...... معاملہ یہاں نہیں تھا...... احباب کی محبت تمتماتی رہی اور ملک مقبول کی مروت انہیں اکساتی رہی...... انہوں نے ''شناسائی'' کے عنوان سے یہ کتاب شائع کر کے سب محبت کرنے والوں کو اپنی محبت کی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

سب سے بڑا کمال یہ ہوا، مستند انشائیہ نگار اور جید نقاد پروفیسر جمیل آذر نے ''سفر جاری ہے'' پر انشائی تنقید کے موضوع کو سنوارتے ہوئے ایک پوری کتاب ''راہ نوردِ شوق'' لکھ دی ہے جس نے نہ صرف تنقید بلکہ انشائی تنقید میں بھی نئے اُفق روشن کئے ہیں۔ ''شناسائی'' بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھی جائے گی، اس میں بھی مؤلف کے نام کے خطوط ہیں، تبصرے اور آراء ہیں...... خیال کیا یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب پر تبصروں کے بعد ایک اور کتاب بھی آسکتی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔

''ماہنامہ تخلیق'' لاہور

فروری 2012ء

............☆☆............

سفرآرزو
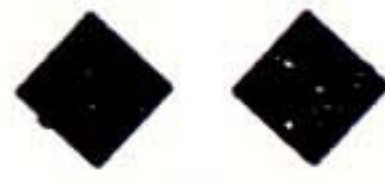
◆◆

فہرست

...........o...........

پروفیسر جمیل آذر

بی۔874 سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

عرضِ جمیل

''سفرِ آرزو'' ملک مقبول احمد کا ایسا سفر نامہ حج ہے جو انہوں نے روحانی، تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی طور پر طے کیا ہے۔ میری نظر سے کئی حج کے سفر نامے گزرے ہیں جن میں عام قاری کے لیے وہ مواد نہیں ملتا جس سے روشناس ہو کر اس کے اندر حج کے بارے میں تاریخی اور روحانی شعور پیدا ہو۔ ایسے سفر ناموں میں مصنف زیادہ تر اپنی شخصیت کو اُبھارنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ حج نام ہے نفی ذات کا اور تسلیم عظمت پروردگار کا۔ ان سفر ناموں سے ہمیں مناسک حج کے تاریخی پس منظر کا بھی پورا ادراک نہیں ہوتا اور عام قاری کو وہ معلومات بھی دستیاب نہیں ہوتیں جنہیں حاصل کرنے کے بعد حج کرنے کی آرزو دل میں پیدا ہوتی ہے۔

ملک مقبول احمد نے پہلا حج 1986ء میں دوسرا حج 2002ء اور تیسرا حج 2006ء میں ادا کیا۔ اس دوران اور بعد میں بھی انہیں متعدد بار عمرہ ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی گزشتہ سے پیوستہ سال 2010ء میں بھی انہوں نے عمرہ ادا کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ نہایت خاموشی سے اس ''روحانی سفر'' پر روانہ ہو جاتے ہیں کہ قریبی دوستوں کو بھی پتا نہیں چلتا۔ وہ اسے ایک عبادت کے طور پر لیتے ہیں اور چرچا کرنا مناسب نہیں سمجھتے مگر عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ وہ گزشتہ پچیس سال سے اس

دشت عشق الٰہی کے مسافر ہیں۔اس تمام عرصے میں وہ حج وعمرہ کے بارے میں متعدد کتب پڑھنے۔ ذکرالٰہی میں وقت گزارنے،قرآن پاک کا ترجمہ کے ساتھ تلاوت کرنے اور دینی کتب کی تالیف کرنے اور انہیں چھپوا کر دین سے محبت کرنے والے لوگوں میں بلا معاوضہ تقسیم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ان کی زیر نظر کتاب ''سفر آرزو'' ان کی پچیس سالہ ریاضت کا ثمر آور نتیجہ ہے اس کتاب میں انہوں نے فلیش بیک کی ٹیکنیک استعمال کی ہے،جس سے ہمیں مناسک حج ادا کرتے وقت ان کا پورا تاریخی پس منظر سامنے آجاتا ہے اسی طرح جب حاجی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جاتا ہے اور وہاں کے تاریخی مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا ہے تو اس کے لیے بھی اس کتاب میں اس مقام کی تاریخی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔حج اور عمرہ کے تمام مناسک کو ملک مقبول احمد نے بالترتیب پیش کر کے ایک عام (زائر) حاجی کی معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔پاکستان سے جانے والے عازمین حج عموماً حج تمتع کرتے ہیں لٰہذا انہوں نے صرف حج تمتع کا ہی تذکرہ کیا ہے اور حج قرآن اور حج افراد کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔حج قرآن میں ایک ہی مرتبہ احرام باندھا جاتا ہے اور اسی احرام میں پہلے عمرہ ادا کیا جاتا ہے پھر حج ادا کرنے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے۔حج افراد وہ حضرات ادا کرتے ہیں جو حدود حرم اور حدود میقات کے اندر مستقل رہائش پذیر ہوتے ہیں۔اس طریقہ حج میں عمرہ ادا نہیں جاتا اور قربانی دینا بھی ان پر واجب نہیں ہے۔چونکہ پاکستانی حضرات حج تمتع کرتے ہیں لٰہذا انہوں نے اسی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔حج تمتع میں بڑی آسانی ہے اس میں پہلے عمرہ ادا کیا جاتا ہے اور پھر حج کیا جاتا ہے۔گویا اس میں دو مرتبہ احرام باندھا جاتا ہے پہلے احرام باندھ کر اور عمرہ کی نیت کر کے اور عمرہ کے پورے ارکان ادا کرنے کے بعد 8 ذوالحجہ کو دوسری مرتبہ احرام باندھ کر حج کیا جاتا ہے اور قربانی کر کے بال کٹوا کر احرام کھول دیا جاتا ہے۔ملک مقبول احمد نے بالتفصیل حج تمتع کو ترتیب وار نہ صرف بیان اور ادا کیا بلکہ تمام مناسک کا نہایت سادہ اور سلیس زبان میں اس خوبصورتی سے ذکر کیا۔

ہے کہ گویا ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ عمرہ اور حج ادا کر رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ملک مقبول احمد نے فلیش بیک کی ٹیکنیک اختیار کی ہے جس میں آزاد تلازمہ خیالات اور ماضی کے واقعات کی صدائے بازگشت کا عمل ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے زائر بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کرتا ہے اسی کی مناسبت سے ملک صاحب بیت اللہ کا تاریخی پس منظر بیان کر کے ہمارے روحانی تخیل کو مہمیز کرتے ہیں۔ عمرہ کی ادائیگی کے وقت پہلے بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے پھر آب زم زم پیٹ بھر کر پیا جاتا ہے اس عمل کی مناسبت سے انہوں نے چاہ زم زم کی مختصر تاریخ بیان کر دی جو حاجی کے علم میں اضافہ کرتی ہے۔ جب وہ مدینہ منورہ جاتے ہیں اور مسجد نبوی ﷺ میں روضہ رسول ﷺ کی زیارت کرتے ہیں تو مسجد نبوی ﷺ کا پس منظر بیان کر کے ہمیں روحانی اور فکری روشنی عطا کرتے ہیں۔ جب وہ مسجد قبا کی زیارت کرتے ہیں اور وہاں نوافل ادا کرتے ہیں تو ہمیں مسجد قبا کی تاریخی اہمیت سے روشناس کراتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہمیں جنت البقیع، مدینہ منورہ کی کھجوروں کی مارکیٹ، وہاں کی گلیوں اور محلوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

ملک مقبول احمد جب حضرت امیر حمزہؓ کے مقبرے کی زیارت کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی انہوں نے غزوۂ اُحد میں امیر حمزہؓ کی شہادت کو یاد کیا اور جنگ احد کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کر کے ہماری معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ اسی غزوہ میں امیر حمزہؓ نے اپنی جوانمردی اور شمشیر زنی کے جوہر دکھائے اور شہید ہوئے اور ان کی لاش کا مشرکین نے مثلہ کیا یعنی ان کے کان، ناک اور دیگر اعضاء کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ان کا کلیجہ نکال کر ہندہ نے چبا کر پھینک دیا۔ اسی غزوہ میں آنحضرت ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور آپ ﷺ کے رخسار مبارک میں خود کی زنجیر کی ایک کڑی کے دو ٹکڑے دھنس گئے جنہیں ابو عبیدہؓ نے اپنے دانتوں سے باہر نکالا۔ یہ ایسے دلخراش مناظر ہیں جن کے تصور ہی سے ہماری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ جب رسول

اکرم ﷺ نے حضرت امیر حمزہؓ کی بریدہ لاش کو دیکھا تو آپ ﷺ آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے جب ''سفر آرزو'' میں مندرجہ ذیل سطور پڑھیں تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے ''حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کو اتنا روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا جتنا آپ ﷺ حضرت حمزہؓ کی بریدہ لاش دیکھ کر روئے۔ پھر آپ ﷺ جنازے کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس قدر زار و قطار روئے کہ آپ ﷺ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس وقت آپ ﷺ لاش کو مخاطب کر کے کہتے جاتے تھے،'' اے رسول اللہ ﷺ کے چچا! اے اللہ کے شیر! اے رسول اللہ کے شیر! اے حمزہؓ اے نیکیوں کے کرنے والے! اے حمزہؓ! اے برائیوں کو کھونے والے! اے رسول اللہ ﷺ کے محافظ!

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہ جبریل نے آکر مجھے بتایا کہ ساتوں آسمانوں کے رہنے والوں میں امیر حمزہؓ کا نام جو لکھا ہوا ہے وہ یہ ہے! ''حمزہؓ ابن عبدالمطلب اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا شیر۔''

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ پچاس تیر انداز جنہیں ایک ٹیلے پر حضور ﷺ نے متعین کیا تھا اور انہیں سخت تاکید کی تھی کہ فتح ہو یا شکست تم نے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا! اگر وہ اپنی جگہ کو نہ چھوڑتے تو وہ فتح جو مسلمانوں کو نصیب ہو رہی تھی ناکامی سے دوچار نہ ہوتی۔

حضرت امیر حمزہؓ کی شہادت کے حوالے سے ملک صاحب نے ایک اہم واقعہ درج کیا ہے ''جنگ کے اختتام پر جب آپ ﷺ مدینے کی گلیوں کے گزر رہے تھے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ چند عورتیں بین کر رہی ہیں۔ آپ ﷺ کے منہ سے بے اختیار یہ نکلا کہ ''افسوس حمزہؓ کا رونے والا آج کوئی نہیں ہے'' جب یہ الفاظ انصار مدینہ نے سنے تو انہوں نے اپنی عورتوں سے کہا کہ تم حضور ﷺ اور وہاں حضرت امیر حمزہؓ کے لیے بین کروتا کہ حضور ﷺ کو دلاسا ملے۔ ان عورتوں نے جب حضور ﷺ کے گھر جا کر بین کیا۔ ان

کی آہ وزاری کو دیکھا تو آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور آپ ﷺ کے دل کو قرار آ گیا"۔ یہ منظر بھی بڑا دلفگار ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تا حال کسی سفرنامہ حج میں ایسے دلگداز واقعات نہیں پڑھے جو نہایت ہی اہم اور ایمان افروز ہیں۔ ہمیں اس بات سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ متوفی کے گھر والوں کے ہاں جا کر ان سے تعزیت کرنی چاہیے تا کہ ان کے دل کو قرار آئے۔ ملک صاحب نے حضرت امیر حمزہؓ کی شہادت کے حوالے سے ہمیں اہم معلومات سے روشناس کرایا ہے۔

اسی طرح جب ملک مقبول احمد، غزوۂ خندق کے مقام پر تاریخی مساجد، جن میں مسجد علیؓ، مسجد حضرت ابوبکرؓ، مسجد سلمان فارسیؓ مسجد حضرت عمرؓ اور مسجد فتح شامل ہیں، کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور وہاں نوافل ادا کرتے ہیں تو ان کا دھیان جنگ خندق جو جنگ احزاب کے نام سے بھی مشہور ہے کی طرف چلا جاتا ہے اور پھر ہمیں وہ اس غزوہ کے تاریخی پس منظر سے متعارف کراتے ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں چونکہ اس جنگ میں مشرکین مکہ کے علاوہ کافروں کے مختلف گروہوں اور یہودیوں نے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے خلاف صف آرائی کی تھی اس لیے اسے جنگ احزاب کہتے ہیں۔ سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے دشمن کے لشکر جرار کو روکنے کے لیے خندق کھودی گئی۔ جس سے اہل عرب پہلے واقف نہیں تھے اسی مناسبت سے اس جنگ نے جنگ خندق کے نام سے شہرت پائی۔ اس جنگ میں مدینہ کے یہودیوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دشمن کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ ان کی اس ساز باز کو ختم کرنے اور دشمن کے ارادوں کو ناکام بنانے میں حضرت نعیمؓ نے بڑی مہارت، تدبر اور حکمتِ عملی سے دشمن کی صفوں میں نفاق پیدا کیا۔ حضرت حذیفہؓ نے اس جنگ میں بڑا دلچسپ کردار ادا کیا۔ وہ رات کی تاریکی میں جب آندھی کا طوفان برپا تھا دشمن کی صفوں میں گھس کر اُن کے حالات معلوم کرنے لگے تا کہ اُن کے ارادوں سے حضور ﷺ کو مطلع کریں۔ رات کی تاریکی اور سرد آندھی کے طوفان میں ایک دوسرے کو تو کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا

حضرت حذیفہؓ چپکے سے بیٹھ کر اپنے دائیں بائیں والے لوگوں سے پوچھنے لگے کہ تم کون ہو ایک نے کہا ''میں عمرو بن عاص ہوں، دوسرے نے کہا ''میں معاویہ بن ابوسفیان ہوں'' انہوں نے یہ سب کام اس پھرتی سے کیا کہ دوسروں کو موقع ہی نہیں دیا کہ وہ ان سے پوچھیں کہ تم کون ہو۔ یہ منظر بڑا ہی ڈرامائی اور دلچسپ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ابوسفیان اور اس کے لشکر کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور وہ شکست خوردہ ہو کر واپسی کا ارادہ کر رہے تھے۔ حضرت حذیفہؓ نے یہ تمام معلومات ایک ماہر سراغ رساں کی حیثیت سے حضور ﷺ تک پہنچا دیں تو آپ ﷺ نے تبسم فرمایا یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دندان مبارک رات کی تاریکی میں بھی نظر آئے یہ وہ وقت تھا جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور میں سربسجود تھے اور فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اور پھر اللہ کی نصرت آئی اور آپ ﷺ خوشی سے سرشار ہو گئے حضرت نعیمؓ اور حضرت حذیفہؓ کے کرداروں کو پڑھ کر قاری ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کردار قاری کے ذہن میں ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑتے ہیں۔ یہی نہیں دشمن کی صفوں میں جو انتشار پیدا ہوا وہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ گھبراہٹ کے عالم میں ابوسفیان رات کی تاریکی میں اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا۔ اس حواس باختگی میں اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اُونٹ کا اگلا ایک پاؤں تو بندھا ہوا ہے۔ اس جنگ میں دشمن کو شکست فاش ہوئی اور آنحضرت ﷺ کو نوید ملی کہ قیصر و کسریٰ کے ممالک مسلمانوں کے زیر تسلط آ جائیں گے۔ ان واقعات کو پڑھ کر ہمارا ایمان تازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے صحابہ کرامؓ نے کس قدر تکالیف اور مشکلات کا سامنا کیا اور اپنی امت کے سفینہ کو ساحل مراد تک پہنچایا۔

یوں تو کتاب کے سارے ابواب ہی معلومات افزا، دلچسپ اور روح پرور ہیں مگر پانچویں باب میں آنحضرت ﷺ کا حجۃ الوداع کا دیا ہوا خطبہ بے حد پسند آیا۔ مجھے پہلی مرتبہ خطبہ حجۃ الوداع کا پورا متن پڑھنے کو ملا۔ یہ بنی نوع انسان کے لیے پہلا ''میگنا کارٹا'' تھا جو نہ صرف قابل عمل تھا بلکہ زندگی کی دشوار گزار راہوں میں مینارہَ

نور کا کام دیتا ہے۔اسی دستور العمل پر چل کر خلافتِ راشدہ کا دور مثالی اور پر شکوہ رہا ہے اسی عظیم ''میگنا کارٹا'' کی بدولت اکنافِ عالم میں اسلام کا پرچم بلند ہوا۔اشترا کی نظامِ حیات ہمارے سامنے دم توڑ گیا۔حال ہی میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دنیا کے اسی (80) ممالک میں زبردست مظاہرے ہوئے اور وہ وقت دور نہیں جب اسلامی مملکت ہی دنیا کو انتہا پسندی سے نجات دلا کر لوگوں کے لیے امن، سکون اور خوشی کا باعث بنے گی۔اسلام کا دستور حیات اعتدال، انصاف، احترام انسانیت ،اور تقویٰ کی مضبوط بنیاد پر استوار ہے جو خالق کائنات نے دنیا کے تمام لوگوں کو بلا تخصیص دیا۔

میں ملک مقبول احمد کو اس خوبصورت اور مفید تصنیف پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کارِ خیر کا اجر عظیم عطا کرے ،اور انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی نصیب ہو!

محمد سعید بدر قادری

روحانی سفر

''سفرِ آرزو'' ملک مقبول احمد کی غالباً سترھویں کتاب ہے اور اگر اسے سفر نامہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ اس سے قبل وہ ''سیاحت نامہ ترکی'' لکھ چکے ہیں جو طباعت کے مرحلوں کے بعد نہ صرف اب منصۂ شہود پر آ چکا ہے بلکہ اہل ذوق وشوق میں پذیرائی بھی حاصل کر چکا ہے۔

گزشتہ دنوں باتوں باتوں میں ملک صاحب نے بتایا کہ ان کی پہلی کتاب ''سفر جاری ہے'' (جو خودنوشت کی حیثیت رکھتی ہے) کا چوتھا ایڈیشن چھپنے جا رہا ہے۔ اپنی سوچ کے مطابق راقم نے انہیں ''مفت'' مشورہ دیا کہ (کیونکہ ہمارے ہاں ''مفت مشورہ'' دینے کا عام رواج ہے، ویسے بھی مشورہ کی فیس بھلا کون دیتا ہے؟ البتہ ڈاکٹروں کو فیس مشورہ ضرور دینا پڑتی ہے) اس کتاب میں آپ نے حرمین الشریفین یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے سفر کے بارے میں مختصر سا تذکرہ کیا ہے، اگر آپ اسے الگ سے ''سفر نامہ'' کے طور پر لکھیں تو بہت مفید رہے گا۔ اس طرح آپ کی جانب سے ایک اچھی کاوش سامنے آ جائے گی اور قارئین کرام کو ایک نئی کتاب میسر آئے گی جو علمی و ادبی اعتبار سے کارآمد بھی ہوگی اور ارض مقدس سے تعلق اور عقیدت رکھنے والوں کی روحوں کی تشنگی کو تسکین فراہم کرنے کا باعث بھی بنے گی۔ ملک صاحب کے تحریر کردہ ''پیش لفظ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن اتفاق سے ان کے بعض دوستوں نے بھی یہی رائے دی جن میں قابل صد احترام، بلند پایہ محقق اور ممتاز دانشور ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ پروفیسر جمیل آذر

،سینئر صحافی اور ممتاز ادیب علی سفیان آفاقی، شفیع ہمدم اور متعدد کتب کے مصنف علامہ عبدالستار عاصم شامل ہیں۔ ملک صاحب نے جو بڑے ''کام'' کے آدمی ہیں اور ''کام'' ہی زندگی بھران کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے، جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ سے کام لیا اور مختصر سی مدت میں اپنے روحانی سفر کی روداد نہایت دلچسپ انداز میں لکھ دی جو ''سفرِ آرزو'' کے دلکش نام سے اب آپ کے سامنے ہے۔

ملک صاحب کی مہربانی سے مجھے اس کتاب کے اصل مسودے کی ورق گردانی کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ سچی بات ہے کہ عمرہ و حج کے متعلق نہ صرف یہ کتاب مفید اور کارآمد ہے بلکہ مناسک حج کے بارے میں بیش قیمت معلومات سے معمور مکمل کتاب ہے۔

ملک مقبول احمد صاحب نے اپنے اس دلنواز سفرنامہ میں ''شہران جلال و جمال'' کی لمحہ لمحہ روداد لکھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ زائرین حجاز کی رہنمائی کے لیے وہ طریقے بھی لکھ دیئے ہیں جن پر عمل کر کے میرے جیسے اناڑی لوگ بھی عمرہ یا حج کے لوازمات کو صحیح طریقے سے ادا کر کے اپنے فریضہ عمرہ و حج کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول بنا سکتے ہیں۔ ملک صاحب نے ان تمام دعاؤں کو آسان اُردو زبان اور سادہ پیرائے میں لکھ دیا ہے جن کی زائرین کو وہاں قدم قدم پر شدت سے ضرورت پیش آتی ہے بلکہ یہ تمام دعائیں مناسک حج کا لازمی حصہ ہیں جن کے بغیر عمرہ و حج کے لوازمات پورے ہی نہیں ہو سکتے اور ہمارا ایمان ہے کہ اگر مناسک حج میں کسی اعتبار سے کوئی کمی، کوتاہی یا خامی دیدہ دانستہ یا نادانستہ رہ جاتی ہے تو خدشہ ہے کہ آپ کا وہ عمل شرف قبولیت حاصل نہ کر سکے جس میں کوئی کمی، کجی یا خامی رہ گئی ہے۔

اس سفرنامے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا قاری مطالعہ کے دوران میں نہ صرف کتاب کے مطالعہ میں محو رہتا ہے بلکہ ملک صاحب کے ساتھ ساتھ چلتا پھرتا ہے اور محوِ سفر بھی رہتا ہے۔ ملک صاحب اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں، قاری بھی انہیں اپنی

آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان سے بہ تمام وکمال خوشی ومسرت اور حظ محسوس کرتا ہے۔ دراصل ملک صاحب کی تحریر کا یہ کمال ہے کہ وہ قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اسی کمال نے انہیں بلند پایہ اہل قلم کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

انہوں نے اپنے اندازِ تحریر کو شگفتہ اور دلچسپ رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ انہوں نے اسے بھاری بھرکم معلومات سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری بے پناہ خوشی اور عالم مسرت میں نہ صرف اس روحانی سفرنامہ کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ وہ اس کی جزئیات میں منہمک اور مستغرق بھی ہو جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ روحانی خوشی ومسرت، قلبی تازگی اور بالیدگی محسوس کرتا ہے۔

''حرمین الشریفین'' کے روحانی سفر کے بارے میں اب تک سینکڑوں نہیں ہزاروں سفرنامے لکھے جا چکے ہیں اور ان شاءاللہ تا قیامت لکھے جاتے رہیں گے لیکن ہر شخص کا انداز اور اسلوب بیان ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے۔ ہر کسی نے اِسے دلچسپ بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ان سفرناموں میں ممتاز مفتی کا سفرنامہ ''لبیک'' منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ راقم کے خیال میں اب تک لکھے گئے سفرناموں میں یہ بہترین سفرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے جو علمی وادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ تمام ضروری معلومات کا حامل بھی ہے۔ اس کا انداز نہایت شگفتہ اور دلکش ہے۔

ملک صاحب نے اگرچہ اپنے سفرنامہ میں نہایت سادہ اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے لیکن انہوں نے دلچسپی اور دلکشی کو بہر حال برقرار رکھا ہے۔ وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگتے ہیں جن میں التجا، عاجزی اور گریہ وزاری کے عناصر نمایاں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ''بندے'' کے تعلق کو ہر لمحہ پیش نظر رکھتے ہیں اور دل وجان سے اللہ تعالیٰ کو اپنا آقا ومولا، مالک ومختار، خالق رازق تسلیم کرتے ہیں اور اس سے گڑگڑا کر اپنی دنیا اور عاقبت کو سنوارنے کی درخواستیں کرتے ہیں۔

اس سفرنامے میں ملک صاحب نے تمام مقدمات مقدسہ کا مختصر تاریخی پس

منظر بھی پیش کیا ہے جس نے سفر نامہ کی افادیت اور اہمیت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ تلاش و جستجو اور استفسار انسانی طبائع کا خاصہ ہے، بچہ ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد۔ ہر شخص اپنے گردو پیش کے بارے میں ''جاننا'' چاہتا ہے اور اسی ''جاننے'' کا نام علم ہے اور ''پہچاننے'' کو معرفت کہا جاتا ہے۔ یہی علم و عرفان ہے جس نے آدم کو نہ صرف معتبر اور محترم بنایا بلکہ اسے خلیفتہ الارض کا مقام و مرتبہ بھی عطا کر دیا ہے۔ قرآن پاک کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ''تمام اسماء'' سکھا دیئے۔ یہ ''اسماء'' وہ علوم وفنون ہیں جو اب تک انسان سیکھتا اور سکھاتا چلا آیا ہے اور انہیں کی بدولت وہ اب آسمان کی بلندیوں تک نہ صرف محوِ پرواز ہے بلکہ چاند اور مریخ پر اپنے ''علم'' کے پرچم بھی گاڑ آیا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ بدر ہو، جنگ اُحد، غزوہ خندق ہو یا فتح مکہ، ملک صاحب ہر واقعہ بلکہ ہر مقام کا مختصر پس منظر ضرور پیش کرتے ہیں تاکہ قاری کو معلومات حاصل ہوتی رہیں اور مقامات سے واقفیت ہوتی رہے اور اس کے متجسس ذہن کی تسکین کا سامان بھی فراہم ہوتا رہے۔

ملک صاحب نے اپنے اس ''سفر نامہ'' کے مختلف ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں آرزوئے حج کے ساتھ ساتھ بیت اللہ کی مختصر تاریخ اور برکات کا ذکر بھی کیا ہے ۔ باب دوم میں چاہ زمزم کی تاریخ اور اس کے احوال بیان کیے ہیں۔ باب سوم میں مسجد نبویؐ اور مسجد قبا کے حالات اور تاریخ پیش کی گئی ہے۔ غرضیکہ مدینہ منورہ کی گلیاں، بازار اور مارکیٹ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت امیر حمزہؓ کے مقبرہ کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کتاب میں غزواتِ رسول مقبول ﷺ کا بھی تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

مدینہ شریف کے بعد ان کی منزل مکہ معظمہ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

''چونکہ آپ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ مکہ بھی جاؤ اور بیت اللہ کی زیارت کرو، اس لیے میں مکہ معظّمہ کی زیارت کے لیے جارہا ہوں ورنہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپؐ کے سوا میری کوئی اور منزل نہیں۔ آپؐ ہی میرا مقصودِ حیات، آپؐ ہی میری کائنات اور آپؐ ہی میرا مطمع نظر ہیں۔''

باب پنجم میں حج بیت اللہ کی تفصیلات درج ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورِ رسالت مآب، فخرِ موجودات، نبی مکرم ﷺ نے جو تاریخی اور بصیرت افروز خطبہ دیا تھا۔ اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ وہ خطبہ ہے جس میں زندگی کے تمام اُمورہ ومعاملات کی نشاندہی کر دی گئی ہے بلکہ مذہبی اور دینی زندگی کے مقاصد بھی واضح کر دیئے گئے ہیں اقوام متحدہ کا چارٹر اس خطبہ کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ اس کے بعد غلافِ کعبہ کی تبدیلی اور مفتی اعظم کے خطبہ کا متن دیا گیا ہے۔ جبل نور، غارِ حرا اور غارِ ثور کے تاریخی پس منظر پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں بعض خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات کا ذکر بھی کیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام کی معلومات میں اضافہ ہو اور آئندہ جب وہ عمرہ یا حج پر جائیں تو ''ممنوعات'' اور ناخوشگوار واقعات سے بچ سکیں۔

غرضیکہ ''سفرِ آرزو'' اب تک شائع ہونے والے سفرناموں میں ایک عمدہ اور مفید اضافہ ہے۔ ہماری رائے میں عمرہ یا حج پر جانے والے ہر زائر کو اس سفرنامے کا دلچسپی اور توجہ سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ انہیں پاکیزہ سفر میں آسانی رہے اور وہ خواہ مخواہ کی مشکلات سے بچ سکے۔

''سفرِ آرزو'' ایک ایسی روحانی دستاویز ہے جس کا ہر مسلمان کے لیے مطالعہ

ضروری ہے اور ہر گھر میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔

امید واثق ہے کہ اہل درد اور اہل ذوق وشوق خوش دلی اور نہایت توجہ سے اس مفید کتاب کا نہ صرف خود مطالعہ کریں گے بلکہ دوسروں کو اس کے پڑھنے کی ترغیب دیں گے۔اعزہ واقارب کو یہ کتاب تحفہ میں دینا بہت مفید رہے۔

............☆☆............

انور سدید

سفرِ آرزو

"بلاشبہ سب سے پہلی عبادت گاہ جو لوگوں کے لیے تعمیر
ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ اس میں خیر و برکت ہے اور یہ تمام
جہانوں کے لیے ہدایت کا مرکز ہے۔ اس میں کھلی نشانیاں
ہیں، مقام ابراہیمؑ ہے۔ اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل
ہو گیا، وہ امن پا گیا۔" آلِ عمران)

بہت عرصے کی بات ہے کہ یہ ارشادِ ربانی ملک مقبول احمد نے پڑھا جو لاہور میں ایک مشہور اشاعتی ادارے کے سربراہ ہیں اور پھر وہ مسلمان کی طرح مکہ مکرمہ کے مرکزِ ہدایت میں داخل ہونے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ تا آنکہ ان کی دعا سنی گئی اور انہیں ارضِ مکہ سے بلاوا آ گیا۔ فریضہ حج ادا کر کے واپس آئے تو بدلے ہوئے انسان تھے۔ کہنے لگے۔ "دل چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حرم شریف میں نماز ادا کروں۔ حجر اسود کو بوسہ دوں، طوافِ کعبہ کروں اور شہنشاہ رسلؐ، نبی آخرِ زمانؐ کی جالیوں کو بوسہ دوں۔ دوستوں نے ان سے درخواست کی کہ اپنا "حج نامہ" لکھیں اور اس میں وہ تمام کیفیات درج کریں جو انہوں نے ارضِ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں محسوس کیں لیکن "ایک انجانا

خوف اور ڈر ہمیشہ ان کے آڑے آتا رہا کہ اس مقدس سفر کو کیسے لکھوں۔''......اس دوران انہوں نے متعدد بار عمرہ کیا اور اپنے جسم وجاں کو آبِ زمزم سے طاہر و مصفّیٰ کیا۔ اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے''لکھی تو اس میں تاثراتِ حج کا ایک باب بھی شامل کیا۔اس آپ بیتی کی کامیابی نے انہیں ادیبوں کی صف میں شامل کر دیا اور پھر وہ تصنیف وتالیف کے میدان میں آ گئے اور مکے مدینے کے مقدس سفر یاد آتے تو عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات سنتے ۔آخر دوستوں، کرم فرماؤں اور ان کے بچوں کا اصرار کام آیا اور انہوں نے زیرِ نظر کتاب ''سفر آرزو''لکھی جو دراصل عشق نبیؐ سے نورِ حیات اخذ کرنے کی داستان ہے، خوبی کی بات ہے کہ حرم اور صحن نبویؐ میں عبادت کا شرف حاصل کرنے والے ملک مقبول احمد نے اس کتاب کو اپنے مشاہدات تک محدود نہیں کیا بلکہ انہوں نے متعدد ''حج ناموں'' کو پڑھا اور پھر دوسروں کے مشاہدات کے تذکرے اور تاریخی سفر کے واقعات کے ساتھ اپنے تاثرات بھی شامل کر دیئے۔اب یہ کتاب محض حج کا سفرنامہ ہی نہیں بلکہ ارضِ مقدس کا جغرافیہ بھی ہے اور اس دور کی تاریخ بھی ...... جب اس سرزمین کو خدا کے آخری نبیؐ نے وحدتِ خداوندی کا پیغام سنایا۔اب یہ کتاب زمینی سفر کی داستان ہی نہیں، روحانی سفر کی روداد بھی ہے۔آپ اسے ملک مقبول احمد کے تین اسفارِ حج (۱۹۸۶ء......۲۰۰۲ء......۲۰۰۶ء) کے علاوہ متعدد ''عمروں'' کا قیمتی ثمر بھی قرار دے سکتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب لکھتے وقت جب وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی گلیوں، اللہ کے گھر اور نبیؐ مکرم کی آخری آرام گاہ کے تذکرے لکھ رہے تھے تو دراصل انہوں نے روحانی سطح پر چوتھا حج بھی کر لیا تھا اور یہ کتاب اس کی معنوی تعبیر ہے۔

اس کتاب میں آنحضورؐ کی حیات طیبہ، بیت اللہ کی تاریخ، چاہِ زمزم کا تذکرہ، غزواتِ نبویؐ کا بیانیہ اور خطبہ حجۃ الوداع تک معطر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب

کے دیباچے میں پروفیسر جمیل آذر نے درست لکھا ہے کہ ملک مقبول احمد نے فلیش بیک کی تکنیک اختیار کی ہے جس میں آزاد تلازمہ خیالات اور ماضی کے واقعات کی صدائے بازگشت کا عمل ہوتا ہے۔ میری رائے میں اس تکنیک سے ماضی بھی حال کا جزو بن جاتا ہے اور مصنف ماضی کے حالات و واقعات بھی شاہد بن جاتا ہے اس کتاب کی دوسری بڑی خوبی عبادت گزار کی عقیدت کا اسلوب ہے جس کا ہر لفظ توحید کا زمزمہ ہے اور عقیدت نبوی ؐ کا آئینہ دار ہے۔

ماہنامہ ''الحمرا'' لاہور

☆☆☆

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

ملک مقبول احمد کہنے کو تو ایک پیشہ ور پبلشر ہیں مگر جب سے آپ کے قلم سے ''سفر جاری ہے'' کی تخلیق ہوئی ہے آپ کا لکھنے پڑھنے کا حوصلہ بھی جوان ہو گیا ہے اور مہارت بیانی بھی روز بروز ترقی پا رہی ہے ''سفر جاری ہے'' سے شروع ہونے والا ملک صاحب کا قلم کاری کا یہ سفر آشنائی، اہل قلم کے خطوط، شناسائی، رہنمائے حج وعمرہ۔ تعلیمات قرآن، پیغمبر عالمؐ، ۵۰ نامور ادبی شخصیات، سیاحت نامہ ترکی، گلشن ادب، آپس کی باتیں، ارمغان غزل، گمشدہ افسانے اور بر سبیل گفتگو جیسی مایہ ناز کتابیں منظر عام پر لاتا ہوا آج ''سفر آرزو'' پیش کرتے ہوئے سرخ رُو ہو رہا ہے۔

ملک مقبول احمد نے ''سفر جاری ہے'' ہے کیا لکھی گویا بہت سے لکھنے والوں کو مہمیز مل گئی۔ پروفیسر جمیل آذر صاحب راولپنڈی نے ''راہ نورد شوق کے عنوان سے تبصرہ وخود نوشت کی ایک نئی داغ بیل ڈال دی۔ فدوی نے بھی ایک مسودہ لکھ کر ملک صاحب کے حوالے کر دیا ہوا ہے جو نوک پلک درست کرنے اور کمپوزنگ کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

مختصر تبصروں اور تحسین کا تو ایک طوفان ہے جس کی جھلک آشنائی اور پذیرائی کے علاوہ اہل قلم کے خطوط، ملک صاحب کی کتابوں کے فلیپ، دیباچے، تاثرات اور اخباری کالموں سے بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ گویا

سفر کیا جاری کیا تھا ملک صاحب نے شباب
ہم سفر بننے کو اک عالم گویا تیار تھا

''سفرِ آرزو'' ملک مقبول صاحب کی ''پیغمبرِ عالم ﷺ'' کے بعد ایک معیاری، علمی، تحقیقی، دینی اور متعلقاتِ سیرت پر کتاب ہے یہ بہت خوبصورت مرقع ہے۔ کہنے کو تو یہ سفر حج

ہے مگر ملک صاحب نے مقاماتِ حج کی تاریخ لکھتے لکھتے بالفاظِ دگر سیرت النبیؐ کے کئی اہم گوشوں کی تصویر کشی کر دی ہے۔ تین سو سے زائد صفحات کی اس کتاب کو ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد کوئی صاحبِ ذوق اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا اور پھر اس کے پہلے چند صفحات کو پڑھ لینے کے بعد جذب وشوق کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ آخر تک پڑھے بغیر کتاب کو رکھ دینا گویا کور ذوقی ہوگی۔

ملک مقبول احمد نے ''سفر جاری ہے'' میں بھی یہ بات دو تین دفعہ دہرائی ہے کہ ''میں ایک کم پڑھا لکھا شخص ہوں۔ کئی جگہ اپنی تعلیم کی کمی مگر تجربے اور مہارت کی کثرت کا ذکر کرتے ہیں۔ جب بھی ملک صاحب سے ملاقات ہو تو آپ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنی علمی بے بضاعتی کا اظہار کرتے ہیں۔ بالکل ہو سکتا ہے کہ ہماری روایتی تعلیم کے ماحول اور عجز بیانی کے پس منظر میں ملک صاحب کا یہ اعتراف درست ہو مگر ملک صاحب کی متعدد کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی بھی شخص یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کتابیں ایک پڑھے، ماہر القلم اور قادر الکلام شخص کے قلم کا اعجاز ہیں۔ میں ملک صاحب کی کئی کتابوں ہو یہ تاثر سے دیئے بغیر نہ رہ سکا مگر ''سفر آرزو'' نے تو مجھے مجبور کر دیا ہے کہ

ملک جی، تیرے قلم کے کیا کہنے، خوب اور محبوب لکھتے ہو سبھی
کس قدر تاثیر ہے تحریروں میں خوب تعریف کرتے ہیں پڑھ پڑھ کے سبھی

''سفر آرزو'' کا ٹائٹل بابِ خانہ کعبہ اور غلاف کعبہ کی جھلک سے مزین ہے یہ جھلک بیک ٹائٹل تک پھیلی ہوئی ہے بیک ٹائٹل پر دو حضرات پروفیسر جمیل آذر صاحب اور صاحبزادہ محمد سعید احمد بدر قادری صاحب کی تحریروں سے اقتباسات بھی موجود ہیں۔ اندرونی سادہ ٹائٹل سے پہلے ایک صفحہ پر سورۃ آل عمران کی آیات 97-96 اور اس سے اگلے صفحہ پر مذکورہ آیات کا اردو نثری ترجمہ دیا گیا ہے انتساب حضرت سید اولین والآخرین محمد ﷺ کے نام کی طرف گیا ہے اور علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ذیل میں رقم کیا گیا ہے۔

لوح بھی تُو ، قلم بھی تُو ، تیرا وجود الکتاب

گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب

انتساب سے اگلے صفحے پر سورۃ حدید کی آیہ 28 مع ترجمہ درج کی گئی ہے۔

پیش الفاظ ،عرض جمیل اور روحانی سفر کے ارقام کے بعد کتاب زیرِ قلم کی 78 عنوانات کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔''سفر آرزو'' کے آخر میں ماٰخذ میں 27 کتب، رسائل اور روزناموں کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں کائنات کی سب سے عظیم کتاب قرآن مجید (تنزیل من رب العالمین) بھی شامل ہے۔ صحیحین بھی موجود ہے کوئی نصف درجن سفر نامہ ہائے حج بھی ہیں سیرت اور تاریخ اسلام کی کتابیں بھی ہیں غرضیکہ یہ ایک گلدستہ کتب ہے جس کے تمام پھول اپنے رنگ اور خوشبو میں اپنی اپنی خصوصی شناخت کے حامل ہیں۔

ملک مقبول احمد صاحب نے اپنے اس سفر نامہ حج کی سرگزشت میں جہاں روداد حج اور سفر و قیام مکہ و مدینہ کے احوال قلم بند فرمائے ہیں وہیں سیرت النبیؐ کے چیدہ چیدہ واقعات پوری شرح وسط سے مقامات حج کی مناسبت سے کتاب کے مختلف صفحات میں پھیلا دیے ہیں اپنی تحریروں کو عربی ،فارسی ،اردو اور مصرعوں سے سجایا ہے اور اپنے دل کی ایمانی کیفیت کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات وخیالات کو مشتہر کیا ہے۔ کتاب میں متعدد مقامات پر رنگین تصویروں نے کتاب کی صوری خوبیوں اور ملک صاحب کی بیانی خصوصیات کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات ،احادیث اور دعاؤں کا مختلف صفحات میں مع ترجمہ کے سجایا جانا ''سفر آرزو'' کے لیے سونے پہ سہاگہ کا کام کر رہا ہے۔ خطبہ حجتہ الوداع کی تعلیمات کے ابلاغ نے میگنا کارٹا دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری کے قمقموں نے ملک مقبول صاحب کی ''سفر آرزو'' کو متعدد مقامات پر بہت دل کش اور دل آویز بنا دیا ہے۔ خطاطی کے نمونے ''سفر آرزو'' کے حسن ودلکش پر خوب اضافہ ہیں۔

پروفیسر جمیل آذر صاحب کے ''عرض جمیل'' کی قلم کاری نے ''سفر آرزو'' کے مضامین

کا مجمل سا احاطہ کیا ہے۔ کتاب کے صاحبزادہ سعید بدر قادری صاحب کے ''روحانی سفر'' نے ''سفر آرزو'' پر ایک دل چاہت سے نظر ڈالی ہے اور مضامین کا خوب خوب جائزہ لیا ہے۔

''سفر آرزو'' کے مطالعہ کے بعد میرے علم میں کئی پہلوؤں سے اضافہ ہوا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ملک مقبول احمد صاحب کا اندازِ بیان دل نشیں ہوتا ہے ان کے فطری، فی البدیہہ اور سادہ انداز بیان کا معیار یہاں ''سفر آرزو'' میں۔

☆ اپنے دل کی آرزوؤں کو کھول کر صفحہ قرطاس پر پھیلا دیا ہے۔

☆ حج کے مختلف مناظر کی بیانیہ عکاسی بڑی مہارت سے کی ہے۔

☆ ملک ملک کے شہریوں کے لباس، عادات اور شکل وشمائل پر رشنی ڈالی ہے۔

☆ بازاروں محلوں، ہوٹلوں، کھانوں، گاڑیوں، بسوں اور سڑکوں کا تذکرہ کیا ہے۔

☆ اپنے ساتھیوں کی عادات اور معاملات کا ذکر خیر کیا ہے۔

☆ اپنی نصف بہتر محترمہ کے ''ساتھ'' کا گاہے ماہے ذکر کرتے ہیں۔

☆ جہاں مناسب سمجھا اور کوئی مشورہ یا تجویز مناسب لگی، بے لاگ لپیٹ دے دی ہے۔

☆ سعودی حکمرانوں کا جو عمل اچھا سمجھا اس کی تحسین کی ہے اور جہاں ناپسندیدگی کا اظہار کرنا چاہا وہاں مناسب ومتناسب انداز میں اسے بیان کر دیا ہے۔

☆ چور بازاری، ہیرا پھیری اور غلط کاری کو بھی بلا حیل وحجت بیان کر دیا ہے وہ حرم میں ہو یا مسجد نبویؐ میں غلط ہر جگہ غلط ہے اور حق گوئی ہر جگہ حق گوئی ہے۔ دونوں چیزیں ملک صاحب کے پیش نظر رہی ہیں۔

☆ ''سفر آرزو'' کے بیانات کو وقیع بنانے کے لیے متعدد کتابوں کے

مطالعہ سے مدد لی گئی ہے اور سفر حج کو سفر سیرت بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے گویا محاورتاً یہ ایک ٹکٹ میں دو مزے لینے والی بات ہے۔"

اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ بہترین کاغذ مضبوط جلد 36 رنگین تصاویر سے "سفر آرزو" مزین ملک مقبول احمد کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف عقیدت سفر حج کے حالات و واقعات پر مشتمل کتاب جس خوبصورت دریچوں سے جگہ جگہ سیرت النبیؐ کے اقتباسات جھلکیں مار رہے ہیں کو مقبول اکیڈمی لاہور نے بڑی محبت و عقیدت سے شائع کیا ہے۔

اِک صدا دی ہے برائے کارِ خیر
اٹھ پڑو اے دوستو، بڑھا دو پیر
سفر آرزو کو لو ہاتھوں میں تھام
اپنے جذب و عشق کو پھر کر دو سیر

☆☆☆

پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ

ملک مقبول احمد صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔اُردو بازار سرکلر روڈ پر ان کے نام کا ایک اشاعتی ادارہ ''مقبول اکیڈیمی'' کے نام سے ہے۔اس ادارے نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرایا اور کئی بڑے ناموں کو اور بھی بڑا بنایا،ملک صاحب کی طباعت کا ایک منفرد انداز ہے جس نے اسے مقبول عام بنا دیا ہے۔

ملک صاحب نے اپنے اندر کا ادیب اس وقت تک سلائے رکھا جب تک فن طباعت کے بام عروج تک پہنچنے میں کام یاب نہیں ہو گئے۔ملک صاحب کے اندر کا ادیب جب کبھی بیدار ہوتا تھا تو وہ اسے ادیبوں کی پرکھ پر لگا دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا انتخاب دیگر اداروں سے منفرد اور یگانہ ہے۔

ملک صاحب نے فن طباعت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد اندر کے ادیب کو جگایا اور اسے بتایا کہ عشروں کا کام سالوں میں مکمل کرنا ہے اس طرح چند سالوں میں انہوں نے ڈیڑھ درجن کتب تالیف کر کے انہیں زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے مقبول اکیڈیمی کی زینت بنا دیا،ملک صاحب اپنی تالیفات اپنے ادارے کے متوسلین تک ضرور پہنچاتے ہیں ان کی قدر دانی اور مہربانی سے اس فہرست میں ہمارا نام بھی شامل ہوتا ہے۔اب کی بار آپ نے ایک ایسے تحفے سے نوازا جو ہر مسلمان کے دل کی آرزو اور آتما کی آواز ہے یہ ان کی تازہ تالیف ہے جو ربع صدی پر محیط ہے۔یہ ''سفرِ آرزو'' کے نام سے سفر حجاز کا وارداتِ قلبی،تاثراتِ وجدانی اور کیفیات جسمانی کا ایک حسین مرقع ہے کہنے کو تو ملک صاحب کے

حرمین شریفین کی زیارت کا یہ روحانی اور جسمانی سفر نامہ ہے مگر موصوف نے بڑی چابک دستی اور مہارت سے ہر خاص و عام کو اپنا ہم سفر بنالیا ہے۔

ملک صاحب کی کتاب ''سفرِ آرزو'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں سفر آرزو لے کر مکہ پہنچتے ہیں مکہ دنیا میں اللہ کا دارالحکم ہے یہاں اللہ کا گھر ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان پر وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اسی کیفیت میں وہ کہہ اُٹھتا ہے لبیک اللّٰھُمّہَ لبیک! ملک صاحب ص ۳۳ پر رقم طراز ہیں:

بعض روایات میں ہے کہ آدمؑ کی یہ تعمیر کعبہ نوح کے زمانے تک باقی تھی، طوفانِ نوحؑ میں منہدم ہوگئی اور اس کے نشانات مٹ گئے اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے انہی بنیادوں پر اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ عمارت ایک مرتبہ پھر منہدم ہوئی تو عمائقہ نے تعمیر کی اور پھر کسی حادثے میں منہدم ہوئی تو قریش نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں اس کی تعمیر کی جس میں آں حضرت ﷺ بھی شریک ہوئے اور حجر اسود کو اپنے دستِ مبارک سے نصب فرمایا۔

مکّہ سے تین میل دور کوہِ حرا کے ایک غار میں جس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز تھا، جا بیٹھتے اور دنیا سے الگ تھلگ ہو کر ذکر و عبادت میں لگے رہتے تھے یہ وہی غارِ تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب بھی یادِ الٰہی میں کئی کئی راتیں اور دن وہیں گزارتے تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک کا مہینا اسی غارِ میں بسر فرماتے تھے یہاں غارِ حرا میں خلوت کے پرسکون لمحات میں آپ عبادت اور سوچ و بچار میں مشغول رہتے تھے۔ اسی غارِ حرا میں پہلی وحی، اقراء باسم ربک الذی خلق۔ نازل ہوئی اور ایک گراں بار ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈال دی گئی۔

قریشِ مکہ، کعبہ کے متولی تھے انہیں مشرکین عرب کی سیاسی، روحانی اور مذہبی پیشوائی حاصل

تھی اور ہر سال حج بیت اللہ کے موقع پر ان کی جیبیں چڑھاوؤں اور نذرانوں کے سیم وزر سے بھر جاتی تھیں وہ رسول اللہ کے شدید مخالف بن گئے اور ہر حال میں اسلام کی دعوتِ حق کچلنے اور آں حضورؐ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ ۱۳ نبویؐ میں قریش کے سب قبائل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یکبارگی حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بھیانک سازش سے مطلع فرمایا اور ہجرت کی اجازت دے دی۔ پنج شنبہ ۲۷ صفر ۱۳ نبوت کو ایک سو رئیس زادوں کا لشکر ابوجہل کے زیر کمان عشاء کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچ کر آپؐ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ حضورؐ نے انہیں دیکھ کر اپنے پیارے چچازاد بھائی حضرت علیؓ سے فرمایا:

"تم میری یہ سبز چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ اور میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں ہیں وہ ہر ایک کو لوٹا کر کل مدینے آ جانا۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر پھولوں کی سیج نہیں تھا مگر آپؐ کا فرمان کہ اے علیؓ! کل یہ امانتیں لوٹا کر مدینہ آ جانا اس جملے سے مجھے مدینہ پہنچنے تک زندگی کی امان مل جانے کا یقین کامل ہو گیا اور میں اُس رات ہر بلا سے محفوظ ہو کر ایسی چین کی نیند سویا جو بعد میں اُس چین سے سونا کبھی نصیب نہیں ہوا۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے لشکر کو اونگتے چھوڑ کر اپنے پیارے دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچے اور انہیں ساتھ لے کر جبل ثور کی طرف روانہ ہو گئے۔

مکہ کے شمال میں تین سو میل پر مدینہ منورہ ہے۔ جب کہ جبلِ ثور مکہ سے تقریباً پانچ میل دور جنوب مغرب میں واقع ہے۔ غارِ ثور تک چڑھائی نہایت دشوار اور رستہ سنگ لاخ تھا۔ نوکیلے پتھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کو زخمی کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے نبیؐ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور غارِ ثور تک جا پہنچے۔ ملک صاحب نے "سفرِ آرزو" کے ص ۲۱۰ پر دونوں غاروں کا یوں نقشہ کھینچا ہے۔

”جبل ثور بھی سیاہ چٹیل پہاڑ ہے اگر چہ جبلِ نور بھی سیاہ چٹیل ہے لیکن میں نے وہاں اِکا دُکا درخت بھی دیکھے ہیں، بالخصوص بلندی پر پہنچ کر جہاں سے ہم جنوبی غارِ حرا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ وہاں ایک سایہ دار درخت بھی بہار دے رہا ہے۔ ریگستان عرب میں کہیں کہیں کوئی درخت یا سبزہ نظر آجائے تو عجیب قسم کا روحانی سرور اور لذت ملتی ہے۔ غارِ حرا طول وعرض اور بلندی کے لحاظ سے غارِ ثور سے بہت بڑی ہے۔ غارِ حرا میں کھڑے ہو کر بآسانی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ جب کہ غارِ ثور میں جھک کر اندر داخل ہونا پڑتا ہے۔ غارِ ثور کا اگلہ حصہ تھوڑا کھلا اور روشن ہے یوں یہ غار سرنگ نما ہے۔“

غارِ ثور کا دہانہ اب بند کر کے چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔ زائرین اس پر دو نفل پڑھتے ہیں اور اس واقعے کو ذہنوں میں تازہ کرتے ہیں۔ جبل حرا میں ملکہ زبیدہ کی بنائی ہوئی نہر زبیدہ کے آثار بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یثرب پہنچنے پر اس بستی کا نام مدینۃ النبیؐ پڑ گیا اور آج مدینہ کہلاتا ہے۔ قریش مکہ نے تین سو میل دور مدینہ میں بھی مسلمانوں کو چین سے نہ رہنے دیا انہوں نے کئی جنگیں مسلط کیں یہ ساری جنگیں مدینہ اور مدینہ کے گرد و نواح میں لڑی گئیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریش جارح تھے اور مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھائے۔ ملک صاحب ”سفرِ آرزو“ ص ۱۷۰ پر غزوہ احزاب کا ایک منظر یوں پیش کرتے ہیں۔ خندق کھودتے کھودتے ایک چٹان ایسی آئی جس پر کسی کا بس نہیں چلتا تھا جب سب بے بس ہو گئے۔ آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے کدال لے لیا اور بسم اللہ پڑھ کر اس پتھر پر ضرب لگائی جس سے چٹان کا ایک تہائی حصہ ٹوٹ گیا اس ضرب کے ساتھ ہی روشنی کا ایک شعلہ نکلا اور ایک نور خارج ہوا جو سیاہ رات میں چراغ کی طرح روشن تھا۔ اسی وقت

آں حضرتؐ نے تکبیر کہی اور فرمایا:

''مجھے ملک یمن کی کنجیاں مرحمت فرمادی گئی ہیں اور مجھے اس جگہ کھڑے صنعا کے دروازے صاف نظر آرہے ہیں۔''

پھر آپ نے بسم اللہ کہہ کر دوسری ضرب لگائی اس سے چٹان کا دوتہائی حصہ ٹوٹ گیا۔ پھر ایک نور ظاہر ہوا۔ آں حضرتؐ نے پھر تکبیر کہی اور فرمایا:

''مجھے ملک شام کی کنجیاں عنایت فرمادی گئی ہیں۔ اللہ کی قسم! میں ملک شام کے سرخ محلات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔''

اس کے بعد آپؐ نے تیسری ضرب لگائی اور چٹان کا باقی حصہ بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اس کے نتیجے میں روشنی کا چھما کہ نمودار ہوا۔ آں حضرتؐ نے تکبیر کہی اور ارشاد فرمایا:

''مجھے فارس کی کنجیاں عطا فرمادی گئی ہیں۔ اللہ پاک کی قسم! مجھے اسی جگہ سے حیرہ و مدائن میں کسریٰ کے سفید محلات نظر آرہے ہیں''۔

اور اس کے ساتھ ہی آپؐ حضرت سلمان فارسیؓ کو اس جگہ کی تفصیل اور محلِ وقوع بتلاتے جاتے اور حضرت سلمان فارسی کہتے تھے یارسول اللہ! آپؐ نے سچ فرمایا اس جگہ کی تفصیل اسی طرح سے ہے۔

روضہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت جزو ایمان ہے۔ روضے پر پہنچ کر ہر کوئی یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ رحمت کے سائے میں پہنچ گیا اور ایک نادان اپنے شفیق باپ سے نادانی کا رو رو کر اقرار کر رہا تھا اس حاضری کو ملک صاحب ''سفرِ آرزو'' ص ۱۰۰

ہم باب السلام سے مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے۔ میری زبان پر جہاں درود شریف کا ورد جاری تھا وہیں یہ شعر بھی میرے لبوں پر آ گیا۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

مواجہ شریف روضہ النبیؐ کے اس حصے کا نام ہے جس کی سنہری جالیوں میں تین گول سوراخ ہیں جن کے سامنے کھڑے ہو کر سلام پیش کیا جاتا ہے۔

بڑا گول سوراخ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ کے سامنے کا ہے۔ دوسرے سوراخ کے سامنے حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے یارِ غار اور خلیفہ اوّل ہیں۔ تیسرے سوراخ کے سامنے حضرت عمرؓ شمع رسالت کے پروانے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد خلیفہ ثانی ہیں۔

سب سے پہلے بعد ادب واحترام یہ کلمات ادا کیے۔

اَلصَّلٰوۃ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ

وَالصَّلٰوۃ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَانَبِیَّ اللّٰہِ

اَلصَّلٰوۃ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَاحَبِیْبَ اللّٰہِ

اَلصَّلٰوۃ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَاخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ

اَلصَّلٰوۃ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَحْمَۃَ الِّلْعَالَمِیْنَ

بڑے سوراخ سے ذرا دائیں جانب ہٹ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں سلام عرض کیا: السلام علیک یا سیدنا ابا بکر صدیقؓ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سلام عقیدت پیش کرنے کے بعد ذرا دائیں طرف سرک کر دوسرے چھوٹے گول سوراخ کے سامنے آ کر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو اس طرح سلام عرض کیا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَاسَیِّدِ نَا عُمَرُ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ملک صاحب نے ''سفرِ آرزو'' میں عقیدت اور علمیت کے جو موتی بکھیرے ہیں ان گوہر پاروں کے چند اقتباس بطور مشتے از خروارے حوالہ بنائے ہیں۔ ساری کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ خاص طور پر ان حضرات کے لیے جو حج یا عمرے کی سعادت کرنے کے آرزومند ہیں۔

میں نے ''سفرِ آرزو'' سے مراقبے کا ایک طریقہ اخذ کیا ہے جن اصحاب نے روضہ کی جالیوں کا نظارہ کیا ہے وہ روضے کے بڑے سوراخ پر چشم باطن جما کر آنکھیں بند کرلیں اور ادب

واحترام سے درود شریف کا ورد کریں۔یکسوئی کا دورانیہ بڑھاتے چلے جائیں اس عقیدت و احترام سے جلد حضوری حاصل ہو گی۔ان شاء اللہ!

جن حضرات کو ابھی یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی وہ روضے کے گنبدوں پر نظر جما کر مراقبہ کریں اور درود شریف کا ورد کریں،ان شاء اللہ سفر آرزو کی آرزو بھر آئے گی۔

☆☆☆

عبدالقیوم

مکان نمبر 856، آر محلہ عید گاہ

نزد کلی مسجد۔ اٹک شہر

الحاج محترم ملک مقبول احمد صاحب!

میرے مطالعے میں آئے حج سفرناموں میں کچھ میں مجھے مصنف کے جذبات، خیالات اور تاثرات کی تہہ میں احساسِ برتری کی جھلکیاں زیادہ اور اس مقدس فریضے کے ذکر میں خشوع وخضوع کی کمی محسوس ہوئی۔ حتیٰ کہ کہیں کہیں طنز کی تلخ لہروں نے چونکایا بھی! آدمی سفرِ حج کی نیت سے گھر سے روانہ ہوتا ہے تو پھر وہ اپنی دنیاوی حیثیت کو یکسر فراموش کر کے، طبیعتوں کی جولانی اور مزاج کی گرمی کو تج کر، خود کو ایک نئے روپ یعنی ایک عاجز و مسکین اور گناہ گار بندہ تصور کرنے لگتا ہے اور حج تو کیا ہی اس لیے جاتا ہے کہ بندہ حضور ﷺ کی نگری میں جا کر اللہ تعالیٰ سے پیغمبر آخرالزماںؐ کا اُمتی ہونے کے صدقے، نہایت انکساری اور خلوصِ دل سے معافی کا خواستگار ہو کر اپنی کوتاہیوں، عاجزی انکساری اور خلوص دل سے معافی کا خواستگار ہو کر اپنی کوتاہیوں نادانیوں، نافرمانیوں اور گناہوں کا اقرار کر کے نجات کا طالب اور آئندہ کے لیے مالکِ دو جہاں کی ہدایت اور گناہوں سے بچنے اور شیطان سے پناہ مانگنے کا سوالی بنتا ہے۔

"سفرِ آرزو" میں مصنف نے ایک سچے اور مکمل حاجی کے روپ میں خود کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو ایک "مکمل ہدایت نامہ حج وعمرہ" بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ مصنف نے ہر زاویئے سے حج کے مناسک، مقتضیات اور اصل روح کو بڑی عرق ریزی سے نہایت احسن طریقے

سے بیان کیا ہے اس کتاب کا توجہ اور انہماک سے مطالعہ کرنیوالے پر سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ حج کا تمنائی بن جاتا ہے، دوران مطالعہ اگر کوئی خیال ہی خیال میں خود کو ''حاجی'' تصور کرنے لگے تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ مجھ جیسے گناہ گار پر یہ کیفیت ''سفرِ آرزو'' ہی کے مسلسل مطالعہ کرنے کی وجہ سے ایسی طاری ہوئی کہ جیسے میں بذات خود حج مقدس کا فریضہ ادا کر رہا ہوں۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی اور حج کی سعادت، مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ شریف کی سرزمین کی زیارت سے محرومی نے آبدیدہ کر دیا۔

جناب ملک مقبول احمد نے ''سفرِ آرزو'' کو اپنے ہی مخصوص اسلوب میں بڑی روانی اور سادگی سے سپردِ قلم کیا ہے ویسے تو انہوں نے بھی کہیں تنقید سے کام لیا، کہیں گراں گزری حالت پر پر تاسف لہجہ بھی اختیار کیا، کہیں افسانوی نہیں، حقیقی خوب صورت منظر کشی کی، کہیں رقتِ قلب نے انہیں ماضی کی تاریخ کھنگالتے ہوئے آبدیدہ بھی کیا اور دو تین جگہ مزاح کی چند سطور نے مسکراہٹ آشنا بھی کیا۔ چونکہ انؒ کا حج سفرناموں کا مطالعہ کسی حد تک اچھے خاصے تناظر کا حامل ہے لہٰذا انہوں نے بیت اللہ، چاہِ زم زم، مسجد الحرام، صفا و مروہ مختلف مساجد، غزوہ احد، غزوہ خندق، حضرتِ حمزہ کی تڑپا دینے والی شہادت، ہندہ کا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے کا درندگی کی حامل سفاکانہ حرکت، غارِ ثور، غارِ حرا، جبلِ نور، قربانی، جمرات وغیرہ کا اتنے واضح اور درست پس منظر کے حوالوں سے اختصار کے ساتھ لفظوں کی زبان دی ہے کہ ان کو تاریخی لحاظ سے کامل سچ کا درجہ عطا کرنے میں پس وپیش کی گنجائش نہیں اور پھر خطبہ حجتہ الوداع کا مکمل متن جسے اس فانی دنیا کا اول و آخر جامع منشور انسانیت کا درجہ ہمیشہ حاصل رہے گا، حج سفرنامے کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے مصنف نے ایسے تاثرات کو بھی نہیں چھپایا جس کو ناپسندیدہ خیال کیا لیکن ہر جگہ نرم اور سبک لہجے کو قائم رکھا ہے۔ تلخی کا شائبہ تک کہیں نظر نہیں آتا پھر مناسب دعاؤں اور ان کے ترجمے کے ذریعے انہوں نے اس حج سفرنامے کو انتہائی کارآمد بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حج جیسے مقدس فرض کی ادائیگی

کے دوران ''مزاح'' کا گزر بہت کم راہ پاتا ہے لیکن مصنف نے دو تین مقامات پر مزاح کی چاشنی کو اتنی خوب صورتی سے سمویا ہے کہ لبوں پر تبسم کی ہلکی ہلکی لہریں نمودار ہو جاتی ہیں جیسے (ص، ۵۰) مکّہ معظمہ کی حدود میں داخل ہونے پر جب بس مکتب نمبر ۱۳ کے سامنے کھڑی ہوگئی تو:

> ''معلم کے ایک کارندے نے ڈرائیور سے تمام پاسپورٹس وصول کر لیے اور مزید تسلی کے لیے ہر ایک حاجی سے اس کا نام اور اس کی اہلیہ کا نام وغیرہ پوچھ رہا تھا ایک حاجی سے پوچھا تمہاری بیوی کا کیا نام ہے، اس نے جواب دیا ''بیوی''۔ کارندے نے دو تین مرتبہ اس سے پھر پوچھا، اس نے پھر وہی جواب دیا کہ ''بیوی'' کارندے نے تنگ آ کر اس کے پاسپورٹ کو غور سے پڑھا تو اس پر بھی اس کی بیوی کا نام ''بیوی'' لکھا ہوا تھا وہ مسکرا کر چپ ہو گیا''۔

اسی طرح ہلکے پھلکے تنقیدی لہجے کو میٹھے اور دھیمے اسلوب میں برتنے کی وجہ سے ان کے لفظوں میں تیزابیت راہ نہیں پاتی جبکہ تنقید میں لہجے کی سختی کو روکنا اکثر دشوار ہوتا ہے ذیل کی چند بظاہر تلخ سطور میں بھی، اس مقدس فریضے میں انسانی فطرت کا ٹیڑھا پن نظر آ جاتا ہے جبکہ احتیاط کا تقاضا ہوتا ہے کہ دوسروں کو تکلیف دینے سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ (ص، ۸۹)

> ''معذور زائرین کو چار حبشی پالکی میں بٹھا کر بیت اللہ کا طواف کراتے ہیں یہ حبشی بڑے تیز چلتے ہیں اور دیگر طواف کرنے والوں کے لیے بڑی تکلیف کا باعث بنتے ہیں''۔

ان افریقی حبشیوں کے بارے میں (ص، ۲۸۴) آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جب ہم شیطان کو کنکریاں مارنے کے لیے پل پر سے گزرتے ہوئے جا رہے تھے تو ہجوم میں دھیمے سے قد آور حبشی حجاج کا ایک ریلا آیا (جو لوگ حج بیت اللہ کر چکے ہیں وہ جانتے

ہیں کہ حج کے لیے آئے ہوئے حبشی مرد اور خواتین کس طرح منظم ہو کر مناسک حج ادا کرتے ہیں دوسرے ممالک کے لوگ خود بخود ان کی راہ چھوڑ دیتے ہیں ایسی ہی کیفیت بیماروں اور معذوروں کو پالکیوں میں طواف کرانے والوں کی بھی ہوتی ہے)

اسی صفحے پر ان حبشیوں کی غیر ذمہ دارانہ تیز رفتاری کی وجہ سے مصنف کو زندگی کے لالے پڑ گئے لیکن قدرت نے ان کو محفوظ رکھا۔ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس ریلے سے بچنے کی کوشش تو کی لیکن میں ان کے ساتھ ٹکرا جانے سے نیچے گر گیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے لیکن میری یہ سوچ غلط تھی۔ میرا آخری وقت ابھی نہیں آیا تھا میری حفاظت پر مامور فرشتوں نے مجھے اس طرح سنبھالا کہ منیٰ کے میدان کے فرش پر چت گرنے اور کچلے جانے سے پہلے ہی میں کھڑا ہو گیا تھا جبکہ منیٰ کے طوفانی ریلوں میں گرے ہوئے حاجی کے کھڑا ہو جانے کی روایت ہی نہیں ہے میرا گر کر اٹھ جانا اور پھر میری جان کا بچ جانا ایک وقت میں قدرت کے دو معجزے تھے (الحمد اللہ)''

مصنف نے ۲۰۰۲ء میں جس ''حج و عمرہ سروسز'' کے ذریعے دوسرا حج کیا تھا، ان کی بدسلوکی (ص ۲۹۱) اور وعدہ خلافی کو دکھتے دل سے بیان کیا ہے (جبکہ اب تو ایسی بدسلوکی سے واسطہ تقریباً ہر پاکستانی حاجی کو پڑتا ہے حکومتی اہلکاروں کی چیرہ دستیاں اس پر مستزاد ہیں):

> ''نجی ادارے نے ہمیں حرم شریف سے کافی دور عزیزیہ میں ٹھہرایا تھا ہم سے الگ الگ بھاری رقمیں وصول کی تھیں لیکن مکہ معظمہ جا کر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا اور خاصی بدسلوکی کا مظاہرہ کیا۔ کئی لوگوں کو تو کمروں میں جگہ نہ ملی اور وہ مارے مارے پھرتے رہے

لیکن حج ایجنٹ کے کان پر جوں تک نہ رینگی"۔

اس تنقید کے فوراً بعد مصنف نے ہلکے پھلکے مزاح کا دلچسپ عنصر یوں شامل کیا ہے (ص،۲۹۱)

"ایک روز میں باہر جانے کے لیے کمرے سے نکلا تو یونس صاحب کی بیگم نے میری اہلیہ خورشید سے کہا کہ وہ دیکھو! دولہا میاں آ رہے ہیں یہ دل کش بات سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا اور بیگم یونس کے دل سے دعا نکلی جس نے میری شادی کے دن کی تجدید کر دی تھی مجھے اپنا بڑھاپا بھی عزیز محسوس ہوا کہ اس عمر میں بھی مجھے کوئی دولہا کہہ رہا تھا"۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ تنقید، مزاح کے فوراً بعد مصنف نے (ص ۲۹۲) دکھ کی لہروں کو موجزن کر کے قاری کو دل گرفتہ بھی کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

"اس دوسرے حج کے دوران ہم ٹیکسی لے کر جنت المعلیٰ فاتحہ خوانی کے لیے گئے تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سب قبروں کا نام ونشان مٹا دیا گیا تھا۔ سامنے صرف ایک چٹیل میدان تھا مجھے بڑی مایوسی ہوئی سعودی حکومت نہ جانے کیوں بزرگوں کے سارے نشانات مٹاتی جا رہی تھی۔"

۱۰ ذوالحجہ کو مزدلفہ کی رات کی منظر کشی مصنف نے کتنی خوب صورتی سے قلم بند کی ہے (ص،۲۸۱)

"مزدلفہ کی رات کا منظر بھی نا قابل فراموش ہے مغرب اور عشاء کی نمازوں کو اکٹھے پڑھنا، رات کی تاریکی میں ٹارچ کی روشنی میں موٹے چنے کے برابر ستر (۷۰) کنکریوں کا چننا، اور تا حد نگاہ

تک حاجیوں کے کھلے آسمان تلے اور غیر ہموار سخت ریتلی اور کنکریوں سے بکھری زمین پر چٹائیوں پر لیٹنا، حاجیوں کا چھوٹے چھوٹے اسٹالوں سے چائے یا ٹھنڈے مشروبات کا خرید کر دینا چند ایک حاجیوں کا قرآن شریف کی تلاوت کرنے کا منظر اور پہاڑیوں پر چند جگہوں پر ہلکی ہلکی روشنی، اور پر آسمان پر کمان نما چاند اور چمکتے ستاروں کی جھلمل اور نیچے مزدلفہ کے میدان میں جگہ جگہ ایستادہ کھمبوں پر لگے بجلی کے قمقموں کی روشنی ایک دوسرے کے ساتھ ہم کلام ہیں آسمان کے ستارے اور زمین کے ستارے اللہ ربّ العزت کی ثنا سے جگمگا رہے ہیں۔ بارانِ رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ ان سلی دو سفید چادروں میں ملبوس، ننگے سر اور پاؤں میں ادنیٰ سی چپل پہنے حاجیوں کے چہروں پر نور کی کرنیں برس رہی ہیں میں چشم تصور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا یہاں قیام کرتے دیکھتا ہوں تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں کہاں وہ اور کہاں میں، اللہ اللہ، آج اس ویرانے میں تقدس سے معمور ہے مجھے بھی کھلے آسمان تلے رات بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور دنیاوی معاملات کے بارے میں کافی وشافی مواد "سفر آرزو" میں موجود ہے۔ مصنف نے غزوہ احد اور غزوہ خندق کو بیان کیا ہے لیکن انہی میں جنگ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ کے لیے تیاری، حکمت عملی، جنگ میں نقصان سے بچنے کی تدابیر اور مقابلے میں کمزور پڑنے پر احتیاطی روّیے کے تحت لڑنے یا پیش قدمی کی بجائے بچاؤ کی حکمتِ عملی یہ سارے جنگ وجدل سے وابستہ تدابیر کا بیان مزید اپنے مشورے کے اظہار کے بعد ساتھیوں سے مشورے اور متفق ہو کر قدم اٹھانا اور پھر

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی سے فتح کے لیے دعا وغیرہ۔ یہ سب ثابت کرتے ہیں کہ ابتدائی دور میں مسلمان کتنے اتفاق اور یکجہتی سے دین اسلام کے لیے سینہ سپر ہوا کرتے تھے۔
''سفرِ آرزو'' میں نعیم ابن مسعود کی ڈپلومیسی اور جنگ کا پانسہ پلٹنے کی ہنر مندی کی حامل تدابیر نے ''جاسوسی'' کے نظام کو کتنی اہمیت دی تھی ان سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب اسلام قبول کرلیا تھا تو انہوں نے حضرت بلال حبشی کو جو کفار سے آمنا سامنا ہونے کی وجہ سے احتیاطاً مسجد کے اندر اذان دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لاتے ہی انہوں نے حضرت بلال حبشی کو مسجد کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کی جرأت دلائی تھی اور جب کفارِ مکہ بھرے ہوئے اعتراض کرنے آئے تو حضرت عمر فاروقؓ نے ان کے سامنے سینہ تان کر کہا تھا کہ آئندہ اسی طرح اذان دی جائے گی تو وہ سہم کر چلے گئے تھے یہ دین اسلام کے ابتدائی دنوں کا پہلا اہم ترین موڑ تھا جبکہ دوسرا اہم موڑ میرے خیال میں نعیم ابن مسعود کی کامیاب جاسوس حکمتِ عملی کا تھا۔
''سفرِ آرزو'' میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے معاشی، معاشرتی، رہن سہن، خرید و فروخت کے بازاروں، دستکاری کے نمونوں کا بیان کافی معلومات افزاء ہے سب سے زیادہ لطف تو کھانوں کے بیان میں آتا ہے مصنف نے منہ میں پانی بھرلانے والے کھانوں کا ذکر ایسے بھولپن سے کیا ہے کہ پیٹ میں بھوک ہلچل مچا دیتی ہے، لیکن جہاں مذکورہ بالا دلچسپ بیان قاری کو لطف اندوز کرتا ہے وہیں ناخوشگوار واقعات سے طبیعت منغض بھی ہوتی ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے جیسے (ص،۲۱۸) ذیل کی سطور میں بیان کیا گیا ہے:

> ''ہماری صفوں کے درمیان بعض چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے بچے کوئی دس بارہ سال کی عمر کے، مگر ہاتھوں سے محروم، اپنی ٹنڈ منڈ کہنیوں کو عریاں کیے ہوئے بیٹھے بیٹھے چلتے ہوئے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ایک ترکی خاتون نے میری بیگم کو روتے ہوئے اپنا پیٹ

دکھایا کہ کس طرح جیب کترے نے، اس کی جیب کاٹنے کے لیے
بلیڈ سے اس کا پیٹ بھی چاک کر دیا اور وہ لہولہان ہو کر فریاد کر رہی تھی
ایک دفعہ طواف کے دوران میری جیب سے ہاتھ ڈال کر کسی نے
نقدی نکال لی تھی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی اور ہر دوسرے تیسرے دن
پتہ چلتا تھا کہ دو تین مجرموں کا سر قلم کیا جا رہا ہے اتنی سخت سزاؤں
کے باوجود لوگ یہاں بھی جرم میں ملوث ہوتے ہیں۔''

یوں تو ''سفرِ آرزو'' میں غم واندوہ کے باعث دل کو گرفت میں لے کر نچوڑنے والے چند المیہ ترین واقعات موجود ہیں جیسے حضرت امیر حمزہؓ کی شہادت اور ان کی لاش مبارک سے انتہائی ظالمانہ درجے کا ناقابل یقین درندگی کا سلوک اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ احد میں شدید زخمی ہونا اور دندان مبارک کا شہید ہونا۔ لیکن جو دکھ اور غم کی لہریں قاری کو بے چینی کے پاتال میں پہنچا دیتی ہیں اور وہ مستقبل کے حوالے سے اس بھیانک خدشے میں مبتلا ہو کر اذیت ناک ذہنی افراتفری میں مبتلا خود کو تصور کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدانخواستہ کسی دن اس مقدس قبرستان جنت المعلیٰ کو بھی ''نئی روشنی'' کی بھینٹ چڑھا کر مسلمانوں کی تاریخ کے صفحات کالے کر کے انہیں خون کے آنسو رلانے پر مجبور نہ کر دیں۔ پوری کتاب میں ان چند سطور کے اندر جھانکتا ہوا دکھ حساس قاری کو اس اندھیری سرنگ میں لے جاتا ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے سب سے زیادہ قابل افسوس صورت حال مجھے اپنی چند سطور میں پنہاں نظر آتی ہے جیسے ہندو لاش کو جلاتے یا پھر گنگا کے سپرد کر دیتے ہیں مغرب میں اب اکثر قبروں میں دفن کرنے کی بجائے آگ کی بھٹی میں Cremation کے ذریعے لاش کو جلا کر اس کی راکھ ٹھنڈی ہونے پر دوسرے دن متعلقہ وارث کے حوالے کر دیتے ہیں۔

بہر حال اس جائز خدشے کی حامل دل کو دہلا دینے والی چند سطور (ص، ۲۱۶) ملاحظہ ہوں:

''جنت البقیع کے بعد مکہ مکرمہ میں جنت المعلیٰ کو بڑا مقام حاصل

ہے اس عظیم قبرستان میں چھ ہزار سے زائد صحابہ کرامؓ آسودۂ خاک
ہیں اسی قبرستان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے صاحبزادے
قاسمؓ دفن ہیں وہ قبرستان ہے جہاں مسلمانوں کی افضل ترین ماں
حضرت خدیجہ الکبریٰ ابدی نینڈ سورہی ہیں۔ یہ قبرستان محلہ شاہد کے
قریب ہے اس جگہ خواتین کا داخلہ منع ہے اس قبرستان کے چہار
اطراف کوتاہ دیواریں ہیں۔ قبریں صرف پتھروں سے پہچانی جاتی
ہیں یہاں قبرستان کو کسی سلیقہ اور قرینہ سے قائم نہیں رکھا ہوا ہے کہا
جاتا ہے کہ (یہ ان حجاج کرام کے بارے میں ہے جنہیں فوت ہونے
کے بعد یہاں چند ماہ کے لیے دفنا دیا جاتا ہے اور پھر) ایک قبر میں کئی
کئی بار مردوں کو دفنایا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد لاش کو کسی کیمیکل
کے ذریعہ ختم کر دیا جاتا ہے کہ دوسرے مردوں کے لیے جگہ بن
سکے۔ قبرستان کے آخری حصہ میں ایک سبز رنگ سلاخوں والا جنگلہ
ہے۔ اسی جنگلہ کے اندر اپنے وقت کی امیر ترین اور عفت مآب
خاتون حضرت خدیجہ الکبریٰؓ ابدی نیند سورہی ہیں۔"

"سفرِ آرزو" لکھ کر جناب ملک مقبول احمد نے صحیح معنوں میں اردو ادب کے اہم سفرنامہ نگار کا خود کو حقدار ٹھہرالیا ہے کہ یہ صرف حج وعمرہ کے ذکر سے معمور نہیں بلکہ اس میں ہماری تاریخ، حیرت انگیز واقعات، شاندار روایات اور دیگر قیمتی معلومات کا خزانہ سمو دیا گیا ہے۔

☆☆☆

ہفت روزہ فیملی

علی سفیان آفاقی

ملک مقبول احمد نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ایک ناشر کی حیثیت سے کیا تھا۔ اپنی دیانتداری اور حسن سلوک کے باعث بہت جلد انہوں نے نہ صرف لکھنے والوں کا اعتماد حاصل کر لیا بلکہ ایک بہت بڑا امتیاز ادارہ بھی قائم کر لیا۔ انہوں نے ایک گاؤں میں جنم لیا تھا۔ نصابی تعلیم کے معیار سے ڈگریاں بھی حاصل نہیں کی تھیں لیکن مشاہدے، تجربے اور خداداد صلاحیتوں نے انہیں اپنی زندگی کے حالات لکھنے پر اکسایا۔ ان کی پہلی کتاب ہی آپ بیتی نے ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔ انہوں نے سادہ، عام فہم اور آسان زبان میں اپنی زندگی کے حالات، واقعات، مشاہدات اور تجربات پیش کیے۔

اس پہلی تصنیف کی بے پناہ پذیرائی نے انہیں مزید لکھنے کی طرف مائل کیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ وہ ناشر سے زیادہ صاحبِ قلم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہیں لکھنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ یہ زیرِ نظر پاکیزہ تصنیف ان کے سفرِ حج کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تین بار حج اور متعدد بار عمرہ کرنے کے مواقع عطا کیے۔ ان کے ذہن میں کافی مواد اکٹھا ہو چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے روحانی سفروں کو کتابی صورت دینے کا فیصلہ کیا جو آج ''سفرِ آرزو'' کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

☆☆☆

سیاحت نامہ ترکی

◆◆

فہرست

..........o...........

ڈاکٹر انور سدید

سیاحت نامۂ ترکی

ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' لکھی تو اہل ادب نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا کہ وہ شخص جو صرف کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام کرتا تھا' اب ہمارے سامنے ایک مصنف کی حیثیت میں موجود تھا۔ ان حیرت زدہ اصحاب میں یہ ناچیز انور سدید بھی شامل تھا۔ جسے کئی برس پہلے ملک مقبول احمد مُلک کے دوسرے بیشتر ناشرین سے مختلف نظر آئے تھے۔ میں یہ لکھ چکا ہوں کہ برادرِ عزیز اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' نے ملک صاحب سے میرا پہلا تعارف کرایا تھا۔ اظہر جاوید صاحب اور ان کی سفارش پر انہوں نے میری کتاب ''دلی دُور نہیں'' بلا تامل اشاعت کے لئے قبول کر لی اور پھر میرا ہاتھ ایک قلم کار کی بجائے ایک دوست کی حیثیت میں تھام لیا تو مجھے ان کا یہ عمل غیر معمولی نظر آیا تھا۔ پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ادبی امور اور قلم قرطاس کے قواعد و ضوابط سے بھی آشنا ہیں۔ مصنفین سے ملاقاتوں اور کتابوں کے مطالعے نے ان کے خیالات کو وسعت دی۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری پڑھی تو معلوم ہوا کہ وہ رسالہ ''چودھویں صدی'' بھی نکالتے رہے ہیں' جس کے سرورق پر ان کا نام ایم۔اے ملک چھپتا تھا۔ یہ مکمل نام اس ادیب کا تھا جس سے ملک مقبول احمد خود بھی آگاہ نہیں تھے اور جب وہ اس سے آگاہ ہوئے تو ان کے باطن سے وہ ادیب نمودار ہو گیا جو ایم۔اے ملک

کے پردے میں نہاں تھا۔ تاہم میرا خیال یہ بھی ہے کہ اس ادیب کی دریافت کا سہرا جناب ڈاکٹر صفدر محمود' جناب علی سفیان آفاقی' جناب ڈاکٹر طارق عزیز وغیرہ کے سر ہے' جنہوں نے ''سفر جاری ہے'' کے پیش لفظ لکھے اور اس کتاب کی سادہ بیانی کو ادبی اظہار سے تعبیر کیا' یہ کتاب چھپ کر منظر عام پر آ گئی تو متذکرہ اصحاب کے بیان کی تصدیق و توثیق بے شمار ادیبوں نے کی۔ ان تبصروں سے ایک نئی کتاب ''پذیرائی'' معرضِ وجود میں آ گئی' جو ایک طرف ملک مقبول احمد کے ''مؤلف'' ہونے کا اثبات کرتی ہے تو دوسری طرف انہیں ہمارے سامنے بطور ایک تعارف نگار بھی لاتی ہے' اس کتاب میں ادیبوں کا چند سطری تعارف ان کی ''قلم کاری'' کا امتیازی نشان قرار دیا جا سکتا ہے۔

''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے ایک باب اپنے سفر حج پر بھی باندھا ہے اور یہ ان کے سفر عقیدت کا قیمتی ثمر ہے۔ اس سفر کے دوران ہی انہیں اس مقامِ مقدس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جہاں ہجرت نبویؐ میں ناقۂ رسولِ اکرم ﷺ نے قیام کیا تھا۔ یہ مقام حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کے مقابل تھا جنہیں میزبانِ رسول ﷺ بننے کا شرف حاصل ہوا' انہوں نے اپنی زندگی میں شفقت نبوی ﷺ سے بے کراں فضیلتیں سمیٹیں اور اصحاب الشجرہ میں شمار ہوئے۔ ان کے کارناموں سے تاریخ اسلام کے اوراق منور ہیں۔ اسّی برس کی عمر میں جہاد کے لئے قسطنطنیہ گئے اور جہاد کے دوران ہی وفات پا گئے تو ان کی تدفین اس شہر میں کی گئی۔

مدینہ منورہ کے سفر کے دوران ملک مقبول احمد کو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے حالاتِ حیات سے شناسائی ہو گئی تھی اور ان کے مرقد مقدس کی زیارت کی خواہش اس وقت زور پکڑ گئی جب ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ارشد مقبول ایک سفر میں یہ فریضہ استنبول میں ادا کر کے وطن واپس آئے تھے اور دوبارہ جانے کے لئے پر تول رہے تھے۔ ملک مقبول احمد کا

''سیاحت نامہ ترکی'' اس پاکیزہ خواہش ہی کی تکمیل ہے۔

یہ سیاحت نامہ متعدد زاویوں سے متاثر کرتا ہے:

(۱) یہ کہ اس میں ملک مقبول احمد کی عقیدت کا قیمتی عنصر شامل ہے۔

(۲) اس میں کوئی کاروباری غرض شامل نہیں۔

(۳) انہوں نے جغرافیے کے ساتھ ترکی کی تاریخ میں بھی سفر کیا ہے۔

(۴) اس سفرنامے میں ان کی ذات کا عنصر شامل ہے۔

(۵) انہوں نے گردوپیش کو بھی پوری اہمیت دی اور ترکی کو چشم بیدار سے دیکھا ہے۔

(۶) ایک سیاح کی حیثیت میں انہوں نے مسافرت کے احساس کو زندہ رکھا اور ہر منظر کو اپنے دل میں بسالیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اس سفر عقیدت پر روانہ ہوئے تو اپنے ''کتاب بازار'' میں اور بیرونِ لاہور دوستوں میں سے کسی کو خبر نہ ہونے دی...... پھر موبائل پر سب سے رابطہ قائم رکھا تو سب یہی سمجھتے رہے کہ ملک صاحب گھر پر استراحت میں ہیں، لیکن واپسی پر تحائف تقسیم کرنے لگے تو یہ حقیقت کھلی کہ وہ ایک اور سفر عقیدت کر آئے ہیں۔ اب احباب نے اس مصنف کو آواز دینی شروع کی جو ''سفر جاری ہے'' میں ان کے باطن سے باہر آ گیا تھا۔ یہ ''سیاحت نامہ'' انہوں نے اپنے احباب کی فرمائش پر لکھا ہے تو مجھے یہ خوشی ہے کہ انہوں نے اپنے مشاہدات کو کتابی صورت میں تحفظ فراہم کر دیا ہے اور قارئین کو ان مناظر کو بچشم خود مطالعہ کرنے کا موقعہ دیا ہے، جن تک ان کا پہنچنا ممکن نہیں تھا، اس سیاحت نامے پر عقیدت غالب نظر آتی ہے تو مشاہدے کی نیرنگیاں بھی متاثر کرتی ہیں۔ جغرافیے کے سفر میں ترکی کی تاریخ اپنے اوراق کھولتی چلی جاتی ہے، لیکن واپسی کا سفر کچھ عبرت ناک مناظر بھی سامنے لاتا ہے اور ملک صاحب ہمیں اپنے دُعائیہ کلمات میں بھی شامل کر لیتے

ہیں۔ مجموعی طور پر یہ سیاحت نامہ...... مقامِ مقدسہ کی زیارت سے منسلک ہے' لیکن اس میں جدید ترکی کا وہ چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے جو بیسویں صدی کی پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلسل تغیر کی زد میں رہا ہے اور اب بھی نئے تحرک و حرارت کو عمل میں لا رہا ہے...... مجھے یقین ہے کہ اہل ادب اس سیاحت نامے کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

پروفیسر جمیل آذر
مکان نمبر 17 لین نمبر 3، عسکری 9
چکلالہ۔ راولپنڈی

استنبول کا کولمبس

میں اکثر سفرناموں اور آپ بیتیوں کو پڑھنا پسند نہیں کرتا، البتہ دوستوں کے سفرناموں اور آپ بیتیوں کو ضرور پڑھتا ہوں اور اپنی پسند یا ناپسند کا اُن سے اظہار بھی کر دیتا ہوں...... پچھلے دنوں میرے ایک دوست نے اپنی آپ بیتی لکھی اور کتاب کی شکل میں مجھے تحفے کے طور پر بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اِس پر تبصرہ بھی سپردِ قلم کروں...... اب جو کتاب کی ورق گردانی شروع کی تو کئی صفحات پر تو اُن کے آباؤ اجداد، رشتے دار اور نہ جانے کتنے بچپن کے گاؤں والے دوست قبضہ جمائے بیٹھے تھے...... بس دو چار صفحے پڑھ کر ہی دِل اُکتا گیا، اِسی طرح ایک صاحب نے اپنا سفرنامہ ارسال کیا...... اُس کتاب کے بھی چند صفحات پڑھنے کے بعد کچھ ہاتھ نہ آیا...... سفرنامہ ہو یا آپ بیتی یا کوئی اور کتاب اس کی خوبی یہ ہونا چاہئے کہ جونہی آپ اِسے پڑھنا شروع کریں تو کتاب خود کہے کہ ''آپ مجھے مزید پڑھیں، میں یقیناً آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ کروں گی'' مجھے ہر وہ کتاب پسند آتی ہے جو میرے علم میں اضافہ کرے...... میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ جب مجھے ملک مقبول احمد صاحب نے اپنی کتاب ''سیاحت نامۂ ترکی'' کا مسودہ میری رائے کے لئے ارسال کیا تو اِسے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اِس کتاب نے میرے علم میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، اس سے بڑھ کر کسی کتاب کی اور کیا خوبی ہو سکتی ہے۔

میں ترکی سے پہلے سے اسی طرح واقف تھا جس طرح دُور سے میں ایران، افغانستان یا عراق سے تھا، لیکن میرا ترکی سے قریبی تعارف ملک مقبول احمد کی کتاب ''سیاحت نامۂ ترکی'' سے ہوا ہے۔ میں ہی نہیں بلکہ ہر شخص اِس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ خواہش کرے گا کہ وہ کہیں جائے یا نہ جائے ترکی ضرور جائے...... شمال میں بحرا سود، جنوب میں بحرِ روم اور مغرب میں بحرِ ایجین کے تین سمندروں میں گھرا ہوا یہ خوبصورت ملک جنتِ ارضی ہے جس کے ساحلوں سے، فیروزی نیلگوں پانیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے دُنیا بھر کے سیاح کھنچے کھنچے چلے آتے ہیں...... ملک مقبول احمد نے بڑی جامعیت کے ساتھ ترکی کے نیلے سمندروں، نرم ریتلے ساحلوں اور پانیوں پر تیرتے خوبصورت بجروں، ساحلوں پر آباد نفیس پُر آسائش تابستانی مکان اور ساحل سمندر پر حسن کی جلوہ آرائی کو بڑی نفاست اور سلیقہ سے قلمبند کیا ہے۔ اِن پُرکشش چیزوں کے بارے میں پڑھ کر ہر اہلِ دل اور فہم جو وہاں جانے کی خواہش کیئے بغیر نہیں رہ سکتا، ملک صاحب اپنے اسلوب میں کہیں بھی بے جا طوالت کا شکار نہیں ہوئے...... دیکھئے ساحلِ سمندر پر بنے مکانوں اور رہائش گاہوں کا ذکر وہ اِس طرح کرتے ہیں:

> ''......لیکن آج اِس ساحل کے ساتھ ساتھ خوبصورت تابستانی مکانوں کی قطاریں، جہاں دولت مند ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کے لئے رہائش پذیر ہیں، جنگلات اور مچھیروں کے دیہات پُرکشش ارضی نظارے پیش کر رہے ہیں...... دولت مند لوگ اپنی چمکدار رنگ شدہ لکڑی کی کشتیوں پر سوار ہو کر نیلگوں پانیوں کی سیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ امراء کے یہاں پتھروں سے بنے ہوئے پُر آسائش محل ہیں تو روساء کے خوبصورت لکڑی کے بنے ہوئے مینشن ہیں جنہیں یالٹ (Yalt) کہتے ہیں''۔

ساحلِ سمندر پر بنے ریستوران، کھانے اور رات کے حسن کا نقشہ وہ اِس طرح کھینچتے ہیں:

''ساحل سمندر پر چھوٹے چھوٹے بے شمار ریستوران ہیں جہاں چائے، کافی، پوٹیٹو چپس، تلی ہوئی مختلف اقسام کی مچھلی کی خوشبو آپ کو دعوتِ خورد و نوش دیتی ہے...... جوں جوں دِن ڈھلتا ہے اور رات کی چادر قمقموں کی روشنی میں جلوہ گر ہوتی ہے، اِن ریستورانوں میں رنگا رنگ کے پروگرام برپا ہونے لگتے ہیں۔ سیاح اِن ریستورانوں میں بیٹھ کر سمندر پر تیرتی کشتیوں، بجروں اور جہازوں کا ہی نظارہ نہیں کرتے بلکہ نیم برہنہ نگار ہائے فتنہ گر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ صحت مند بھرے ہوئے اجسام کے شیوخ اور اُن کی تنومند بیویاں کرسیوں پر بیٹھے قہوہ کی چسکیاں لیتے اور حقے پیتے بڑے اچھے لگتے ہیں...... ایک شام ہم بھی یہاں ایک ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ سٹیج پر ایک چھوٹا سا طائفہ میٹھی دُھنیں بجا رہا تھا...... بھلا ایسے دلکش ماحول کو دیکھ کر میرا پوتا بابر مقبول کیسے خاموش رہ سکتا تھا...... وہ فوراً اُٹھا اور سازندوں سے ایک ساز لے کر بجانے لگا...... لوگوں نے جی بھر کر اُسے داد دی اور اس کے فن کارانہ ذوق کو سراہا''۔

ملک مقبول احمد صاحب نے ترکی کے فن موسیقی پر آگے چل کر اِس طرح روشنی ڈالی...... ''ترکی موسیقی گزشتہ سو سال سے دُنیا کو متاثر کر رہی ہے، لیکن اب تو اِسے اپنی خوبیوں کی وجہ سے بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے...... دُنیا بھر کے سیاح یہاں آ کر ترکی موسیقی، رقص اور گانوں سے محظوظ ہوتے ہیں...... ترکی کا فطری علاقائی میوزک اپنے اندر بڑی تنوع رکھتا ہے...... تڑپا دینے والا پاپ میوزک، وجد آور صوفیانہ بانسری کی لے، دل چیرنے والا جاز اور کسی ٹیکسی ڈرائیور کی کیسٹ میں لگے ہوئے عربی غمناک گانے ترکی کے فنِ موسیقی میں دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے...... مجھے یاد ہے ساٹھویں کی دہائی میں جب آتش جوان تھا تو ترکی رقص و موسیقی کے طائفے پاکستان میں آتے تھے اور ہمارے سینما گھروں میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرتے تھے...... صوفی رسم کا میوزک دھیما اور بھاری ہوتا ہے...... یہ میوزک رقصِ درویش کے لئے آئیڈیل پس منظر کا کام کرتا ہے...... عربی موسیقی اناطولی ہے جو مغربی موسیقی کے برابر ہے۔ اِس میں جابجا اُن

دیہاتوں کے حسرت آمیز حوالے ہیں جنہیں لوگ شہروں میں دولت کمانے کی خاطر اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں......"

ملک صاحب نے بالتفصیل ترکی فنِ موسیقی پر گفتگو کی ہے۔محولہ بالا سطور میں ہلکی سی جھلک ہے جو میں نے نقل کی ہے...... میں نے اُوپر ذکر کیا ہے کہ ساحلِ سمندر پر ریستورانوں کا میلہ لگا ہوتا ہے جہاں طرح طرح کے ترکی کھانے دستیاب ہوتے ہیں......

ایک جگہ پر ملک صاحب نے مچھلیوں کا ذکر کچھ اِس طرح کیا ہے کہ مزہ آ گیا، آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

"انٹالیہ کی بندرگاہ پر ریستورانوں کا میلہ لگا ہے جہاں متنوع قسم کی مچھلیوں کے پکوان دستیاب ہوتے ہیں...... یہ ریستوران سمندری خوراک تیار کرنے کے ماہر ہیں۔ یہ بحری باس ہے...... یہ سرخ ملٹ ہے، یہ تلوار مچھلی ہے...... یہ سٹیو کی ہوئی مچھلی ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے...... ہمارے ہاں تو سامن، سنگھاڑا اور مہاشیر کا زیادہ چرچا ہے...... اللہ تعالیٰ نے سمندر میں ہزاروں قسم کی مچھلیوں کو تخلیق کیا ہوا ہے اور اِنسان اِن نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے...... رب کریم کا ان نعمتوں پر جتنا شکر کریں کم ہے"۔

کوئی شخص ترکی جائے اور خاص طور پر استنبول اور ترکی قالین نہ دیکھے ناممکن اور ملک مقبول احمد تو فطرتاً تاجر ہیں...... انہوں نے ترکی قالینوں کو دیکھا، پسند کیا اور گہرا مطالعہ کیا...... ان کے سیاحت نامہ سے قالینوں کے بارے میں چند ایک اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

"ترکی لوگ اِس بات کے دعویدار ہیں کہ ہاتھ سے بنی ہوئی قالین کی ایجاد ان کی میراث ہے۔ان کے دعویٰ کے مطابق ایشیائے کوچک سے آ کر سلجوقیوں نے اِس صنعت کو یہاں فروغ بخشا، لیکن ترکی لوگ جو اناطولیہ میں آ کر آباد ہوئے اُن کے مطابق انہوں نے اِس بدیسی صنعت کو نشوونما دی۔اُن کے آباؤ اجداد کا قالین بافی کا پیشہ پتھر کے زمانہ سے

جا ملتا ہے''۔

کسی قالین کی قیمت کا اندازہ اس کی موٹائی، نفیس بنت، رنگوں کے حسین امتزاج اور اِس پر کشیدہ منقش پیٹرن سے ہوتا ہے...... قالین کے نچلے حصہ کو دیکھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ نچلا حصہ ہی آپ کو نفاست وشفافیت اور ڈیزائن سے آگاہی بخشتا ہے''۔

قالین فروش گاہکوں کو کس طرح اپنی طرف راغب کرتے ہیں، قالین بیچنے کے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، اس کی تعریف وتوصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور پھر کس طرح زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی کوشش کرتے ہیں، اِن سب چھوٹی چھوٹی مگر اہم باتوں کو ملک صاحب نے نوٹ کیا اور ہمیں اپنے مشاہدے میں شریک کیا ہے، یہاں کہیں کہیں ادیبانہ چاشنی بھی پیدا کی ہے۔

''جب آپ کی جیب بھی ڈالروں سے بھری ہو، دل بھی جوان ہو اور آپ کی محبوبہ آپ کے ساتھ ہو جسے آپ ہنی مون منانے کے لئے ساتھ لائے ہیں تو پھر کس کافر کا دل نہ چاہے گا کہ محبوبہ کو خوش کرنے کے لئے اُسے قالین کا تحفہ دیا جائے......''۔

ادیبانہ رنگ تو ملک صاحب نے وہاں بھی بکھیرے ہیں جہاں انہوں نے ترکی کے سمندروں کا ذکر کیا ہے...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کے سمندروں میں ایک طلسم ہے جو آدمی کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے، جس سے نکلنا بہت مشکل ہے، اِس سحر اور تحیر کو مندرجہ ذیل سطور میں ملاحظہ کیجئے:

''......اِن ساحلوں پر کھیل کود، چہل پہل، سیر وتفریح، وجد آور مسرت اور سنسنی خیزی کی بے بہا دولت ملے گی۔ اِس مسرت کو سمیٹنے کے لئے دُور دراز کے سیاح یہاں آتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ لوگ اپنی دُنیاوی تھکاوٹ، ذہنی پریشانی اور جسمانی تکلیفوں کو ترکی کے ساحلوں،

سمندروں اور فطری نظاروں کی صحبت میں رہ کر ہلکے پھلکے اور شادمان ہو جاتے ہیں۔ یہاں آپ کو لمبے بنچوں پر ننگ دھڑنگ مرد اور عورت ہلکی سی ستر پوشی کے ساتھ سیدھے یا اُلٹے لیٹے نظر آئیں گے۔ کوئی خوبصورت سی خاتون اوندھے لیٹے، سر پر دھوپ سے بچاؤ کے لئے سفید یا نیلا ہیٹ پہنے کتاب پڑھنے میں مصروف نظر آئے گی۔ کہیں عورت اور مرد سیدھے چت لیٹے آنکھیں بند کئے آفتاب کی کرنوں اور سمندر کے فیروزہ رنگ پانی کی لہروں سے اُٹھتی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے فیض یاب ہوتے دکھائی دیں گے، سامنے سمندر پر تیرتے بجرے اور عقب میں دُھند کے مہین لبادے میں لپٹے چٹانی پہاڑوں کے سلسلے عجب بہار دیتے ہیں......"۔

ملک مقبول احمد نے ہمیں اُن تمام اہم تاریخی مقامات اور عمارات سے بھی متعارف کرایا ہے جو سیاحوں کی خاص دلچسپی کے مرکز ہیں...... جو بھی شخص استنبول جاتا ہے وہ توپ کاپی محل میوزیم، سلطان احمد پارک، نیلی مسجد، گرینڈ بازار، آیا صوفیہ اور جامع مسجد ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ضرور جاتا ہے...... ملک صاحب نے اِن قدیم عمارات کو تاریخی پس منظر کی روشنی میں دیکھا ہے اور بیان کیا ہے، یوں ان کا یہ سیاحت نامہ عام سفرناموں سے مختلف ہو جاتا ہے...... مثلاً: آیا صوفیہ کا تذکرہ اِس طرح کرتے ہیں۔

"سلطان احمد پارک کے پرلی طرف آیا صوفیہ ہے...... یہ منگل سے لے کر اتوار تک صبح ساڑھے نو بجے سے شام پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے...... اسے ھاگیہ صوفیہ، سانتا صوفیہ اور مقدس دانش کا چرچ (The Church of Holy Wisdom) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں سیر کرنے والوں سے فیس لی جاتی ہے...... یہ سربرآوردہ بازنطینی عمارت جو استنبول میں اب تک موجود ہے نہ صرف دُنیا کی نفیس ترین عمارات میں شمار ہوتی ہے بلکہ اہم ترین مقامات میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے...... یہ پُرشکوہ عمارت

جب سے تعمیر ہوئی ہے، سیاسی طور پر وجہ نزاع رہی ہے اور آج بھی ہے...... کبھی اِسے لوگ مسجد کے طور پر دیکھنا پسند کرتے ہیں، جیسا کہ اِسے دورِ عثمانیہ میں کر دیا گیا تھا اور کبھی اِسے بطور میوزیم اور بازنطینہ کے عہد کی یادگار کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں...... جسٹینین اوّل کے دورِ حکومت میں اِس پُرشکوہ عمارت کو 536ء میں تعمیر کیا گیا تھا، اِس دور میں فنِ تعمیر کا یہ عجوبۂ روزگار تھا...... پہلا چرچ جو قسطنطین کے بیٹے قونسطاطینس نے تعمیر کیا تھا۔ 404ء میں جل کر راکھ ہو گیا تھا، جبکہ دوسرا چرچ جسے تھیوڈوسیس نے بنایا تھا، بلوائیوں نے 532ء میں نذرِ آتش کر دیا تھا......''

جس طرح وہ قدیم تاریخی عمارات سے ہمیں متعارف کراتے ہیں، اِسی طرح وہ ہمیں ترک قوم کی تاریخ اور سلطنتِ عثمانیہ کے سلاطین سے بھی جستہ جستہ روشناس کراتے ہیں...... میں نے سلیمان عالی شان (Suleyman, the Magnificent) کا نام تو سن رکھا تھا، لیکن اِس بادشاہ کا صحیح طور پر تعارف مجھے ملک مقبول احمد کے توسط سے ہوا ہے۔ جب آپ اِس پُرکشش شخصیت کے بارے میں پڑھیں گے تو آپ بھی اُن کی سعی مشکور کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے، اُن کی خوبصورت شخصیت کا وہ اِن الفاظ میں تعارف کراتے ہیں:

> ''ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ سلیمان 26 سال کی عمر میں تختِ عثمانیہ پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کا دورِ حکومت 46 سالوں پر محیط تھا۔ (1520ء تا 1566ء)...... اس کی شخصیت اور خدوخال کو یادداشتوں اور تاریخی دستاویزات میں محفوظ کیا گیا ہے۔ وہ اُونچے قد، چوڑے کندھے، لمبی باوقار گردن، عقابی ناک، گہری بھوری آنکھیں، خوبصورت جسم اور کھال، بھورے رنگ کے بال، باہر کو نکلی ہوئی بھنویں، لمبے بازوؤں اور ہاتھوں کا حامل تھا...... دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں اُسے دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا تھا...... اس میں بے حد مقناطیسی

کشش تھی...... غیر ملکی سفیر اس کی دلکش شخصیت اور دبدبہ سے مرعوب ہو جاتے تھے“۔

اس کے بعد ملک صاحب نے اس بے مثال بادشاہ کے کارناموں کا ذکر کیا جنہیں پڑھ کر آپ یقیناً خوش ہوں گے...... انہوں نے ان تمام تاریخی کرداروں کا جستہ جستہ احاطہ کیا جنھوں نے سرزمین ترکی میں اپنے پاؤں جمائے...... یہاں آپ کی سلطان محمد دوم سے ملاقات ہوئی جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا اور حضور ﷺ کے خواب کو پورا کیا۔ یہاں آپ کا سامنا تموجن (چنگیز خان)، تیمور، بایزید یلدرم اور سلطان مراد ثانی سے ہوگا جنہوں نے تاریخ عالم اپنا نام رقم کیا۔ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ میزبانِ رسول ﷺ کی شخصیت تو شروع سے لے کر آخر تک پوری کتاب میں سایہ فگن ہے۔

یہ کتاب کل گیارہ ابواب پر مشتمل ہے...... ہر باب ہمارے سامنے ترکی کے متعدد گوشے بے نقاب کرتا ہے۔ باب دہم میں جو حقیقتاً آخری باب ہے، انہوں نے موجودہ دورِ حکومت ترکیہ جس کے وزیر اعظم رجب طیب اردگان ہیں، کا احاطہ بڑی عرق ریزی سے کیا ہے...... یہاں ان کی تحقیق اور محنت کی داد دینا پڑتی ہے۔ انہوں نے ترکی کی سیاحت اندرونی اور بیرونی، اُفقی اور عمودی ہر سطح پر کی ہے...... انہوں نے ترکی بالخصوص استنبول کو نہ صرف خود دریافت کیا، بلکہ ہمیں بھی اِس دریافت میں شرکت کی بھرپور دعوت دی ہے...... انہوں نے ترکی کو تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور دیومالائی سطح پر دریافت کیا اور معلومات کے گراں قدر ہیرے جواہر ہمارے سامنے بکھیر دیئے...... اسلوب میں ایجاز و اختصار، لفظوں کے استعمال میں کفایت شعاری اور اندازِ بیان میں دلچسپی کے پہلو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے عروج و زوال کی داستان کو اس چابکدستی سے پیش کیا کہ اہلِ بصیرت کے لئے چشم کشا ہے، ان کے اِس خوبصورت عملِ دریافت کو دیکھتے ہوئے میں انہیں ”استنبول کا کولمبس“ کہنے میں حق بجانب ہوں۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

سیاحت نامۂ ترکی

سفر عام طور سے وسیلۂ ظفر ہی ہوتا ہے۔ نئی دنیاؤں کو سر کرنے اور ان گنت حیرتیں سمیٹنے کے حوالے سے بھی اور زر و مال کی یافت کے حوالے سے بھی۔ لیکن یہ دونوں باتیں گرہ میں مال ہونے سے مشروط ہیں۔ اگلے زمانوں میں گھر سے نکلنے والے، چاہے وہ اونٹوں، گھوڑوں، گدھوں اور خچروں پر ہوں، چاہے پاپیادہ، ہمت، حوصلے اور استقامت کو زادِ راہ کے طور پر ساتھ لے کر چلتے تھے۔ پانیوں میں ہوں تو طوفانوں سے ٹکراتے، بادبانوں کو کھولتے سمیٹتے اور پتواروں پر زورِ بازو آزماتے کہیں سے کہیں نکل جاتے تھے۔ رنجِ سفر کھینچنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا اور اسی میں مگن رہ کر وہ راحت و آرام دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ وہ ایک دو دن یا ہفتہ بھر کے لیے نہیں بلکہ سالہا سال کے لیے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر اَن دیکھے خطوں اور منطقوں میں سرگرداں رہتے۔ انھیں رخصت کرنے والے بازو پر امام ضامن باندھ کر ان کو حالات کے سرد و گرم کے حوالے کر دیتے اور پھر اُن کے پلٹ آنے کے انتظار میں عمریں گزار دیتے۔ سفر تب سفر تھا اور ایک عذاب کی طرح سر پر مسلط تھا اور لکھنے والوں نے، ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں، لکھ کر اس عذاب کی تھوڑی بہت کیفیت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اب صورت احوال بدل گئی ہے۔ طول طویل مسافرت بھی اب تو ایک خوشگوار احساس میں طے ہو جاتی ہے۔ سفر کی کوئی بات رہ گئی ہے تو وہ زندگی کا سفر ہے جس میں مشقت زیادہ ہے اور وہ کاٹے نہیں کٹتا مگر اس سفر کو بھی

آسان بنانے کے خواب دیکھنے والوں کی کمی نہیں۔ راہِ محبت میں ہر گام پہ سَو سَو خطروں کے باوجود یہ سفر آسان بھی ہے۔ گر ساتھ تمہارا ہو جائے۔ ملک مقبول احمد صاحب ان خوش نصیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی سیاحت پسندی نے ہر نوع کے سفر کو اپنے لیے آسان بنا لیا ہے۔ ان کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' میری نظر سے نہیں گزری مگر اس کے باوجود ان کے بارے میں میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو اس ڈھب سے گزارنے کی سعی کی ہے کہ یہ ہر مرحلے پر اُن کے لیے راحتوں کی نوید بن گئی ہے۔ ملک صاحب کی حیات آشنائی اُن لوگوں کے لیے ایک مثال بن سکتی ہے۔ جو زندگی کو ایک بوجھ سمجھ کر بھوگ رہے ہیں۔ حال ہی اُن کا ایک سفر نامہ ''سیاحت نامہ ترکی'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ یہ سفر نامہ پڑھ کر زندگی کا ایک حرارت آفریں تصور اور فرحت بخش خیال دھیان میں آتا ہے۔ ان کے بیان کی تازہ کاری، اسلوب کی روانی اور لہجے کی سچائی نے اس بہ ظاہر مادی سفر کو ایک باطنی واردات بنا دیا ہے۔ ملک مقبول احمد صاحبؒ کے لیے سفر کا یہ تجربہ نیا نہیں ہے۔ سر شعاری ان کی عادت ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ بچپن ہی سے سیاحت پسند ہیں اور اُن کی یہ سیاحت گاؤں کے کھیتوں، کھلیانوں، بڑے شہروں کی شاہراہوں، دریاؤں، سمندروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے سرزمین حجاز کی فیض رسانیوں سے بھی وافر حصہ پایا ہے۔ دیارِ مغرب کی حشر سامانیوں نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں ساری دنیا ایک عجائب خانہ نظر آنے لگی۔ تب ان کی آتشِ شوق کو مزید ہوا ملی۔ ترکی کی سیاحت اسی شوق کی تکمیل کا منظر نامہ ہے۔ ہمیں ملک صاحب کے بچوں اور دوستوں کا ممنون احسان ہونا چاہیے۔ جن کے تقاضوں اور فرمائش پر انہوں نے پہلے آپ بیتی قلم بند کی اور اب یہ خوبصورت اور اثر آفریں سفر نامہ حیطۂ تحریر میں لائے ہیں۔

ملک صاحب کی سیاحتِ ترکی کا اصل محرک ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ارشد مقبول

ہیں، جنہیں وہ جہاں گرد کہتے ہیں کہ سال میں دو ایک بار کسی نہ کسی ملک کا دورہ ضرور کرتے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں جب وہ ترکی کے سفر سے لوٹے تو والد گرامی کو کچھ اس طرح سفر کا حال سنایا کہ انہوں نے وہیں کمرِ ہمت کس لی اور ترکی کے سفر کی ٹھان لی۔ خاص طور پر ترکی میں موجود تبرکات نبویؐ کی زیارت اور صحابئ رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری دینے کی خواہش نے انہیں بے چین کر دیا۔ وسائل بھی میسر تھے، سو انہوں نے دیر نہ کی اور جولائی ۲۰۱۰ء میں اپنے کنبے سمیت عازم ترکی ہوئے۔ دس افراد پر مشتمل اس کنبے نے سات آٹھ روز ترکی میں گزارے اور وہاں جو کچھ دیکھا اور مشاہدہ کیا اُسے ملک صاحب نے بلاکم و کاست اس سفرنامے میں تحریر کر دیا ہے۔

ملک مقبول صاحب کی سیاحت پسندی کا اہم زاویہ فطرت کا مطالعہ ہے جسے تاریخ سے ہم آمیز کر کے وہ ایک پرشکوہ ماضی سے رجوع کرتے اور اس کے گمشدہ آثار کو زندہ کر کے دکھاتے ہیں۔ اُن کی آنکھ میں جو تصویریں بنتی ہیں ان کے رنگ بہت اُجلے اور اصل ہیں۔ ڈاکٹر طارق عزیز نے اس سفرنامے کے دیباچے میں لکھا ہے ''چونکہ یہ سیاحت انہوں نے اپنے اہل خانہ، پوتے پوتیوں اور نواسیوں کے ہمراہ کی، لہٰذا کسی ایسے تجربے سے نہ گزر سکے۔ جس کا احوال دیگر سفر نگار چٹخارے لے لے کر کرتے ہیں۔'' میرا خیال ہے کہ اگر ملک صاحب تن تنہا بھی اس سیاحت پر نکل جاتے اور انہیں کسی نوع کی پابندی کا احساس نہ بھی ہوتا تب بھی وہ کسی ایسے تجربے سے گزرنا پسند نہ کرتے۔ اُن کے نزدیک ان تجربوں کی حقیقت پرِ کاہ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہمارے بعض سفرنامہ نگار، سفرنامے کو افسانہ بنانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ جس سے قارئین کی تعداد میں تو اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن سفرنامہ غائب ہو جاتا ہے اور حکایتِ دل افروز باقی رہ جاتی ہے۔ ملک صاحب نے کہیں کہیں اس حکایت دل افروز کی طرف اشارے ضرور کیے ہیں مگر اسے بیان کرنا یا اس کی تفصیل میں جانا انہیں

گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے سفرنامے کو سفرنامہ بنا کر ہی پیش کیا ہے بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے انہوں نے اسے سیاحت کا نام دیا ہے۔ جس میں پڑھنے والا ایک جغرافیائی منطقے کے ساتھ ساتھ تاریخ کی گلیوں اور شاہراہوں پر بھی جا نکلتا ہے۔ جہاں وہ ان عظیم ہستیوں کو بھی اپنا ہم سفر پاتا ہے۔ جو اپنی خوشبو سے اس کے قلب و ذہن کو معطر کر دیتی ہیں۔ قدیم و جدید ترکی کے بیان میں ملک صاحب اس کے تاریخی پس منظر کو نہیں بھولتے اور قاری کو معلومات فراہم کرنے کے لیے اس کے سامنے بے دریغ تاریخ کے اوراق کھول کر رکھ دیتے ہیں اور اسے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ میں اس سفرنامے کی خوبی ہی کہوں گا۔ مصنف اپنے بچوں کے ہمراہ استنبول اور انٹالیہ کے کوچہ و بازار کی سیر کرتے ہوئے دائیں بائیں شاندار اور پرشکوہ عمارتوں کے منظر دکھاتے ہوئے قاری کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں مگر یوں کہ اُسے تاریخ کی انگلی تھما کر خود ذرا دیر ستا لیتے ہیں اور پھر تازہ دم ہو کر اگلی سیر کا احوال بیان کرتے ہیں۔

ترکی کی ثقافت، کلچر، زبان، تمدن سمیت تقریباً تمام جزئیات اس سفرنامے میں سمٹ آئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، جو ترکی کے عوام کے مجموعی مزاج اور رویے کو ظاہر کرتی ہیں۔ جا بجا سفرنامے کے اوراق پر دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً ان چند جملوں سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ مصنف کی دُور رس نگاہ کس گہرائی میں جا کر وہاں کی عمومی فضا کا مشاہدہ کرتی ہے۔

"ہمارے کچھ مہذب لوگ اونچی آواز پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن یہاں ہر شخص کو خوش و خرم دیکھا، کسی کی جبیں پر تیوری یا آنکھ میں غصہ نظر نہیں آیا۔" "مجھے کہیں بھی جنسی بیماریوں اور جنسی ادویات کا کوئی اشتہار نظر نہیں آیا۔" یہاں کے تاجر بڑے ہوشیار اور کائیاں ہیں وہ غیر ملکی سیاحوں کو لوٹنے میں ماہر ہیں۔" لڑکیاں ساحلِ سمندر پر بے لباس پھرتی ہیں۔۔۔ کھلنڈرے لڑکے اور خاص طور پر بوڑھے یہاں ریستوران سے دیدہ نوازی

کرتے ہیں اور فنجانوں میں شراب ڈال کر پیتے ہیں۔ جس کی یہاں ممانعت نہیں ہے۔'' ان ریستورانوں میں مشروبِ مغرب بھی مل جاتا ہے، میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اس مشروب سے دل بہلا رہے تھے، لیکن مجھے کوئی بدمست نظر نہیں آیا۔''

ملک مقبول احمد ایک یا چند جملوں میں پتے کی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ نہایت سادہ مگر دل نشیں اسلوب میں یہ سفرنامہ خاصے کی چیز ہے۔ مصنف نے اسے سیاحت نامہ کا نام دے کر اسے دیگر سفرناموں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں اسے سفرنامہ ہی کہوں گا اور اس بات پر اصرار کروں گا کہ مصنف کی راست روی اور سچائی نے نہ صرف اِسے ژولیدگی سے محفوظ رکھا ہے بلکہ کسی طرح کی تعلی، خودنمائی کو راہ دینے کے بجائے اس کی بنیاد عجز، انکسار اور اخلاص و محبت پر استوار کی ہے اور یوں یہ سفرنامہ دیگر سفرناموں سے ممتاز و منفرد ہو جاتا ہے۔

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

اپریل ۲۰۱۱ء

☆☆☆

امین راحت چغتائی

258۔گلی نمبر ا۔علامہ اقبال ایونیو گلریز V

پی او چک لالہ ائیر فیلڈ، راولپنڈی

ایک صاحبِ دل کا سیاحت نامہ

''سیاحت نامہ ترکی'' ملک مقبول احمد کا سفرنامہ استنبول ہے۔ جس میں تاریخ و سیاحت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ملک صاحب ایک بڑے اشاعتی ادارے مقبول اکیڈمی کے سربراہ ہیں لیکن لکھنے پڑھنے اور سیاحت کے شوق نے انھیں قلم کار بھی بنا دیا ہے۔ اس سے پہلے وہ ''سفر جاری ہے'' کے عنوان سے اپنے سوانح بھی لکھ چکے ہیں لیکن اُن کا سب سے بڑا کارنامہ تو وہ مختصر سیرت نگاری ہے۔ جو پیغمبرِ اسلامؐ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ یہ بے حد ذمہ داری سے لکھی گئی۔ بے حد خوب صورت طباعت سے آراستہ سیرت کی۔ بے حد اچھی کتاب ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ملک صاحب اسی سے اپنی بخشش کا سامان کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر ''سیاحت نامہ ترکی'' ایک باتصویر سفرنامہ ہے۔ اسے بھی بہت احتیاط سے قلمبند کیا گیا ہے۔ سمندر کے ساحل مناظر بیرونی ممالک میں یکساں ہوتے ہیں اور جاذبِ نظر بھی۔ چنانچہ ملک صاحب نے ''لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجئے'' کا الزام تو اپنے سر لیا ہے لیکن ''نگاہِ بازگشت'' کا نہیں۔ وہ استنبول اور دیگر سیاحتی مقامات پر جہاں بھی گئے۔ ایک اچھے مسلمان کی پاکیزہ فکر اُن کے ساتھ رہی۔ اُنھوں نے جو کچھ دیکھا،

اُسے ایک دردمند دل سے محسوس بھی کیا۔ مولانا حالی نے مرزا شوق کی مثنویوں پر پھبتی کسی تھی کہ "چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور روئے۔" یہ پھبتی آج کل کے بیشتر سیاحت ناموں (سفرناموں) پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ملک مقبول احمد کے سیاحت نامے پر نہیں۔ اس کی حیثیت جداگانہ ہے۔ یہ سفرِ سیاحت تو سفرِ سعادت تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ، میزبانِ رسولؐ کے مرقد کی زیارت کے لیے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کتاب کا انتساب ہی اُنؓ کے نام ہے۔

سیاحت نامے کی تحریر و ترتیب میں بھی تدبر کارفرما ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مرقد چونکہ قسطنطنیہ (استنبول) میں واقع ہے۔ اس لیے تسخیر قسطنطنیہ کے غیر معمولی تاریخی واقعے کا اعادہ ضروری تھا۔ تاکہ سیاحت نامے کا قاری اس سفر کی اہمیت کو سمجھ سکے۔ ملک صاحب کی تحریر میں ذوق و شوق بھی شامل ہے اور رقتِ قلبی بھی۔ چنانچہ کتاب کا قاری بھی ان کیفیات کو ہو بہو محسوس کرتا ہے۔

البتہ ترک تاریخ کے بیان میں امیر تیمور اور عثمان اوغلو یلدرم بایزید کی نبرد آزمائی صحیح تاریخی تناظر کی محتاج ہے۔ تاریخ چونکہ کوئی مقدس چیز نہیں ہے اس لیے ارباب وعلل کی آگاہی کے بغیر تاریخ کے مطالعے میں نظر ثانی کی گنجائش ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ بایزید پے در پے فتوحات اور کشور کشائی کے باعث بروشر نگار ترکوں کا ہیرو تو بن جاتا ہے لیکن وہ ژرف نگاہی سے محروم تھا۔ اس تمام علاقے کے فرنگی ممالک عالم اسلام کو تہس نہس کرنے کے لیے متحدہ محاذ قائم کر چکے تھے۔ اس میں عراق و مصر کے مسلمان حکمران بالواسطہ شامل ہو چکے تھے۔ امیر تیمور نے بایزید کو ایک مراسلے کے ذریعے آگاہ کیا اور اُسے جہاد کے لیے آمادہ کیا۔ مراسلے میں لفظ "جہاد" سوچ سمجھ کر استعمال کیا گیا تھا اور بایزید سے کہا گیا تھا کہ وہ بلقان کے راستے تیموری لشکر سے آملے۔ مگر عارضی تسخیری شادمانی پر کم اندیشی غالب

آ گئی۔ ادھر اردوئے زریں کا سردار تقتمش، فرنگیوں کے جاسوس کے طور پر کام کر رہا تھا اور اس کے عوض امداد حاصل کر رہا تھا۔ مصر کا مملوک فرماں روا برقوق، امیر تیمور کے بھیجے گئے سفارتی وفد کو قتل کروا چکا تھا جس میں بعض علماء بھی تھے۔ عراق کا شکست خوردہ سلطان احمد جلائر بھی برقوق کی پناہ میں تھا۔ اور پھر بایزید نے سب کچھ جانتے ہوئے ان دونوں کو جو امیر تیمور کے خلاف محاذ میں شریک تھے۔ اپنے ہاں پناہ دے دی۔ تقتمش تو ایک اور سازش کے تحت امیر تیمور کو اس کے بیٹوں سے اپنی بیٹیوں کی شادی کی بھی پیشکش کر چکا تھا۔ مغل فرماں روا پر اس پیشکش کا پس منظر بھی واضح ہو چکا تھا۔ فرنگی لشکریوں کا اڈہ مشرقی یورپ میں دریائے دنیپر (Dnieper) پر واقع تھا۔ اس پیشکش کا مقصد امیر تیمور کو فعال بنانا تھا۔ بایزید کا ''جہاد والے مراسلے پر خاموشی اختیار لینا بھی بالواسطہ مسیحی اتحاد کو تقویت پہنچانا تھا۔ مغل مزاج فطرتاً سخت ہوتا ہے۔ پہل نہیں کرتا لیکن پہل کرنے والے کو چھوڑتا بھی نہیں۔ خوارزم شاہیوں نے بھی چنگیز کی سفارت کو قتل کروا دیا تھا اور پھر خوارزم شاہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور تیمور اپنے مغل مزاج کے باوصف ایک مسلمان حکمران تھا۔ نقشبندی مسلک رکھتا تھا۔ لشکر کشی کے وقت بھی علماء کی ایک جماعت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ مصر کے برقوق نے امیر تیمور کے جس سفارتی وفد کو قتل کروایا تھا۔ اُس میں بعض نامور علماء بھی شامل تھے۔ جو برقوق کو مغل فرمانروا کی نئی لشکر کشی کی دینی اہمیت سمجھانے گئے تھے۔ نیز یہ بتانے گئے تھے کہ تقتمش کے لشکر میں بھی روسی شامل تھے۔

بایزید کا ان حالات میں، تیمور کے دشمنوں کو پناہ دینا، خود جہاد پر آمادہ نہ ہونا اور اپنے لشکر میں عیسائی فوجیوں کو رکھنا، کن مقاصد کو ظاہر کرتا ہے۔ آخر ہونی ہو کر رہی۔ انقرہ کے مقام پر چوبوق پر دونوں فوجیں نبرد آزما ہوئیں۔ بایزید گرفتار ہوا۔ آق کے مقام پر نظر بند رہا۔ اُسے دمے کا عارضہ تھا۔ اسی میں 9 مارچ ۱۴۰۳ھ کو انتقال کر گیا۔ گرفتاری کے

بعد نہ تو اُسے پنجرے میں بند کیا گیا نہ اُس کے ساتھ کوئی مکالمہ ہوا۔ اُس کی بیوی کی برہنگی اور عصمت دری کی بے سروپا داستانیں تحریر کر کے فاضل مؤلف نے بھی بالواسطہ اُسی گروہ کے ہاتھ مضبوط کیے۔ جو مغل فرماں روا کے خلاف جذبات رکھتا تھا۔

طوالت کے باعث میں مزید تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ براہِ کرم دائرۂ معارف اسلامیہ کی جلد ۴ اور جلد ۶ کے صفحہ ۴۳۲ اور ۹۴۰ پر نظر ڈال لیجئے۔ بروشر نگاروں کی مرتب کردہ تاریخ صرف سیاحوں میں دلچسپی کے لیے لکھی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ فاضل مؤلف اگلے ایڈیشن میں یہ سب باتیں حذف کر دیں گے۔

کتاب کا ایک اہم حصہ ''ماڈرن ترکی شناخت کی تلاش میں'' ہے۔ اس میں ترکوں کے داخلی تہذیبی تضادات کی نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ترکوں کی بزرگ نسل اسلام کی اپنی تہذیب برقرار رکھنا چاہتی ہے لیکن جدید نسل یورپی تہذیب وتمدن اور موسیقی کی دلدادہ ہے اور اُس نے اپنے آپ کو قومیت کا ''نیا تصور'' دے رکھا ہے۔ اس کے باوجود اکثر لوگ حجاب کو اہمیت دیتے ہیں مگر بیشتر اسے غیر ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ عربی رسم الخط متروک ہے۔ لاطینی حروف تہجی نے ترکوں کو قدیم تاریخی، علمی و ادبی تحریروں سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ ترکی میں اسلام بھی ہے۔ سیکولرازم بھی ہے۔ مے کدے بھی آباد ہیں اور نیم عریاں لباس بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ مساجد بھی پُر رونق ہیں۔ نماز جمعہ کا اجتماع بھی دیدنی ہے اور ساحلوں پر غسلِ آفتابی بھی۔ تسبیح وتہلیل بھی ہے اور بوس وکنار بھی۔

صفحہ ۱۷۳ پر کتاب کا ایک حصہ وعظ کی نذر ہو گیا ہے۔ حالانکہ کتاب میں تفصیل سے زیادہ اختصار اہم ہوتا ہے۔ پھر بھی بہ حیثیت مجموعی یہ سیاحت نامہ قدرے مختلف ہے۔ تاریخی تفصیلات کے باوجود قاری کا شوق ماند نہیں پڑتا۔

☆☆☆

پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ
بھمبر ۱۶۔ مارچ ۲۰۱۱ء

سیاحت نامہ ترکی

سیاحت نامہ ترکی ملک مقبول احمد صاحب کی دیدہ زیب کتاب ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اپنے سکول کے زمانے کے دو ہیڈ ماسٹر منصۂ شہور پر اُبھرے۔ ان میں پہلے سید نظیر حسین شاہ گیلانی تھے۔ جو تاسیس حکومت آزاد ریاست جموں و کشمیر کے بعد پہلے ہیڈ ماسٹر بن کر آئے تھے۔ وہ کوٹ پینٹ کے ساتھ پھندنے والی ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ سیاحت نامہ ترکی کے مطالعے سے اس دور کی یادیں تازہ ہوئی۔ ''پھندنے والی رومی ٹوپی (Fex) پر پابندی، پگڑی یا دستار کے استعمال کی ممانعت کے احکام اور ہیٹ (Hat) یا فیلٹ ہیٹ (Felt Hat) پہننے کا حکم روشن خیالی کا پہلا مظہر تھا۔'' جدید ترکی اپنی جدیدیت کا ''سفر نامہ'' رقم کر رہا تھا مگر برعظیم کے مسلمانوں کے دل خلافت اور پھندنے والی ترکی ٹوپی سے جڑے ہوئے تھے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی سے ہر نقش کہن کو مٹانے کی کوشش کیوں کی؟ اس کا جواب ملک صاحب نے ایک فقرے میں یوں دیا ہے ''پھر اُس نے مشرق کا ''نپولین'' بننے کا درخشاں خواب دیکھا اور اسی دھن میں لگ گیا اور انقلابی سرگرمیوں کے منصوبے بناتا رہا۔''

ملک صاحب کی ''سیاحت نامہ ترکی'' پڑھتے ہوئے میرے طالب علمی کے دوسرے صدر معلم ملک محمد رشید؛ ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی (علیگ) جو ''تاریخ پاک و ہند'' کے مولف تھے اور ہمیں جغرافیہ اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ وہ لاشعور سے شعور پر قدم رنجہ

ہوئے۔ علی گڑھ کالج کے بانی سر سید احمد خان 1869ء میں اپنے بیٹے ڈاکٹر سید محمود کے ہمراہ انگلستان پہنچے اور وہاں ڈیڑھ دو سال قیام کے دوران میں ''خطبات احمدیہ'' سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ '' کے جواب میں لکھی اور واپسی پر ''سفر نامہ انگلستان'' لکھا۔ سر سید احمد خان کے اس سفر کو حضرت اکبرالٰہ آبادی نے ایک مصرعے میں یادگار بنادیا:

''تم دیکھو خدا کا گھر ہم خدا کی شان دیکھیں گے''

جناب ملک محمد رشید نے جہاں جغرافیے اور تاریخ کے ذریعے ''تحریک خلافت'' سے والہانہ لگاؤ پیدا کردیا تھا۔ وہاں اس مضمون سے قلبی لگاؤ بھی پیدا کردیا تھا۔ بدین وجہ میں ایم اے تاریخ کرنے کے بعد کالج اساتذہ میں شامل ہوا اور ایک عرصے تک طلبا و طالبات کو تاریخ پڑھاتا رہا۔ ملک صاحب کا تاریخ سے لگاؤ اور ترکی سے محبت کا جو جذبہ موجزن تھا، وہ اس اقتباس میں چغلی کھاتا، دکھائی دیتا ہے۔ ''میں یہاں ترکی کی تاریخ رقم نہیں کررہا۔ یہ اس سرزمین کا اجمالاً پس منظر تھا۔ جو میں بتانا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ یہی تاریخی شعور مجھے اس دل کش اسلامی سلطنت کے خدوخال دیکھنے کے لیے اکثر اُکساتا رہا۔

میں محض ترکی کے زمانہ حال کی سیاحت نہیں کررہا تھا۔ بلکہ اس کے زمانہ ماضی کی سنہری جھلکیوں کو بھی دیکھ رہا ہوں اور اس میں آپ کو شریکِ سفر کررہا ہوں۔۔

ملک صاحب نے ترکی کی تاریخ باقاعدہ رقم نہیں کی مگر ''سیاحت نامہ ترکی'' میں بڑے خوبصورت انداز میں اچھی خاصی تاریخ پڑھادی ہے۔ ملک صاحب جانتے ہیں کہ تاریخ، جغرافیے کے بغیر اور جغرافیہ، تاریخ کے پس منظر کے بغیر ادھورا ہوتا ہے، کسی ملک کی جغرافیائی سیر وسیاحت، تاریخ کی روشنی میں ہی موثر ہوتی ہے۔ سیاحت نامہ ترکی نے ترکی دیکھنے کی جو جوت جگائی ہے، وہ ایک خواہش کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ لیکن میں اپنے آپ کو ''سیاحت نامہ ترکی'' کے پہلے پانچ ابواب کی سیاحت تک ہی محدود رکھوں گا۔

سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کا طالب علم ہونے اور ایک عرصے تک کالج میں تاریخ پڑھانے کے باوجود ملک صاحب نے میری معلومات میں جو اضافہ کیا ہے، اُس میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہوں گا۔ ''پیش تر اس کے کہ میں اُن جگہوں کا جو تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں ذکر کروں، سرزمینِ ترکی کے بارے میں چند اہم باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ قدیم اہل روم ترکی کی سرزمین کو ''ایشیائے کوچک'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس سرزمین کا بڑا حصہ ایشیاء سے مشرقی بحیرۂ روم تک چلا گیا ہے۔ اس کے شمال کی طرف بحرِ اسود ہے اور مغرب کی طرف ایجین کا سمندر ہے۔ جنوب کی سمت عرب پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سرحدیں یونان، بلغاریہ، جارجیہ، ارمینیا، ایران، عراق اور شام سے جُڑی ہوئی ہیں۔ قدیم قومیں اسے ''اناطولیہ'' کے نام سے پکارتی تھیں۔ جس کے معنی ''دھرتی ماتا'' کے ہیں۔۔۔

۱۹۲۴ء میں اتاترک کی زیرِکمان یہ ملک ترکیہ (Turkiya) یعنی ''ترکوں کی زمین''

ترکوں کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ ملک صاحب لکھتے ہیں۔ لفظ ''ترک ۱۳۰۰ سال قبل از مسیح چینی تواریخ میں ملتا ہے۔ ۳۲۶ ق۔م میں سکندر اعظم دنیا کی فتح کے لیے نکلا تو اُس نے مقدونیہ سے پیش قدمی کا رُخ اس طرح موڑ دیا۔ جب وہ ہندوستان فتح کرنے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے بڑھ رہا تھا تو اپنے پیچھے یونانی ثقافت کے نقوش اناطولیہ میں چھوڑ گیا۔

رومیوں نے ایشیائے کوچک کو اپنے لیے سرسبز و شاداب علاقہ پایا اور مشرق میں اپنے روایتی دشمنوں کے خلاف مضبوط فصیل کے طور پر دیکھا۔ سرزمینِ ترکی کو دیکھ کر زیلا (Zela) کے مقام پر قیصر روم نے بے ساختہ یہ مشہور الفاظ کہے۔ ''میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کرلیا۔''

ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے حملوں کے بعد اناطولیہ میں اسلام کا ظہور ہوا۔ ابتداء میں عرب بازنطینیوں کو یہ لوگ وحشی قدیم قبائلی لوگ نظر آئے لیکن جب یہ عرب

شاہ سوار خالد بن ولید (سیف اللہ) کی زیر کمان بازنطینیہ پر حملہ آور ہوئے اور بازنطینیوں کو شکست فاش ہوئی تو انہیں ان کے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ خالد بن ولیدؓ نے جنگ یرموک (موجودہ اُردن) میں بازنطینی افواج کو شکست دی۔ اسی اسلامی لشکر کے ہم راہ میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابوایوب انصاریؓ بھی تھے۔ ملک صاحب آپ رضی اللہ عنہ کا تعارف یوں کراتے ہیں۔ ''حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اصل نام خالد بن زید تھا، لیکن اُن کی کنیت ''ابوایوب'' تھی۔ قبیلہ انصار سے تعلق کی بناء پر وہ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ہیں۔''

ملک صاحب تاریخ کو یوں آگے بڑھاتے ہیں۔ ''امیر تیمور اپنی فتوحات کے جھنڈے بلند کرتا ہوا تبریز کے راستے بازنطینیہ پہنچا۔ ادھر جب بایزید یلدرم کو پتہ چلا کہ تیمور اس ملک پر حملہ آور ہونے والا ہے تو وہ تیزی سے مشرقی یورپ کی مہم چھوڑ کر اپنے دارالخلافہ ''برسا'' پہنچا۔ ۱۴۰۲ء میں انقرہ کے قلعے کے نزدیک شمال مشرقی میدان میں دونوں مسلم فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔۔۔۔۔ یہاں ایک اہم بات کا ذکر بہت ضروری ہے کہ ہم مسلمان جب بھی مغلوب ہوئے آپس کی جنگ وجدل کی وجہ سے ہوئے۔ بایزید یلدرم بھی مسلمان تھا اور امیر تیمور بھی مسلمان، سلطان معظم بایزید یلدرم فاتح یورپ بن کر اُبھر رہا تھا تو امیر تیمور ایشیائے کوچک سے فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا ایشیائے کوچک کو فتح کرتا ہوا بازنطینیہ پہنچ گیا۔ اگر یہ دونوں مسلمان فاتح آپس میں اتحاد کر کے آگے بڑھتے تو دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔۔۔۔۔ بایزید یلدرم گرفتار ہو کر ایک پنجرے میں بند کر کے تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تو امیر تیمور اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ کہتے ہیں اس پر بایزید یلدرم نے امیر تیمور سے کہا کہ آج میں گرفتار ہوں، تمہیں میرا تمسخر نہیں اُڑانا چاہئے۔ تیمور بولا کہ میں اس لیے مسکرایا ہوں کہ خدا نے اس دنیا کی حکومت ایک لنگڑے اور دوسرے اندھے کو عطا کی ہے۔

تیمور ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا اور بایزید عقل سے پیدل۔

سلطان بایزید یلدرم (۱۳۵۴ء---۱۴۰۳ء) کے چار بیٹے تھے، تیمور کے چلے جانے کے بعد ان میں جانشینی کے بارے میں بہت تصادم ہوا۔ بالآخر محمد اوّل بطور فاتح نمودار ہوا۔ جبکہ دوسرے بھائی مارے گئے۔۱۴۱۲ء میں اس کا بیٹا مراد ثانی تخت نشین ہوا، جس نے از سر نو سلطنت عثمانیہ کو منظم کیا۔ سلطان محمد دوم ان ہی کا بیٹا ہے۔

پھر یہ عظیم سعادت سلطان محمد دوم (ثانی) کے حصے میں آئی اور ۱۴۵۱ء میں سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ سلطنت روم کا دارالحکومت اور عیسائیت کا دل فتح کر لیا۔۔۔ جب قسطنطنیہ مسلمانوں کے زیرِ تسلط آ گیا اور اس شہر کو استنبول کا نام ملا۔ ابوایوب انصاریؓ کی قبر کی نشان دہی کی گئی اور ان کے مزار پر شاندار روضہ تعمیر کیا گیا۔

ملک صاحب، ترک قوم کے بارے میں صفحہ ۷۹ پر لکھتے ہیں، "وسطی ایشیاء کی وسعتوں میں کسی مقام سے خانہ بدوش لوگ ایک خشک شدہ پانی کے منبعے سے دوسرے پانی کے منبعے تک سفر کرتے اور خشک سالی، جھلسا دینے والی گرمی اور شدید سرد راتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ عین قانونِ فطرت کے مطابق جب یہ غریب خانہ بدوش گلہ بان کاشت کی ہوئی سرزمین پر آئے تو اُنہوں نے اُن کی دولت کو لوٹا اور برباد کیا۔ لوگوں کے اسی ذخیرہ نسل سے ترک قوم نمودار ہوئی۔

روایتی طور پر ترکی کے لوگ دوسرے قبیلے میں شادی کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے ایک دوسرے قبیلے کے ساتھ نہ صرف خون کا رشتہ قائم ہو جاتا بلکہ سماجی بندھن بھی محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس سے منگولوں اور ترکوں کے خاندان کی پہچان میں جو وسط ایشیاء کو چک میں رہتے تھے، کچھ الجھن بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ تموجن (Timugin) جو تاریخ میں چنگیز خان کے نام سے معروف ہے، نصف منگول اور نصف ترک تھا۔

ظہیر الدین بابر نے ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر "مغلیہ خاندان" کی بنیاد رکھی۔ بابر باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے منگول تھا۔ ملک صاحب نے یہ عُقدہ وا کیا کہ بابر ترک ہونے کے باوجود ہندوستان میں "مغل خاندان" کی حکومت کا بانی کس طرح کہلایا۔!

ترکوں کی محبت ہمارے رگ وپے میں سمائی ہوئی ہے۔ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے باوجود ترکوں سے ہمارا روحانی اور قلبی تعلق وابستہ ہے۔ یہ تعلق زبانی جمع خرچ ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے زبان وادب کی بنیاد "اُردو" بھی ترکی لفظ ہے، جس کے معنی "لشکر" کے ہیں۔ اس کی بنیاد مغلوں یعنی ترکوں کے لشکر میں پڑی اور ان ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔

ترکوں سے ہماری محبت یک طرفہ نہیں ہے بلکہ ترک ہم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ترکی کے دانش وروں کا کہنا تھا کہ جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء) کے دوران میں کئی بار ہم دل برداشتہ ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے مگر جب ہمیں ہندوستانی مسلم بھائیوں کی قربانیاں یاد پڑتی تھیں تو ہم پھر سے مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ یہ تعلق اور محبت آج بھی دونوں طرف کے مسلم بھائیوں میں موجزن ہے۔ مجھے بھی اس کا اندازہ حج کے دوران ہوا۔ جب ایک بزرگ مسلم ترک بھائی نے مجھے پاکستانی جاننے کے بعد معانقہ کیا اور رخسار پر بوسہ دیا۔

ترکی اور پاکستان کی بنیادوں میں اسلام سے محبت رچی بسی ہے۔ اسلام کو ان کی بنیادوں سے الگ کرنا دیوانے کا خواب ہے۔ مصطفیٰ کمال نے "جدیدیت" کے ذریعے اتاترک بننے کی کوشش کی مگر آج کا ترکی پھر سے اپنی شناخت "اسلام" کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ مصطفیٰ کمال نے بظاہر جدید ترکی کی بنیاد "شریف مکہ" کی سازش اور دنیائے عرب کے "عرب ازم" کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا مگر حقیقت یہی ہے کہ مصطفیٰ کمال

مشرق کا نپولین بننا چاہتا تھا اور مغرب نے اُسے اسلامی تعلیمات اور مشرقی روایات کو پامال کرنے کے لیے ''جدیدیت'' کی اصطلاح تھما دی تھی۔لطف کی بات یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال نے پُھندنے والی ٹوپی کو جب دیش نکالا دے دیا تو وہ ہجرت کر کے ہندوستان آ گئی۔اسی دور میں ترکی ٹوپی ہندوستان کے ہر ذی وقار مسلمان کے سر کی زینت بن گئی تھی اور محبت کا جادو سر چڑھ کر بولتا نظر آتا تھا۔

مغرب کا ''جدیدیت'' ایک جنگی ہتھیار ہے تا کہ مسلم نوجوانوں کو اپنی تہذیب و ثقافت سے بیگانہ کیا جائے۔ملک صاحب جدیدیت کے اس سراب کو ان الفاظ میں دیکھتے ہیں۔''عورتیں کھلے بندوں مغربی لباس میں ملبوس یا نیم عریاں گھومتی پھرتی ہیں، وہ پب میں شراب پیتی اور سگریٹ کے کش لگاتی نظر آتی ہیں۔قمار خانے رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ساحل سمندر پر تو خواتین ننگے بدن سن باتھ لیتی اور سیر و تفریح کرتی ہوئی ملتی ہیں، جن سے نگاہ ہٹانا مشکل ہے۔بعض جگہوں مرد و زن بوس و کنار کرتے ہوئی بھی دکھائی دیتے ہیں۔یہ تمام مناظر مغربی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔سرسید احمد خان نے ایک موقع پر کہا تھا کہ علی گڑھ کے نوجوان اگر آسمان تارے ہو جائیں اور مسلمان نہ رہیں تو وہ ہمارے کسی کام کے نہیں۔ترکی بھی پاکستان کی طرح اپنی روایات کی بازیافت کے لیے سرگرداں ہے۔

یہ تو تھے، ملک مقبول احمد صاحب کی کتاب ''سیاحت نامہ ترکی'' کے چند حوالے، جو قاری کو سحر زدہ کر کے پوری کتاب ایک نشست میں ختم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔فن تصنیف و تالیف میں کتاب کا حُسن اُس کی ظاہریت سے وابستہ ہوتا ہے۔ملک صاحب کا پہلا شوق ''کتاب کے حسنِ طباعت'' سے ہی متعلق ہے۔آپ نے اس فن کی آبیاری میں اپنے سر کے بال سفید کیے ہیں۔آپ کے اندر کا ادیب، اپنے ادارے سے منسلک ادباء و شعراء کا بغور جائزہ لیتا رہا اور آپ انہیں خوبصورت فن پاروں کی صورت دیتے رہے۔فنِ

طباعت کو درجۂ کمال تک لے جانے کے بعد اندر کے ادیب نے کروٹ لی اور آپ نے "سفر جاری ہے" اپنی سرگزشتِ حیات لکھ کر فن کو ایک نئی جہت دی۔ اُس کے بطن سے "پذیرائی" نے جنم لیا۔ یہ بھی ادب میں ایک نئی "طرح" ثابت ہوئی۔ آپ نے اپنے ادارے سے منسلک ادیبوں اور شاعروں کو بھی پذیرائی بخشی اور اپنے نام آنے والوں ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کو "اہل قلم کے خطوط" کے عنوان سے خوبصورت کتاب میں پیش کیا۔ اگرچہ ان خطوط سے ملک صاحب کے فن، ان کا مصنفین سے تعلق خاطر، ادب کی آب یاری اور ادیب کی زندگی کے بارے میں کئی پہلو سامنے آتے ہیں، تاہم اس سے ادیب، ادب اور ناشر کے کئی گم نام گوشے بین السطور پڑھے جاسکتے ہیں۔ ملک صاحب نے اپنے مصنفین کی تاریخ کو محفوظ کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ اور "ہمارے اہل قلم" کے عنوان سے ایک خوبصورت کتاب پیش کرنے جارہے ہیں۔ اس پر انشاء اللہ آئندہ بات ہوگی۔ کیوں کہ ہم بھی دلّی کے ان سواروں میں سے ہیں۔

ملک صاحب نے "سیاحت نامہ ترکی" لکھ کر "سفرناموں" کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ سیاحت نامہ ترکی کا موضوع "ترکی" ہر مسلم کی دل کی دھڑکن ہے۔ اسلوبِ بیان بھی اتنا دل کش ہے کہ ساری کتاب کو اقتباسات کی شکل دی جاسکتی ہے۔ تاہم جناب ڈاکٹر انور سدید نے کتاب کے ادبی حسن کا جائزہ لیا ہے۔ جناب ڈاکٹر طارق عزیز اور جناب پروفیسر جمیل آذر نے علمی و ادبی دل کشی کی نشاندہی کے لیے چند اقتباسات کا انتخاب کیا ہے جو واقعی انتخاب ہیں۔

ملک صاحب کا "طباعت اور تخلیق ادب" ہر دو میدانوں میں ابھی سفر جاری ہے اور اللہ کرے کہ بدیر جاری رہے۔

☆☆☆

سعید بدر

''سیاحت نامہ ترکی''

ایک مطالعہ......ایک جائزہ

ملک مقبول احمد کی تازہ ترین تصنیف ''سیاحت نامہ ترکی'' پیش نظر ہے جس کا سرورق اپنے اندر دلکشی اور زیبائی لیے ہوئے ہے۔ اس دیدہ زیب کتاب کا انتساب، رسول عظیم و محتشم ﷺ کے میزبان اور جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ کے نام کیا گیا ہے جن کی قبر مبارک استنبول کے جوار میں ہے۔ کتاب میں ملک مقبول احمد کے پیش لفظ کے بعد وطن عزیز کے نامور اور ممتاز ادباء حضرات کی نگارشات شامل ہیں جنہیں آپ تقریظ کا نام دے سکتے ہیں یا دیباچہ کہہ سکتے ہیں۔ ان حضرات نے کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی گراں قدر آراء پیش کی ہیں جس نے کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں کیونکہ یہ حضرات سکہ بند ادیب اور ادب شناس ہیں:

ع مستند ہے جن کا فرمایا ہوا

ممتاز ادیب، اعلیٰ پائے کے محقق اور سینئر صحافی ڈاکٹر انورالدین سدید نے ''عرض سدید'' کے عنوان سے کتاب پر علمی و ادبی اعتبار سے روشنی ڈالی ہے جبکہ ڈاکٹر طارق عزیز نے ''بیمار یورپ کا صحت مند ترکی'' کے عنوان سے اس سیاحت نامہ کا بھرپورہ جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر نے خلوص دل سے ملک صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ملک صاحب نے اپنے سفرنامہ کے ذریعے قارئینِ کرام کو 'جدید وقدیم' ترکی سے

متعارف کرایا ہے۔ پروفیسر آذر نے ملک صاحب کو ''استنبول کا کولمبس'' کہا ہے۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا لیکن ملک صاحب نے ہمیں سیاحت کے ذریعے جدید ترکی سے متعارف کرایا ہے۔ پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد بلند مرتبہ ماہر تعلیم ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنی ماہرانہ رائے پیش کی ہے جو ہمارے لیے استناد کا درجہ رکھتی ہے۔

''سیاحت نامہ ترکی'' گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جو خوبصورت اور دلکش و رنگین تصاویر سے مزیّن و منقش ہے۔ ان میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پُر انوار کی تصویر بھی شامل ہے۔

ملک صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''سفر بیت اللہ کے دوران جب حضرت ابوایوب انصاریؓ کی زندگی اور ان کے میزبان رسولِ مقبول ہونے کی سعادت سے آگاہی ہوئی تو دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ استنبول جا کر ان کے مزار پر انوار پر حاضری دی جائے۔ یہ تڑپ کشاں کشاں انہیں آخر کار استنبول لے گئی اور انہیں نہ صرف اس عظیم القدر صحابیؓ کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی بلکہ سفرنامہ لکھنے کا خیال بھی پیدا ہوا جسے دوستوں نے تحریک دی۔ ملک صاحب لکھتے ہیں کہ ''میں نے ترکی کی سیاحت میں اپنی ذات کے اندر کی سیاحت بھی کی اور ذات کے باہر کی بھی۔ ترکی کے حال کی بھی اور ترکی کے ماضی کی بھی۔''

''سیاحت نامہ ترکی'' کے سرسری مطالعہ سے جو بات مشاہدہ میں آئی ہے وہ ملک صاحب کی دین سے شیفتگی، محبت اور وابستگی ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر نہ صرف دُعاؤں کا ذکر کیا ہے بلکہ سیاحت کے دوران خود بھی اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدُعا ہو جاتے ہیں اور خیر و سلامتی کی دُعا مانگتے ہیں۔ سفر کا آغاز کرتے ہیں تو دُعا کرتے ہیں۔ بار بار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا شکر ادا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں لیکن ایسے

انداز میں کہ قاری پر گراں نہیں گزرتا کیونکہ ان کا انداز ناصحانہ نہیں۔

پہلے باب میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا بابرکت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''سفر تو آخر سفر ہی ہوتا ہے۔ لاہور سے روانگی کے وقت میں نے وہ تمام دُعائیں پڑھیں جو ہمارے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائی ہوئی ہیں۔ یہ انہی کا اثر ہوتا ہے کہ ہم رب العزت کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارا جہاز لاہور ائیر پورٹ پر پرواز کے لیے رن وے پر دوڑنے لگا تو ایک پرندہ جہاز سے ٹکرا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جہاز کسی بڑے حادثہ سے محفوظ رہا۔''

بعد میں انہوں نے اس حادثے کا ذکر بھی کیا ہے۔ آگے چل کر رقمطراز ہیں:

''ہر مسلمان کا سینہ حُبِ رسول ﷺ سے روشن ہے۔ جب وہ ترکی کے اس حسین وجمیل شہر کا دورہ کرتا ہے تو والہانہ طور پر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے روضۂ مبارک پر بھی حاضری دیتا ہے۔ تو ان کے چشمۂ فیض سے اپنی روح کو سرشار کرتا ہے۔ ملک صاحب یہاں سرورِ کونین ﷺ کی دُعا کا ذکر کرتے ہیں۔

''سرورِ کونین ﷺ کی ان کے (ابوایوبؓ) حق میں دی گئی دُعا آج بھی ان کی حفاظت کئے ہوئے ہے۔ جب آپؐ ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کے یہودی اور منافقین حضور اکرم ﷺ کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رات کے وقت پہرہ دینے کی ہدایت فرمائی۔ ایک رات حضرت ابوایوب انصاریؓ نے پہرہ دیا تو ان کی شب بیداری پر خوش ہو کر آپؐ نے دعا فرمائی۔

''اے ابوایوب! اللہ تعالیٰ اپنی حفظ وامان میں رکھے کہ تم نے نبیؐ کی نگہبانی کی''

یہ حضور اکرم ﷺ کی دُعا ہی کا اثر تھا کہ ابوایوبؓ عمر بھر تمام آلام ومصائب سے محفوظ رہے۔ حتیٰ کہ کفار کے عہد میں بھی آپ کی قبر محفوظ رہی۔ یہاں تک کہ جب قسطنطنیہ

فتح ہوا اور اس کو استنبول کا نام ملا تو صاحبِ کشف بزرگ کی طرف سے ابوایوب انصاریؓ کی قبر کی نشاندہی کی گئی اور ان کے مزار پر عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ جہاں ترکی کا ہر حکمران اپنی تخت نشینی پر حاضری دیا کرتا ہے اور ان کے روحانی فیوض و برکات سے دامن دل کو ثروت مند کرتا ہے۔ سبحان اللہ! میزبانیٔ رسولؐ کے صدقے کتنا بلند مرتبہ ملا کہ جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔''

باب اول کے خاتمہ میں تحریر کرتے ہیں۔:

''مغرب کی نماز قضا ہوگئی تھی۔ ہوٹل میں آ کر مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی۔ اسلام کتنا خوبصورت دین ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اس میں کتنی سہولتیں رکھی ہیں۔ اگر بوجوہ نماز چھوٹ گئی تو آپ قضا کرلیں۔ اللہ رب العزت ہمیں اپنی عبادات کی برکتوں سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ہم پر ہر وقت اپنی رحمتوں کا نزول جاری رکھنا چاہتا ہے۔(سبحان اللہ)''۔

درج بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں ایک طرف سفر ہو یا حضر، ملک صاحب نماز کی ادائیگی میں غفلت نہیں کرتے وہاں ہلکے پھلکے انداز میں قاری کو ترغیب دے دی کہ وہ نماز پڑھے جس سے اللہ تعالیٰ کی برکات کا نزول ہوتا ہے۔'' انداز واعظانہ یا ناصحانہ نہیں۔ ملک صاحب کی تحریر یہی اصول خوبی ہے۔

ملک صاحب ایک جگہ مچھلیوں کا ذکر کرتے ہوئے رب کریم کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ جس سے ان کی دینداری اور مذہب سے شغف کا ثبوت ملتا ہے۔

''انتالیہ کی بندرگاہ پر ریستورانوں کا میلہ لگا ہے۔ جہاں متنوع قسم کی مچھلیوں کے پکوان دستیاب ہیں۔............. اللہ تعالیٰ نے سمندر کی ہزاروں قسم کی مچھلیوں کا تخلیق کیا ہوا ہے اور انسان ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ رب کریم کا ان نعمتوں پر جتنا بھی

شکرادا کریں، وہ کم ہے۔"

آگے چل کرایک اور مقام پر رقمطراز ہیں کہ:

"بایں ہمہ میں نے اپنے معمولات کونہیں بدلا۔ اپنے روزانہ وظائف، صبح تلاوت قرآن، نمازوں کا اہتمام اور دُعاؤں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہی تو میرے لیے روحانی مسرت کا مرکز ثقل ہے۔ یہی چیز تو مجھے کشاں کشاں قسطنطنیہ کھینچ لائی تھی۔ میں ویسے بھی شام کی نماز کے بعد ایک دفعہ سورۃ فاتحہ، تین دفعہ قل شریف اور درود شریف پڑھ کر اپنے والدین کو ایصالِ ثواب کرتا ہوں۔ یہاں آ کر بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے سامنے سجدہ ریز رہتا تھا۔ اگر وہ توفیق نہ دیتا تو میں یہاں کیسے آ سکتا تھا۔"

اس عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک صاحب نے سفر میں اپنے دینی معمولات کو جاری وساری رکھا جو بہت مشکل اور دشوار کام ہے۔ ہم لوگ ملک کے اندر رہ کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک جائیں تو نماز کی ادائیگی میں نہ صرف بے قاعدگی آ جاتی ہے بلکہ نماز چھوٹ جاتی ہے۔ چہ جائیکہ دوسرے ملک میں "جو سیکولر ملک" ہے۔ حالانکہ استنبول میں اعلیٰ پائے کی خوبصورت مساجد کی کثرت ہے۔

بہرکیف ملک صاحب کے دینی و مذہبی معمولات پر باقاعدگی کے ساتھ عملدرآمد کے باوجود ہم انہیں 'مولوی' 'ملا' یا کٹر دین پرست نہیں کہہ سکتے۔ سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ "دیگر مناظر" سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کا ذکر کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک جگہ "ساحل سمندر پر گھومنے پھرنے والوں کی منظر نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوگ غسل آفتابی کے لیے یہاں آتے ہیں۔ مرد لباس سے بے نیاز ہونے میں دیر نہیں کرتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ترکی کی جدید لڑکیاں جو یورپ زدہ ہیں اپنی قدرتی

سفید و سرخ جلد کو سنوارنے کے لیے آتی ہیں اور سارا دن ریت پر لیٹی رہتی ہیں...... لڑکیاں ساحل سمندر پر بے لباس پھرتی ہیں...... کھلنڈرے لڑکے اور خاص طور پر بوڑھے یا ریستوران سے دیدہ نوازی کرتے ہیں اور فنجانوں میں شراب ڈال کر پیتے ہیں جس کی یہاں ممانعت نہیں''۔

صاف ظاہر ہے کہ ''ہمارے بوڑھے مسافر'' نے بھی یقیناً ''دیدہ نوازی'' سے کام لیا ہوگا۔ ملک صاحب نے یہاں دیدہ نوازی کی اصطلاح استعمال کر کے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔

یہاں تک ہمارا سفرنامہ نگار صرف دیدہ نوازی سے کام لیتے ہیں لیکن بیلک نامی ساحل بحر کا منظر یوں پیش کرتے ہیں:

''یہاں غیر ملکی سیاح مرد جانگیہ یا نیکر پہنے اور سوئمنگ سوٹ یا محض ہلکی بیکینی پہنے سمندر سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی موجوں کے ساتھ دوڑ بھاگ رہی اور رنگ رلیاں کر رہی تھیں۔ یہ بندہ اس آبی موج میلہ سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لہٰذا اس نیلگوں سمندر میں چند ڈبکیاں لگا کر زندگی کا بھرپور ثبوت دیا۔ یوروپین خواتین اپنے مختصر لباس میں جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہر کس و ناکس کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ ایسے میں دل پر قابو پانا قدرے مشکل ہوتا ہے اور انہیں دیکھے بغیر، خواہ حیرت ہی سے کیوں نہ ہو، بندہ بشر رہ نہیں سکتا۔ ویسے بھی اس وسیع و عریض سمندر کا نظارہ آنکھیں بند کر کے تو نہیں کیا جا سکتا اس خوبصورت دلکش جگہ سے واپس آنے کو کس کافر کا جی چاہتا ہے:

چھیڑ خوباں سے چلی جائے ہے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

درج بالا اس تحریر سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا سفرنامہ نگار، کا مارا

ہوا اور خشک مولوی نہیں۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں بلکہ اسے انجوائے کرتا ہے اور تمام مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ترکی موسیقی کا ملک صاحب نے بھرپور انداز میں ذکر کیا ہے اور ''زندگی'' کا ثبوت پیش کیا ہے۔

صفحہ 100 پر قمطراز ہیں کہ:

''توپی کاپی محل اگر عثمانیہ بیوروکریسی کی علامت ہے تو درجنوں شاندار مسجدیں جن کے حسین، دلکش خط آسمان کو چھوتے ہوئے حسین مناظر ہیں، ریاست کے مذہب، اسلام کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔''

ملک صاحب یہاں ''غلطی'' کھا گئے ہیں، ترکیہ جو ایک جدید ریاست ہے، کا مذہب اسلام نہیں بلکہ اس کا مذہب سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ مصطفےٰ کمال کے عہد سے ترکی سیکولر سٹیٹ ہے اور اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس سے قبل مذہبی خیالات رکھنے پر ایک حکومت کو فوج نے نہ صرف معطل کر دیا تھا بلکہ اس کے وزیراعظم کو پھانسی لگا دی تھی۔ موجودہ وزیراعظم بھی اسی الزام میں جیل میں رہ چکے ہیں۔ چنانچہ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں، ترک جرنیل اور عدالتیں آج بھی ان کی مخالف ہیں۔ ترکی برسوں سے کوشاں ہے کہ یورپی یونین کا ممبر بن جائے، یہ شوق ترکی پہ جنوں کی طرح سوار ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے بارے میں کیا خوب فرمایا تھا:

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

بہرحال سیاحت نامہ ترکی اپنے اندر کئی دلکش، جاذبِ نظر اور دلچسپ پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس میں جغرافیائی سرحدوں کی سیر کے ساتھ قدیم و جدید ترکی کی تاریخ بھی مناسب طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ طرزِ معاشرت اور طرزِ تمدن کا بھی ذکر موجود ہے۔

لوگوں کے رہن سہن، بول چال اور چال ڈھال کے مناظر خوبصورتی اور عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں کسی جگہ بوریت یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے۔ کہ قاری بھی برابر سفر نامہ نگار کے ساتھ ساتھ محوِ سفر ہے اور تمام مناظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس سفرنامے کا یہی حسن اور یہی دلکشی ہے اور ملک صاحب کا یہی کمالِ فن ہے کہ انہوں نے چابکدستی سے ہر منظر کو قلم کی گرفت میں لے لیا ہے کہ پڑھتے ہوئے قاری کو لطف اندوز ہوتا ہے۔

ملک صاحب گہرا تاریخی شعور رکھتے ہیں۔ وہ محض تاریخ ہی بیان نہیں کرتے کہیں کہیں اس کے حسن و قبح پر بحث بھی کرتے ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کا عروج و زوال ان کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ اس سرزمین کا اجمالاً پس منظر ہے جو میں بتانا ضروری سمجھتا تھا کیونکہ یہی ''تاریخی شعور'' مجھے اس دلکشی اسلامی سلطنت کے خدوخال دیکھنے کے لیے اکثر اکستا رہا۔ میں محض ترکی کے زمانہ حال کی سیاحت نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کے زمانہ ماضی کی سنہری جھلکیوں کو بھی دیکھ رہا ہوں اور اس میں آپ کو شریک سفر کر رہا ہوں۔ میری دانست میں حال، ماضی کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے اور ہمیں ماضی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ وہ قومیں جو اپنی تاریخ کو بھول جاتی ہیں۔ وہ روبہ زوال ہو جاتی ہیں۔'' اس گہرے تاریخی شعور کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔ ان کے مطابق ماضی نہ صرف حال ہی کہ نشاندہی کرتا ہے بلکہ مستقبل میں جھانکنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

ملک صاحب کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، وہ سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتے ہیں، کہیں کہیں انگریزی زبان کے الفاظ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ جس سے ان کے زورِ بیان میں اضافہ اور وسعت بیدار ہو گئی ہے حتیٰ کہ وہ بعض

چیزوں کی وضاحت کے لیے ترک زبان سے بھی کام لیتے ہیں، وہ ان کے خیال میں ترکی زبان میں بعض ایسے عربی، فارسی کے الفاظ موجود ہیں۔ جو اردو میں بھی ہیں اس لیے جب ترک بولتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بعض الفاظ سے ہم مانوس ہیں۔

یہ کتاب مقبول بکس نے شائع کی ہے جو اغلباً مقبول اکیڈمی ہی کی شاخ ہے اور جس کے کتب خانے شہر لاہور میں پھیلے ہوئے ہیں اور طباعت بھی عمدہ ہے۔ سرورق خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اعلیٰ کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

بہرحال ''سیاحت نامہ ترکی'' عہد حاضر میں خاصے کی چیز ہے اور ترکی کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اہل ذوق اور تاریخ کے طلباء سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ اپنی پہلی فرصت میں کریں اور اسے اپنی لائبریری کی زینت بھی بنائیں۔

☆☆☆

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد
گوشہ محققین۔ننکانہ صاحب

سیاحت نامہ ترکی

''سیاحت نامہ ترکی'' معروف کتاب کار جناب ملک مقبول احمد صاحب کی نئی قلمی تخلیق ہے۔ جو حال ہی میں مقبول بکس سے چھپ کر صاحب مطالعہ اور جویان علم کے قلب و نظر سے تریاوٹ کا سبب بنی ہے بلکہ ان کے خوان ہائے مطالعہ کی زینت بن چکی ہے۔ یہ کتاب صفحات میں مختصر (صرف 176 صفحات) ہے۔ مگر جذبات، احساسات، مشاہدات اور طولانی رشحات میں بڑی ضخیم ہے۔ ''سیاحت نامہ ترکی'' کا مسودہ ملک صاحب نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے مجھے برائے قلم آرائی بھجوایا تھا اور میں نے کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ، کمزور بیان آرائی اور مختصر تبصرہ گری کی تھی۔ جسے ملک صاحب کی مشاق مدیرانہ قلم نے خزف ریزہ سے لعل و جواہر میں بدل دیا۔ یہ آپ کی شفقت بھی ہے اور ندرت بھی۔ شکر اللہ تعالیٰ وشکر الملک علی ہذا۔

ملک صاحب نے ''سفر جاری ہے'' کیا لکھی کہ آگے سے آگے میدان مارتے چلے جارہے ہیں۔ آپ کی تالیف کی تعداد نصف درجن سے متجاوز ہونے کو ہے۔ خودنوشت پر قلم اٹھایا اور اپنی فنکاری کا لوہا منوایا۔ خطوط کے انتخاب کا بیڑا اٹھایا تو اسے لاجواب مجموعہ بنا کر دکھایا۔ تبصروں و تجزیوں کو ترتیب دیا تو اپنے پڑھنے والوں کو ایک ماہر، چابکدست اور عظیم ادیب دیا۔ غزلوں کا مجموعہ مرتب فرمایا تو خوب ترتب فرمایا کہ واہ واہ کہے بغیر چارہ نہ

رہا۔ علمی و ادبی مضامین کا گلدستہ سجایا تو ہم شائقین و مریدین کو اش اش کرتے پایا۔ ''پیغمبر عالم ﷺ'' لکھی تو دریا کو کوزے میں بند کرنے میں بڑی خوبی اور تجربہ کاری سے کامیاب ہو گئے۔ اور اب سفرنامہ لکھا ہے۔ تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ:

مقبول صاحب نے ترکی کی قدیم، جدید تاریخ پر قلمی گھوڑے دوڑا دیئے ہیں۔

مقبول صاحب نے ترکی میں موجودہ ثقافت و معاشرت اور جدت اور جدیدیت پر خامہ فرمائی کی ہے۔

مقبول صاحب نے مصطفیٰ کمال پاشا کی روشن خیالی (Enlightenment) پر گرفت کی ہے۔

مقبول صاحب نے ترکوں کی اسلام اور دینی روایات کی طرف واپسی کو خوشگوار انداز میں بیان کیا ہے۔

مقبول صاحب نے ترکوں کے دلوں میں پاکستان اور پاکستانیوں کی محبت کا پرجوش تذکرہ کیا ہے۔

مقبول صاحب نے ترکی کے شہروں، بازاروں، عمارتوں، عجائب گھروں، مقبروں، مسجدوں، ہوٹلوں اور طعام گاہوں کے مشاہدات حوالۂ قلم و قرطاس کیے ہیں۔

مقبول صاحب نے مکاروں کی مکاری اور عیاروں کی عیاری کو بھی بلاخوف و خطر طشت از بام کیا ہے۔

مقبول صاحب نے تصویروں کے ذریعے رنگینی، رونق اور جمالیاتی ذوق کے ناقابلِ قلمی ثبوتوں کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر کے اپنے قارئین کے آگے پیش کر دیا ہے۔

مقبول صاحب نے سفرنامہ کو تاریخ اور تاریخ کو سفرنامہ بنانے میں ذرا بھی کسر

نہیں چھوڑی۔

مقبول صاحب نے اپنے دوستوں کو اپنی خوشیوں اور قلمی جولانیوں میں شریک کرنے میں کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مقبول صاحب نے اپنے پڑھنے والوں کی خواہشِ سیر کو "سیاحت نامہ ترکی" کے ذریعے خوب خوب انگیخت کیا ہے۔

میری ملک مقبول احمد صاحب سے رفاقت وخلّت کا زمانہ کم مگر آپ سے روابط کا استحکام بہت سے حضرات سے زیادہ ہے۔ آپ کی تحریر کردہ اور شائع کردہ کتب کو دیکھ کر اور نظر مطالعہ سے گزار کر میں یہ رائے قائم کرنے میں واقعی حق بجانب ہوں کہ آپ کا قلم رواں، گفتگو شائستہ، پراز حقائق، مملوئے فکر و مشاہدہ، دلائل اپیلنگ (Appealing)، مشاہدہ عمیق، اخذ نتائج کا ملکہ قابل تعریف، انداز بیان سہل واحسن اور تحریر اغلاق واشکال سے پاک ہے۔ ملک صاحب کے ہاں نہ لفاظی کی قلت ہے نہ تشبیہات واستعارے کم ہیں نہ تجربے کا فقدان ہے۔ نہ مہارت کی کمی ہے۔ آپ واقعات بھی بیان کرتے ہیں معلومات بھی بکھیرتے ہیں۔ آراء وافکار کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ تصویر کشی اور منظر نگاری سے بھی اپنے قاری کو محظوظ کرواتے ہیں۔ تبصرہ آرائی اور نقطہ ونظر سے بھی اپنی گفتگو کو سجاتے ہیں۔ پذیرائی، مہر و مروت اور خوبی و داد آفرینی سے بھی اپنی کتاب کے قاری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یقینی بات ہے، بہت یقینی بات ہے، یقین محکم سے کہا جا سکتا ہے کہ سیاحت نامہ ترکی میں یہ سب خصائص بافراط موجود ہیں۔ کتاب خریدیئے، پڑھیے اور سر دھنیے، مزہ نہ آئے تو فدوی ذمہ دار!

سیاحت نامہ ترکی کا انتساب صحابیِ رسولؐ، میزبان رسولؐ اور امین رسولؐ حضرت خالید بن کلیبؓ بخاری المعروف حضرت ابوایوب انصاریؓ کے نام کیا گیا ہے اور شاہنامہ

اسلام کا یہ شعر بھی رقم کیا گیا ہے۔

فلک نے رشک سے دیکھا اس انصاری کی قسمت کو
ابو ایوب کے گھر لے گئے سامانِ رحمتؐ کو

حفیظ جالندھری

پیش لفظ اور عرض سدید (از قلم: ڈاکٹر انور سدید) کے بعد درج ذیل قلمکاروں کی آراء کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔

بیمار یورپ کا صحت مند ترکی	ڈاکٹر طارق عزیز
استنبول کا کولمبس	پروفیسر جمیل آذر
ترکی کا سفر سعادت	پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

''سیاحت نامہ ترکی'' کا اصل مواد باب نمبر 1 (فہرست میں شمارہ نمبر 6) سے گیارہویں (آخری باب) فہرست میں نمبر 16 تک پھیلا ہوا ہے۔ جو بڑا معلوماتی، تبصراتی، وقیع اور دلچسپ ہے۔ اس کو پڑھنے اور اس سے مستفیض و مستفید ہونے میں ہر ایک اپنا ذوق اور اپنی طبع ہے۔

ہر کس بفکر بقدر ہمت اوست

''سیاحت نامہ ترکی'' خالی خولی بیان سفر کی روداد نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی اہم اور رنگین تصویریں بھی جگہ بجگہ جگمگا رہی ہیں۔ مثلاً آغاز مطالعہ سے قبل ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردگان کی تصویر، اس تصویر کی پشت پر مسجد سلطان احمد کا خوبصورت کیمرہ جاتی منظر (View)، صفحہ 48 کے بعد چار رنگا رنگ تصویریں، صفحہ 80 کے بعد آٹھ دل کش تصویریں، صفحہ 112 کے بعد دو تصویریں اور بیک ٹائٹل پر فاضل مصنف کے پاسپورٹ سائز تصویر اور چار مبصرین کے شامل کتاب تبصروں کے اقتباسات سے ''سیاحت نامہ ترکی'' کو سجایا

گیا ہے۔

ملک مقبول احمد صاحب عزت کرنے میں سخی ہیں اور عزت کروانے میں بھی دلیر ہیں۔ گفتگو کرنے میں بے باک اور کلام سننے میں اس کا تجزیہ کرنے میں، اس کو قبول کرنے یا رد کرنے میں بھی وسیع القلب اور وسیع الظرف ہیں۔ آپ نے پیش لفظ میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ارشد مقبول کا کھل کر شکریہ ادا کیا ہے۔ جن کے توسط اور تحریک سے ملک صاحب ترکی کا سفر کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ کتاب کے لکھنے میں تحریک دلانے اور ''ہلا شیری'' کرنے میں ملک صاحب نے جس شخصیت کے کردار کو سراہا ہے۔ اس کا نام بھی ڈاکٹر ارشد مقبول ہے۔ ''سیاحت نامہ ترکی'' کے اندر جا بجا ڈاکٹر ارشد مقبول ان کے بیٹے بیٹیوں اور دوسرے اقارب کا تذکرہ ہے۔ یہ سب ملک مقبول صاحب کی مثبت فکری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ باپ کو ذہنی و جسمانی فائدہ پہنچانا اولاد کا حق ہے۔ گرامی ڈاکٹر صاحب نے اپنا حق ادا کیا ہے۔ مگر ملک صاحب نے ادائیگی حق پر اظہار احسان مندی کے ذریعے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔

کتاب ''سیاحت نامہ ترکی'' کے مندرجات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری یقیناً یہ بات سوچے گا کہ اس کا خرچ کیا ہوا مال اور وقت اور توانائی ضائع نہیں ہوئی بلکہ اسے ذہنی، فکری اور علمی فائدہ پہنچانے کا باعث بنی ہے۔ آخر میں میں چند سطریں مذکورہ کتاب کے صفحہ 35 سے پیش کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''سیاحت نامہ ترکی'' میں سے کچھ اقتباسات میں نے پیش کیے ہیں اور کچھ اقتباسات محترم پروفیسر جمیل آذر صاحب نے اپنے پیش لفظ میں لکھے ہیں، ادیبانہ اور ماہرانہ رائے کا اظہار ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اپنے متاثر کن انداز بیان میں کیا ہے مگر یہ سب ناکافی نمونے ہیں۔ اس کتاب سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے اس

کتاب کا بھرپور مطالعہ اور مکمل و مفصل حرف خوانی ضروری ہے اور میں اپنے پڑھنے والوں کو یہ کتاب ''مکمل'' پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔لہٰذا حرکت میں آیئے اور اپنے ذوق مطالعہ و شوق علم کو سیراب کرنے کا اہتمام کیجئے۔

اب مانیں اور مانیں تجویز زور دار ہے
ہم خوب خوب آپ کو سمجھائے جاتے ہیں
گر پڑھ لو گے کتاب فائدہ اٹھاؤ گے!
یہ بات خوب کھول کے بتلائے جاتے ہیں

☆☆☆

سیاحت نامۂ ترکی

جب ناشر ادیب بن جائے اور اپنی تحریروں کی داد بھی پائے تو پھر اس کے جوہر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ملک مقبول احمد بھی ایسے ناشر ہیں جو کہ اب ادیب کی حیثیت سے زیادہ اور ناشر کی حیثیت سے کم پہچانے جاتے ہیں۔ دراصل مقبول ملک صاحب نے عمر کا ایک بڑا حصہ ناشر کی حیثیت سے گزار دیا اور جب انہوں نے لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو خود ان کو بھی احساس ہوا اور نقادوں اور ادیبوں نے بھی انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ آپ بہت اچھے ادیب ہیں۔ شکر ہے کہ ملک صاحب کو اب یقین آ گیا ہے اور انہوں نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے اب تحریری سرگرمیوں کو اپنا لیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اُن کا سیاحت نامہ ہے۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ پچھلے دنوں ترکی کا ایک دورہ کیا ہے اور ترکی کے تازہ ترین حالات اور تبدیلیوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ ملک مقبول کو ترکی سے عقیدت ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ رسول اکرم ﷺ نے قسطنطنیہ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی اور اسی مہم میں حضرت ابوایوب انصاریؓ جیسے صحابہؓ نے شہادت پائی۔ ملک مقبول کو حضرت ابوایوب انصاریؓ سے بے انتہا عقیدت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاید ان کے سفر کا ایک مقصد اس عظیم ہستی کے مزار کا نظارہ کرنا اور فاتحہ پڑھنا ہی تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کا یہ مردِ بیمار اب یورپ کا مردِ توانا بن چکا ہے۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟ سیاحت نامے میں اس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں

نے اس ملک کے ماضی اور حال کے بارے میں نہایت مفید معلومات فراہم کی ہیں جس کے مطالعے کے بعد ترکی کا سفر کرنے کی خواہش دل میں کلبلانے لگتی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے شاندار دور عروج کا تذکرہ انہوں نے بہت دلکش انداز میں کیا ہے۔ پھر زوال اور اس کے بعد مصطفیٰ کمال کی جوانمردی اور ہمت سے ملک کی سرحدوں کی غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کا تذکرہ قاری کے دل میں توانائی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

ترکی کی قدیم تہذیب دراصل یورپ کی کئی نام نہاد قدیم تہذیبوں سے بڑھ کر ہے۔ لیکن اہل مغرب اپنا ڈھنڈورا پیٹنے میں ماہر ہیں۔ اس کے باوجود آج بھی سیاح ترکی کی سیر و سیاحت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ترکی ایک خلافت سے جمہوریہ کیسے بنا۔ اس کا احوال بھی انہوں نے سادہ اور دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے اور ترکی کے جدید معمار طیب اردگان کی کارکردگیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس سیاحت نامے میں ملک مقبول احمد قاری کو ماضی اور حال کی سیر کراتے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذاتی تجربات اور دلچسپ واقعات اس کی کشش میں مزید اضافے کا باعث ہیں۔

سیاحت نامے کے آغاز میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز اور پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد کی تمہیدی تحریریں بھی قاری کو روشنی فراہم کرتی ہیں۔ کتاب میں جدید و قدیم ترکی کے بارے میں رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب عام قارئین کے علاوہ طلباء کے لیے بھی نہایت مفید اور قابل مطالعہ ہے۔

ہفت روزہ ''فیملی'' ۲۷اپریل تا ۱۲اپریل

☆☆☆

قدامت وجدت کے امتزاجی تناظر میں

سیاحت نامۂ ترکی

''اٹیلا دی ہن، چنگیز خان اور تیمور اپنی فوجوں کے آگے آگے جنگی گھوڑوں پر سوار آج بھی جدید انسان کے دل میں خوں آشام خوف کی تصویریں پیش کرتے ہیں، مگر ہمیں ان اشخاص کو اُس وقت کے تھیٹر کے فریم ورک میں دیکھنا ہوگا۔ یہ خانہ بدوش لوگوں کا آباد شدہ (Civilised) لوگوں کے خیال اور رکاب کا ہل کے خلاف ٹکراؤ تھا۔ گویا گھوڑوں اور بیلوں کا تصادم تھا۔''

''وسطی ایشیاء کی وسعتوں میں کسی مقام سے خانہ بدوش ایک خشک شدہ پانی کے منبع سے دوسرے پانی تک سفر کرتے رہے۔ خشک سالی، جھلسا دینے والی گرمی اور شدید سرد راتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ قانونِ فطرت کے عین مطابق جب یہ غریب خانہ بدوش کاشت کی ہوئی سرزمین پر آئے تو انہوں نے ان کی دولت کو لوٹا اور برباد کیا۔ لوگوں کے اس ذخیرۂ نسل سے ترک قوم نمودار ہوئی۔''

''زبان بھی ان لوگوں کو یورپین، سلاوی اور سلاوی النسل لوگوں سے علیحدہ کرتی ہے۔ لفظ ''ترک'' 1300 سال قبل از مسیح چینی تواریخ

میں ملتا ہے۔ آٹھویں صدی قبل از مسیح منگولیا میں جو ادخونی کتبے ملے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف قبائل کو مشترکہ دشمن چین کے خلاف لڑنے کے لیے ایک سربراہ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا کام ایک کٹھن امتحان تھا۔ یہ کتبے رونگ حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ خیمہ نشین لوگوں کے بڑے بڑے شہروں کا پتہ بھی ان کتبوں سے ملتا ہے۔ ایک کتبہ پر یہ دلچسپ عبارت ملتی ہے۔''

''اگر آسمان سر پر نہیں گرتا اور ہمارے نیچے سے زمین نہیں کھسکتی تو اے ترک قوم! کون تمہاری ریاست اور اداروں کو تباہ کر سکتا ہے۔''

محولہ بالہ تین پیرائے کسی تاریخی دستاویز یا کتاب کے نہیں ایک سیاحت نامہ کے ہیں اور یہ سیاحت نامہ بھی قبل از مسیح زمانے کا نہیں موجودہ صدی کا ہے۔ یعنی جولائی 2010ء کا۔ جو کہ ایک ادیب، پبلشر اور سفرنامہ نگار ملک مقبول احمد نے ترکی کے سفر کے بعد حال ہی میں تصنیف کر کے شائع کیا ہے۔ اس سیاحت نامے کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے قدیم ترکی کے تناظر میں جدید ترکی کی سیر اور اس کے احوال اسی طرح بلا کم و کاست تحریر کر دیئے ہیں۔ زبان و ادب کی چاشنی اور حقیقت و افسانہ کی رنگینیاں اس سیاحت نامہ کو اور بھی خوبصورت بنا دیتی ہیں۔

اس سفر کا ارادہ کرنے کی وجہ ملک مقبول احمد نے یہ بتائی ہے کہ چونکہ ترکی میں میزبانِ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی مرقد ہے اور تبرکات رسول ﷺ ہیں۔ ان تبرکات کی اور اس عاشقِ رسول ﷺ کی مرقد کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا اس لیے وہ کشاں کشاں استنبول جانے پر آمادہ ہو گئے۔ اس سفر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ملک مقبول احمد کے ہمراہ ان کی آل اولاد اور اہلیہ بھی تھی۔ ان کی ایک بیٹی، دو نواسیاں، بیٹا،

بہو، دو پوتیاں اور ایک پوتا بابر مقبول، کل دس افراد کا یہ قافلہ سیر و تفریح بھی کرتا رہے اور ملک مقبول احمد ترکی سے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ بھی کرتے رہے۔ ترکی میں قدم قدم پر انہیں ترک بہن بھائیوں کے خلوص اور پاکستان سے محبت کے انمٹ ثبوت ملے جن کی بناء پر اس تمام سفر میں انہیں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔

استنبول ائیر پورٹ پر اُترنے کے بعد اس ''سیاح خاندان'' کو استنبول کے ہی ایک ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ جس کے تین گرینڈ بازار، لگژری شاپنگ سنٹر، آیا صوفیہ، شاخ زریں، باسفورس، تابستانی، کیج عافیت، انٹالیہ، ساحلی ریستوران کے میلہ، سمندری کھانوں، ترکی فنِ موسیقی، ترکی قالینوں، سلیمانی عالی شان، بادشاہت کے خاتمہ، کمال اتاترک، ترکوں کی پاکستانیوں سے محبت، جمہوریہ ترکی کی نئی تاریخ، ترکی کا موجودہ دورِ حکومت، موجودہ وزیرِ اعظم رجب طیب اردگان کی زندگی اور تعلیم اور ان کی ابتدائی سیاسی زندگی کا آغاز اور دیگر موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس سیاحت نامہ کو پڑھ کر جہاں ترکی دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے وہاں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ترکی کے متعلق جتنی معلومات پڑھ لی گئی ہیں اب ترکی جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆☆☆

سیاحت نامۂ ترکی

مقبول بکس......١٠ دیال سنگھ مینشن، مال روڈ لاہور (042-37357058) نے اس ادارہ کے موسس ملک مقبول احمد کا ''سیاحت نامۂ ترکی'' اسی نام سے بہت عمدہ معیار کے ساتھ امپورٹڈ پیپر پر شائع کیا ہے۔ یہ سیاحت نامہ ہمارے ادب میں سفرناموں کی فہرست میں عمدہ اضافہ ہے۔ سادگی، سلاست، بے ساختگی، اظہار حقیقت اور زبان و بیان کی شستگی اس سفرنامے یا سیاحت نامے کی اہمیت میں اضافے کا باعث ہیں۔ پھر ملک کے ممتاز ادباء اور قلم کاروں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، پروفیسر جمیل آذر اور پروفیسر شبیر حسین زاہد کی طرف سے اس پر قیمتی آراء و تاثرات اس کی اہمیت و افادیت کا کماحقہ احساس دلاتے ہیں ایک رائے یہ ہے کہ......مجموعی طور پر یہ سیاحت نامہ مقامات مقدسہ کی زیارت کی روایت سے منسلک ہے لیکن اس میں جدید ترکی کا وہ چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جو بیسویں صدی کی پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلسل تغیر کی زد میں رہا ہے اور اب بھی نئے تحرک و حرارت کو عمل میں لا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہل ادب ''سیاحت نامۂ ترکی'' کو دلچسپی سے پڑھیں گے...... بالکل بجا کہا گیا ہے کہ......ملک مقبول احمد نے بہت مطالعہ، تحقیق اور مجاہدہ کیا ہے، تب کہیں جا کر وہ اسلوب گرفت میں آیا ہے۔ جو ادب کو تاریخ اور تاریخ کو ادب میں آمیز کرنے پر عبور رکھتا ہے۔ اس منفرد اسلوب تحریر سے ترکی کی ترقی و

تاریخ کے بعض ایسے ابواب روشن ہوئے ہیں۔ جن سے قاری پہلے ناواقف تھا۔ اُمید ہے کہ 'سیاحت نامہ' ترکی'' اُردو سفرناموں کی دنیا میں ایک جہانِ تازہ کی خبر لائے گا۔...... یہ بھی درست ہے کہ ...... ملک مقبول احمد نے بڑی جامعیت کے ساتھ ترکی کے نیلے سمندروں، نرم ریتلے ساحلوں اور پانیوں پر تیرتے خوبصورت بجروں، ساحلوں پر آباد نفیس، پُر آسائش تابستانی مکان اور ساحل سمندر پر حُسن کی جلوہ آرائی کو بڑی نفاست اور سلیقہ سے قلمبند کیا ہے۔ ان پُرکشش چیزوں کے بارے میں پڑھ کر ہر اہل دل اور فہم جو وہاں جانے کی خواہش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتاب میں موجود اہم کلرڈ تصاویر ترکی کا آئینہ ہیں اور سیر و سیاحت کے شائق قارئین کے لیے ضیافتِ طبع کا باعث ہیں۔ ویسے برادر اسلامی ملک کے متعلق معلومات کو ایک خاص انداز سے اس سیاحت نامے میں سمو دیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس سفرنامے کا مطالعہ کی میز پر موجود رہنا فکر اور سوچ کے زاویے درست کرنے میں بھی مدد دے گا۔

ماہنامہ سوئے حجاز، لاہور

اپریل، ۲۰۱۱ء

☆☆☆

شفیع ہمدم

ترکی کا حسین سفر

ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی جس سے ان کے قلم کو توانائی اور اعتماد حاصل ہوا۔ اس کے بعد ان کا رہوار قلم قرطاس کے سینے پر تیزی سے دوڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی کتابیں صفحہ قرطاس پر نمودار ہوئیں۔ ان کتب میں ''سیاحت نامہ ترکی'' اور حج کا سفر ''سفر آرزو'' بھی شامل ہیں ان دونوں کتابوں نے اہل ذوق قارئین سے خوب داد سمیٹی جس سے ملک صاحب کے قلم کو مزید رعنائی اور توانائی حاصل ہوئی۔ ان دنوں میں ان کے سفرنامے ''سیاحت نامہ ترکی'' کے زیر اثر ہوں۔ ''سفر آرزو'' اور ''سیاحت نامہ ترکی'' میں ملک صاحب کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے مگر اس میں بلا کی روانی ہے جس میں قاری خود بخود بہتا چلا جاتا ہے۔

بہت سے سفرنامے میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان سفرناموں اور ملک صاحب کے سفرناموں میں ایک واضح فرق ہے کہ ان سفرناموں میں مصنف اپنے سفر ناموں کو دلچسپ اور دلآویز بنانے کے لیے مبالغہ آرائی کی آمیزش بھی کرتا ہے اور صنف نازک کی نزاکت اور ملاقات کا ذکر کر کے سفرنامے کو پرکشش اور دلکش بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے مگر ملک صاحب نہ تو مبالغہ آمیزی کو اپنے سفرناموں کی مملکت میں داخل ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی صنف نازک کے ذریعے اپنے سفرنامے کی گاڑی کو آگے

بڑھاتے ہیں۔ ان کا قلم وہی کچھ لکھتا چلا جاتا ہے جو دیارِ غیر میں ان کی آغوشِ بصارت میں آتا ہے وہ اپنی طرف سے وہاں کے پرکشش مناظر، قابل دید مقامات اور تاریخی عادات میں کسی قسم کی ردوبدل نہیں کرتے۔

ملک صاحب سیاحت کے بڑے رسیا ہیں اس بات کا تذکرہ انہوں نے ''سفر آرزو میں بھی کیا ہے۔ ''سیاحت نامہ ترکی'' میں ہی اپنی سیاحت پسندی کا ذکر خوبصورت الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> ''میں بچپن ہی سے سیاحت پسند ہوں، خواہ یہ سیاحت میرے گاؤں کے کھیتوں اور کھلیانوں کا ہو یا لاہور اور کراچی کی شاہراہوں کی یا دریاؤں اور سمندروں کی، سفر حجاز تو میں کئی مرتبہ کر چکا ہوں لیکن دیارِ غیر مغرب کا سفر میں نے پہلی مرتبہ 1988ء میں کیا تھا۔''

ملک صاحب نے ترکی کا سفر اس وقت اختیار کیا تھا جب ان کی عمر عزیز کا رہوار اسی کے سنگ کو عبور کر چکا تھا۔ ان کے اندر جوانوں کا سا جوش و ولولہ نہیں تھا مگر ہوش وخرد اور تجربات کی دولت وافر مقدار میں موجود تھی وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں تحریر کرتے ہیں:

> ''میرے اندر وہ ولولہ بھی نہیں رہا تھا جو نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ البتہ ایک پختہ ذہن ضرور ہے جو اجنبی سرزمینوں کو دیکھ کر سوچتا ہے حیرت زدہ ہوتا ہے اور اللہ کا شکر بجا لاتا ہے جس نے یہ کائنات بنائی اور ہمیں دیکھنے کے لیے آنکھیں دیں۔''

ملک صاحب نے ترکی کا سفر تن تنہا نہیں بلکہ اپنے خاندان کے ساتھ کیا تھا۔

ان کے کارواں میں دس چھوٹے بڑے افراد شامل تھے۔

حضرت ایوب انصاریؓ جو عاشق رسولؐ بھی تھے اور میزبان رسولؐ بھی اور حافظ احادیث بھی تھے ان کی کشش ملک صاحب کو استنبول جانے کے لیے اکسانے اور تڑپانے لگی تو انہوں نے یہ سفر اختیار کیا۔ حضرت ایوب انصاریؓ وہ بزرگ ہستی تھیں جو ذوق شہادت سے سرشار ہو کر پیرانہ سالی میں قسطنطنیہ کا سفر اختیار کیا۔ جہاد میں شرکت فرما کر جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کے جسدِ خاکی کو قسطنطنیہ کے دامن میں دفن کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ملک صاحب لکھتے ہیں۔

''جب سن 857 ہجری میں فتح قسطنطنیہ کی سعادت سلطان محمد دوم کو نصیب ہوئی تو حضرت ایوب انصاریؓ کی قبر کی تلاش شروع ہوگئی کیونکہ اقتدارِ زمانہ نے ان کے مزار مبارک کو زمین میں مستور کر دیا تھا تاہم ان کا مزار مل گیا تو وہیں پر ان کا شاندار روضہ تعمیر کیا گیا۔''

ملک صاحب میزبان رسولؐ کے گھر پر حضورؐ کی اونٹنی کے بیٹھنے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''قصوا چلتے چلتے بنونجار کے محلے میں پہنچی اور اس جگہ پر بیٹھ گئی جہاں آج کل مسجد نبویؐ کا بڑا دروازہ ہے جو حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر کے بالمقابل تھا۔ حضورؐ سواری سے نہ اترے قصوا پھر اٹھی اور چند قدم چل کر واپس ہوئی اور پھر اسی جگہ پر بیٹھ گئی جہاں پہلے بیٹھی تھی۔

حضرت ایوب انصاریؓ فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے

سرکار کائناتؐ نے ابوایوب انصاریؓ کے گھر چھ سات ماہ قیام کیا۔"

ملک صاحب آگے لکھتے ہیں:

"حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے مسجد نبویؐ
کی تعمیر ہوئی جو دنیائے اسلام کا پہلا مرکز بنا اور یہیں سے اسلام کا
نور پھیلنے لگا، مسجد کے ساتھ حجرے بنے انہی حجروں میں وہ حجرہ بھی
شامل ہے جس میں ام المومنین حضرت عائشہؓ رہتی تھیں اس حجرے
میں آپؐ کا وصال ہوا اور یہیں آپؐ کی تدفین ہوئی۔"

استنبول کی تعریف وتوصیف میں ملک صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے جملوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو استنبول کی اصل حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم شہر بے مثال جو ایشیا اور یورپ کے دلکش سنگم پر واقع ہے اور اس کے حق میں تعریفی کلمات بے ساختہ ہماری زبان پر آجاتے ہیں۔

استنبول کے بارے میں ملک صاحب کی خامہ کی زبانی سنیے:

"استنبول ترک مسلمانوں کی آبرو، پہچان اور شان ہے
یہ مسجدوں، میناروں، گنبدوں اور سبزہ زاروں کا شہر ہے یہ بین
الاقوامی شہرت کے حامل ترکوں، منگولوں، عربوں، یونانیوں اور
رومیوں کی ثقافت کا شہر بے مثال ہے۔ یہ ایشیا اور یورپ کے دلکش
سنگم پر ہے۔"

ملک صاحب حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار شریف پر حاضری دینے کے واقع کو ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

"حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار شریف پر حاضری دینے کو

میں اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں ان ہی کی عقیدت و محبت
مجھے کشاں کشاں استنبول لائی ورنہ میں کہاں اور یہ مقام کہاں۔"

ملک صاحب شہر استنبول جانے کی اس لیے خواہش کرتے تھے کہ وہاں پر حضور کریمؐ کے میزبان حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار ہے اس مرقد کو دیکھنے کی ان کے خانہ دل میں شدید خواہش تھی۔ چنانچہ رب کریم نے ان کی خواہش کو پورا کیا اور انہوں نے حضرت ایوب انصاریؓ کے مرقد کی زیارت کی اس ضمن میں وہ تحریر کرتے ہیں:

"کئی بار دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں طلسماتی شہر استنبول جاؤں اور اپنی آنکھوں سے اس فصیل کی زیارت کروں جہاں میرے آقائے نامدارؐ کے میزبان حضرت ایوب انصاریؓ کی مرقد ہے۔ اللہ اللہ آج میں یہاں کھڑا ہوں اور اپنے سر اور دل کی آنکھوں سے اس سحر انگیز شہر کو دیکھ رہا ہوں۔"

ایک جگہ ملک صاحب یونانی شاعر ہومر کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ آیونیا کے شہر علم و فضل کے مراکز رہے ہیں:

"آیونیا کے شہر علم و فضل کے مراکز رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ مشہور یونانی شاعر ہومر کوئی سات سو سال قبل از مسیح یہی پیدا ہوا تھا وہ ایرانیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے ان سے شدید نفرت کرتا تھا۔"

ملک صاحب کو تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے چنانچہ انہوں نے ترکی کے اہم تاریخی مقامات کی سیر کی ہے۔ اس سیر کے دوران انہوں نے توپ کاپی محل میوزیم کا بھی بغور مشاہدہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"توپ کاپی محل اور میوزیم کو توپ سرائے بھی کہتے ہیں یہ محل میوزیم

ایا صوفیہ کے عقب میں واقع ہے۔ یہ صبح 9 بجے عوام کے لیے کھل
جاتا ہے اور شام 5 بجے بند ہو جاتا ہے۔ منگل کو یہ میوزیم بند رہتا
ہے۔ حرم میں جانے کے لیے علیحدہ فیس لی جاتی ہے۔''

توپ کاپی محل اور میوزیم دیکھنے کے بعد وہ سلطان احمد پارک نیلی مسجد دیکھنے گئے جو وہاں سے قریب ہی تھا، وہ لکھتے ہیں:

''توپ کاپی محل اور میوزیم دیکھنے کے بعد ہم قریب ہی سلطان احمد
پارک چلے گئے 1556ء میں اسے اپنے وقت کے مشہور
آرکیٹیکٹ سنان نے تعمیر کیا تھا۔''

اسی ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

''سلطان محمد جامع مسجد یہاں اپنی منفرد شان رکھتی ہے
اسے نیلی مسجد بھی کہتے ہیں اس کے فن تعمیر میں قدیم چرچ کا عکس
بھی نظر آتا ہے اس کا ماہر تعمیر سنان کا شاگرد محمد آغا تھا لیکن محمد آغا
اپنے استاد سے اس مسجد کی تعمیر میں بہت آگے نکل گیا تھا۔''

ملک صاحب نے استنبول یونیورسٹی کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا ہے یہاں تفصیل میں جانا تو ممکن نہیں ہے اس لیے ان چند سطور پر اکتفا کیجیے۔

''میں یہاں استنبول یونیورسٹی کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جو وسیع
اراضی پر قائم ہے اور دنیا کے تمام علوم کی تعلیم یہاں دی جاتی
ہے۔ ہزاروں طلباء و طالبات یہاں زیر تعلیم ہیں ایک نئی بات یہ
دیکھی کہ یونیورسٹی میں شاہراہوں پر ہی نہیں بلکہ تعلیمی کمروں میں
بھی کیمرے نصب تھے۔''

ترکی کی شرح خواندگی 95 فیصد بتائی گئی ہے۔ 6 سے 15 سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے اور اس کے لیے کوئی فیس نافذ نہیں کی گئی۔

ملک صاحب ترکی سکہ کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کا موازنہ روپے سے کرتے ہوئے افسوس کرتے ہیں کہ ہماری کرنسی ترکی کے مقابلے میں بہت کمزور ہے وہ رقم طراز ہیں:

"ترکی سکہ کا نام لیرا ہے جو پاکستانی 54 روپے کے برابر ہے۔ افسوس ہماری کرنسی ترکی لیرا کے مقابلے میں بھی کمزور ہے۔"

ترکی کے ہوٹلوں اور دکانوں پر ترکی کے گانے ٹیپ ریکارڈر پر ہر وقت چلتے رہتے ہیں اور بعض اوقات تو کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی لیکن کسی کو اس شور کی پالیوشن پر اعتراض اٹھاتے نہیں دیکھا، سب لوگ گانے کی دھن سے لطف اٹھاتے نظر آتے ہیں۔"

ایک سیلاب زدہ وادی گولڈن ہارن کے نام سے منسوب ہے کسی دور میں یہ سلطانوں کے کھیلنے کا میدان تھا اور ان کے لیے سیر و تفریح کی جگہ تھی۔ گولڈن ہارن کے بارے میں ملک صاحب مسجد ایوب انصاریؓ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"گولڈن ہارن کی بالائی رسائی پر مسجد ابو ایوب انصاریؓ ہے جو ترکی کی مقدس ترین جگہ متصور کی جاتی ہے۔ حقیقت میں مکہ مدینہ اور یروشلم کے بعد جامع ابوایوب انصاریؓ اسلامی دنیا میں دمشق و کربلا کے بہ لحاظ تقدیس ہم پلہ ہے اور یہ مسلم زائرین کے لیے بہت ہی اہم مقام کی حامل ہے۔"

ملک صاحب باسفورس کی وضاحت اور صراحت اتنے آسان اور سہل انداز سے کرتے ہیں کہ ایک عام سا قاری بھی باسفورس کے بارے میں دِقت اور دشواری کے بغیر سمجھ جاتا ہے۔

''باسفورس کا معنی ہے گائے کا گھاٹ، دریا کے پانی کا وہ حصہ جسے آپ چل کر عبور کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں کم گہرے پانی کا دریا میں راستہ''

ملک صاحب جب ساحل پر پہنچے تو وہاں غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں نہانے اور غوطے لگانے میں مصروف تھیں یورپین عورتیں مختصر سے لباس میں جو نہ ہونے کے برابر تھا دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ چنانچہ وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی زبانی سنیے:

''یہاں غیر ملکی سیاح مرد جانگیہ یا نیکر پہنے اور عورتیں سوئمنگ سوٹ (سوئمنگ کاسٹیوم) یا محض ہلکی سی بکنی پہنے بہتے سمندر میں اٹھکیلیاں کرتی موجوں کے ساتھ دوڑ بھاگ اور رنگ رلیاں کر رہی تھیں۔ یہ بندہ بھی اس موج میلہ سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لہٰذا اس نیلگوں سمندر میں چند ایک ڈبکیاں لگا کر زندگی کا بھرپور ثبوت دیا۔''

یورپین عورتیں اپنے مختصر لباس میں نہایت مختصر سے لباس میں جو نہ ہونے کے برابر تھا ہر کس و ناکس کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں ایسے میں دل پر قابو پانا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ اور انہیں دیکھے بغیر خواہ حیرت سے کیوں نہ ہو بندہ بشر رہ نہیں سکتا۔ ویسے بھی اس

وسیع وعریض سمندر کا نظارہ آنکھیں بند کر کے تو نہیں کیا جا سکتا۔''

انٹالیہ جو کہ ریستورانوں، ترکی کھانوں، ترکی فن موسیقی اور ترکی قالینوں کی وجہ سے مشہور ہے یہ شہر اتنا پرکشش اور خوبصورت ہے کہ سیاحوں کے پاؤں باندھ کر رکھ دیتا ہے اور وہ وہاں زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر خوشی محسوس کرتے ہیں اس کے بارے میں ملک صاحب لکھتے ہیں:

''کیونکہ یہ ترکی کا حسین ترین شہر ہے یہ اتنا چھوٹا ہے کہ آپ چند دنوں میں اس کے پرکشش مراکز دیکھ سکتے ہیں یہ اتنا دلکش اور فرحت بخش مقام ہے کہ آپ کا دل زیادہ سے زیادہ یہاں قیام کرنے کو چاہتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا بھی یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔''

فن کو جغرافیائی حدود کی قیود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ فنون لطیفہ تمام ممالک کو ایک دوسرے کی تفہیم بھی کراتا ہے اور ان کی درمیانی فاصلوں کو کم بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ترکی موسیقی بھی دوسرے ممالک کے لوگوں کے درمیان ذہنی فاصلے گھٹانے اور ایک دوسرے کو قریب لانے میں بڑی معاون ثابت ہو رہی ہے۔ ملک صاحب کی زبانی سنیے۔

''ترکی موسیقی گزشتہ سو سال سے دنیا کو متاثر کر رہی ہے لیکن اب تو اسے اپنی خوبیوں کی وجہ سے بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے دنیا بھر کے سیاح یہاں آ کر موسیقی، رقص اور گانوں سے محظوظ ہوتے ہیں ترکی کا فطری علاقائی میوزک اپنے اندر بڑا تنوع رکھتا ہے۔''

ترکی کے سمندروں نے ملک صاحب کے اوراق دل پر گہرے اثرات مرتب

کیے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اگر میں ترکی کے سمندروں کا ذکر نہ کروں تو مجھ سے بڑی کوتاہی ہوگی۔ترکی قدرتی طور پر تین اطراف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔اس حوالے سے یہ خوبصورت ملک عظیم اہمیت کا حامل ہے۔اس کے تین اطراف میں سمندر ہونے کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ماضی میں مختلف قومیں ان سمندروں کے پانیوں کی اسیر ہوکراس کی طرف کھچی چلی آئیں۔سمندر کی خوبصورتی کے بارے میں ملک صاحب کے قلم کی زبانی سنیے:

> ''اس علاقہ کا بحری سفر نیلا بحری سفر کہلاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بجرے میں بیٹھ کر اس کے پانیوں میں سفر کرتے ہیں تو فیروزی نیلے رنگ کے صاف شفاف پرشکوہ سمندر آپ کو فرحاں وشاداں کردیتے ہیں آپ اسی وقت محسوس کرتے ہیں کہ آپ کسی باغ بہشت کے پانیوں پر تیر رہے ہیں۔''

ان سمندروں کے ساحل بھی خوبصورت اور فطری نظاروں کے حامل ہیں۔ خوبصورت اور پرکشش ساحلوں کی ترکی میں بہتات ہے جنہیں لوگ اپنی آغوش بصارت میں لاکر اپنی ذہنی پریشانیوں ،تھکاوٹ اور بوریت سے نجات حاصل کر کے تروتازہ اور شاداب ہوجاتے ہیں یہاں پر بھی مردوزن مختصر سے لباس میں بینچوں پر اس طرح الٹے سیدھے لیٹے ہوتے ہیں کہ نظر خود بخود ان کی طرف اٹھ جاتی ہے اس ضمن میں ملک صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہاں آپ کو لمبے بینچوں پر ننگ دھڑنگ مرد اور عورت ہلکی سی ستر پوشی کے ساتھ سیدھے یا الٹے لیٹے نظر آئیں گے۔''

''سیاحت نامہ ترکی'' پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود ملک

صاحب کے ساتھ اس حسین سفر میں شریک ہیں اور ان تمام مناظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ یہ سفرنامہ پڑھ کر اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ترکی کی سیاحت کی جا سکتی ہے اور چشم تصور میں ملک صاحب کے ساتھ شریک ہو کر ترکی کے تمام حسین مناظر خوبصورت مقامات اور تاریخی عمارات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ بلاشبہ ''سیاحت نامہ ترکی'' سفرناموں کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

☆☆☆

نذیر حق

سیاحت نامہ ترکی

ترکی پاکستان کا دوست اسلامی ملک ہے۔ جس نے تاریخ میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ ملک مقبول احمد جو کتابیں شائع کرتے ہیں، اس نئی روایت کے بانی بھی ہیں کہ وہ کتب شائع کرنے کے ساتھ ساتھ کتابیں لکھتے بھی ہیں۔ یعنی وہ پبلشر ہی نہیں اعلیٰ درجے کے مصنف بھی ہیں۔ عمر کی 80 ویں سرحد عبور کرتے وقت انہوں نے ترکی کا سفر کیا اور پھر اس سفر کا احوال بھی اس انداز میں تحریر کیا کہ کوئی جوان کیا لکھے گا۔ سفر نامہ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ملک صاحب نے یہ سفر مقامات مقدسہ کی زیارت کی روایت پوری کرتے ہوئے کیا ہے۔ تاہم انہوں نے ترکی کا نیا چہرہ، جسے آپ جدید ترکی کہہ سکتے ہیں۔ پوری طرح اجاگر کیا ہے۔ اس سفر نامہ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ کہ ملک صاحب نے یہ سفر اپنے خاندان کی معیت میں کیا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کے روضہ کی زیارت کے احوال کے علاوہ ملک صاحب نے کئی دیگر اہم تاریخی مقامات اور عمارات کی سیر کا بھی حال بیان کیا ہے۔ ان کا طرز بیان ایسا ہے کہ قاری خود کو ان کی سیر میں شامل محسوس کرتا ہے۔

مصنف نے جہاں ترکی کی تاریخ اور مختلف ادوار کی حکومتوں کا حال بیان کیا ہے وہاں ترکی کی موجودہ جمہوری اسلامی حکومت کے کارہائے نمایاں بھی عمدگی سے بیان کئے ہیں اور یوں ایک دوست اسلامی ملک کی سیر کا حق ادا کیا ہے۔ کتاب نہایت عمدگی سے رنگین تصاویر کے ساتھ مزین کر کے طبع اور پیش کی گئی ہے۔ اور قیمت بالکل مناسب ہے۔

ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

سیاحت نامہ ترکی

کچھ عرصہ پہلے ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' شائع ہوئی تو مجھے خوشی ہوئی کہ ایک شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ ملک کے نامور مصنفین اور ان کی تصنیفات کے ساتھ گزرا تھا، اس کے اپنے باطن میں بھی ایک ادیب موجود تھا۔ جسے ان کے پوتے، پوتیوں اور نواسے اور نواسیوں نے باہر نکالا اور اس کتاب کی پذیرائی اتنے وسیع پیمانے پر ہوئی کہ ملک صاحب نے اپنے اشاعتی ادارے کو اپنے بچوں کے سپرد کر دیا اور خود تصنیف و تالیف کے شوق کی تکمیل کرنے لگے۔ اور اب تک ان کی کئی تالیفات مثلاً ''اہل قلم کے خطوط''، ''پذیرائی''، ''گم شدہ افسانے''، ''ارمغانِ غزل''، ''گلشن ادب'' چھپ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود، اظہر جاوید، ڈاکٹر طارق عزیز، علی سفیان آفاقی، پروفیسر جمیل آذر نے انہیں ادیبوں کی صف میں شامل کرلیا ہے۔

ملک مقبول احمد کی زیرِ نظر کتاب ''سیاحت نامہ ترکی'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ اس مسلم برادر ملک میں میزبان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار اقدس کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ارشد مقبول ترکی کی سیر کا حال بتاتے تو ملک مقبول احمد انہیں بڑے شوق سے سنتے، لیکن جب انہیں سعودیہ جانے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو وہ حضرت ایوب انصاریؓ کے حالات سن کر بہت متاثر ہوئے، اور ان کے مزار پر حاضری

دینے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ان کا ترکی کا سفر سعادت اس داخلی شوق کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اس سفر کے دوران زیادہ قیام استنبول میں کیا اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے روضہ کی زیارت سے اپنی روح کو سیراب کیا، اور واپس آئے تو ڈاکٹر ارشد مقبول نے جوان کے ہم سفر بھی تھے انہیں یہ سفر نامہ لکھنے کی ترغیب دی۔ اس کتاب کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ترکی کے سفر پر جانے کی خبر کسی کو نہیں ہونے دی تھی لیکن جب واپس آئے اور ترکی کے تحائف تقسیم کیے تو ان کے احباب نے بھی اس سفر مقدس کے تاثرات قلم بند کرنے کا تقاضا شروع کر دیا۔

میں نے اس سفر نامے کو زیر نظر تبصرے کے لیے بالاستیصاب پڑھا تو محسوس کیا کہ ملک مقبول احمد نے استنبول کو صرف عقیدت کی نظر سے دیکھا اور جب یہ سفر نامہ لکھا تو سفر کو ذہنی سطح پر دوبارہ زندہ کیا ہے...... لیکن اپنے مشاہدات اور نظارہ جات کے ساتھ تاریخ بھی ان کے ہم رکاب تھی۔ اور ترکی کے ماضی کے ساتھ اس کے "حال" پر بھی روشنی ڈال رہے تھے۔ سولہ ابواب کی یہ کتاب ایک سطح پر ملک مقبول احمد کا نظر نامہ ہے۔ لیکن دوسری سطح پر انہوں نے سفر تو جغرافیے میں کیا ہے لیکن بازیافت تاریخ میں کیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ گزشتہ دس سال کی قلم نگاری کے دوران انہوں نے اپنے اظہار پر قدرت حاصل کر لی ہے اور اس سفر نامے کو ایک تخلیقی ادب پارہ بنا دیا ہے۔ جس کی تحسین ڈاکٹر جمیل آذر، ڈاکٹر طارق عزیز اور پروفیسر شبیر حسین شاہ نے اپنے پیش الفاظ میں کی ہے۔ جمیل آذر صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "میں ترکی سے پہلے اس طرح واقف نہیں تھا جس طرح ملک صاحب کا "سیاحت نامہ ترکی" پڑھ کر واقف ہو گیا ہوں۔" کتاب خوبصورت تصویروں سے آراستہ ہے۔

☆☆☆

۵۰
نامور ادبی شخصیات

◆◆

فہرست

ڈاکٹر انور سدید

۵۰ نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول کی بنیادی حیثیت تو اعلیٰ معیار کی خوبصورت اور متنوع موضوعات کی کتابیں چھاپنے والے ایک ناشر ہی کی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کتابوں کے ماحول اور اعلیٰ پائے کے مصنفین میں بیٹھنے کا موقع ملا تو ان کے باطن میں بھی ایک قلم کار پرورش پانے لگا۔ ملک کے معروف ادیب علی سفیان آفاقی نے لکھا ہے:

''اگرچہ ان کا اب بھی یہی اصرار ہے کہ وہ ادیب نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں اس کی نفی کرتی ہیں...... ملک مقبول احمد نے (خودنوشت ''سفر جاری ہے'' میں) انتہائی سلیس بامحاورہ اور سادہ زبان لکھ کر سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔'' اور میں خود بھی تحیر زدہ ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے سامنے ان کی نئی کتاب پڑی ہے جس کا عنوان ہے ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' اور ان کے بارے میں آفاقی صاحب رقمطراز ہیں:

''یہ وہ قلمی تصویریں ہیں جو انہوں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے سپرد قلم کی ہیں......

(ان) ادیبوں اور شاعروں کے وہ ناشر بھی رہے اور قریبی آشنا اور ملاقاتی بھی۔''

ملک مقبول احمد نے جن ممتاز ادیبوں کی شخصیت نگاری کی ہے ان میں احسان دانش، میرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا، وحید قریشی، اظہر جاوید، غلام الثقلین نقوی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر صفدر محمود اور مولانا حامد علی خان جیسے نامور ادبائے کرام ہی شامل نہیں بلکہ اس محفلِ ادب میں جناب تنویر حسین، صائمہ نورین بخاری، غفور شاہ قاسم اور ناصر نقوی جیسے نسبتاً نئے ادباء بھی موجود ہیں۔ ملک صاحب نے ہر شخص کو اس کے نجی ورتارے سے پرکھا اور ان کی خوبیوں کا

عکس اپنے دل پر نقش کرلیا۔اب یہ نقش کاغذ پر اُتر آیا ہے تو یہ ان کے کردار کا آئینہ بھی بن گیا ہے اور پوری تصویر تعلقات کے تناظر کو بھی آشکار کرتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً احسان دانش، کے تذکرے میں وہ ان احسانات کو بھی گنواتے ہیں۔ جو رسالہ ''چودھویں صدی'' کے سلسلے میں احسان دانش نے کسی اظہار کے بغیر ان پر کیے۔ رئیس احمد جعفری نے مقبول اکیڈمی کے آغاز میں ان کے ساتھ عملی معاونت کی۔ ملک مقبول احمد نے ان کا ذکر وفورِ عقیدت سے کیا ہے۔ تخلیق کے ایڈیٹر اظہر جاوید کو داد دیتے ہیں کہ کوئی اپنی کتاب ان کی اکیڈمی سے نہیں چھپوائی لیکن اچھی کتابوں اور مصنفین کو ان کے ادارے سے متعارف کرانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ان کی عینک کے شیشے اتنے صاف ہیں کہ انہیں اپنے کردار کی صرف خوبیاں نظر آتی ہیں۔ مولانا حامد خان کے بارے میں ان کا مشاہدہ تھا کہ

''دفتر کے اوقات میں گپ شپ لگانا ان کے لئے کفر تھا۔ تاہم وہ تنگ مزاج یا تنگ مزاج یا تنگ نظر نہیں تھے۔ مسکراتے تو سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو ان کی خوشی کا احساس ہو جاتا۔''

وزیر آغا کے بارے میں ان کی وفات کے بعد یہ رائے دی:

ان کا کام سرسید، حالی اور آزاد کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا اور آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کریں گی۔'' یہ کتاب اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ ہمارا معاشرہ اور بالخصوص ادبی معاشرہ صاحبِ کردار افراد سے خالی نہیں۔ پچاس نامور شخصیات کی یہ کتابی پکچر گیلری ہے۔

☆☆☆

پروفیسر جمیل آذر

۵۰ نامور ادبی شخصیات

چودھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے عظیم شاعر چاسر (Chaucer) نے جب اپنی شاعری کی کتاب پرولوگ ٹو دی کنٹر بری ٹیلز (Prologue to the canterbury tales) دنیائے ادب میں پیش کی تو اہلِ فکرونظر نے اُسے قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس پرولوگ میں کل انتیس کردار ہیں جو فنکشنل ہیں لیکن چاسر نے انہیں حقیقت کا روپ دے کر جاوداں کر دیا۔ آج بھی ہم ان کرداروں سے جب متعارف ہوتے ہیں تو لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پرولوگ ایک ایسی پکچر گیلری ہے کہ جس میں ناظر دنیا و مافیہا سے بے خبر ڈوب جاتا ہے۔ اس میں سارے کردار تقریباً متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے مگر جانے پہچانے ملتے ہیں جو نہ صرف اُس وقت موجود تھے بلکہ آج بھی موجود ہیں۔ چاسر نے ان کرداروں کے نہ صرف ظاہری خدوخال کو اُجاگر کیا بلکہ اُن کے باطنی پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا۔ جس میں رمز و کنایہ سے اُن کی کمزوریوں کو بڑی چابکدستی سے اس طرح پیش کیا کہ قاری بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد ہی بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ملک مقبول احمد کی تازہ تصنیف ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی دلپذیر پکچر گیلری ہے۔ جب آپ اس گیلری میں داخل ہو کر ان شخصیات کو دیکھتے اور پڑھتے ہیں تو آپ ایک طلسماتی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سارے محترم کردار ہمارے عصرِ حاضر کی حقیقی نامور شخصیات ہیں۔ چاسر پورے معاشرے کی

عکاسی کرتے ہوئے اپنے تخلیق کردہ کرداروں کی بشری کمزوریوں کو فنی حربوں یعنی رمز و کنایہ (Irony) اور مزاجِ لطیف (Subtle H umour) سے آشکار کر کے نہ صرف خود مزے لیتا ہے بلکہ ہمیں بھی اس میں بھرپور شرکت کی دعوت دیتا ہے آپ جونہی اس پکچر گیلری میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کی ملاقات نائٹ(Knight) سے ہوتی ہے جو صلیبی جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا رہا ہے۔ پھر آپ کا سامنا نوجوان سکوائر (Squire) سے ہوتا ہے۔ جسے آپ آج کل لیفٹینٹ کہہ سکتے ہیں جو جنگوں میں حصہ لینے کے لیے بے قرار ہے تاکہ شجاعت کے تمغے اس کی وردی پر سج جائیں۔ اسی طرح آپ کہیں چرچ سے تعلق رکھنے والے کرداروں، کہیں وکالت کے پیشہ سے وابستہ، وکیل اور دیگر پیشوں سے منسلک کردار مثلاً چکی والا، ڈاکٹر، تاجر، باورچی (Cook)، ملاّح اور خواتین میں زوجۂ باتھ (The wife of Bath)، اور چرچ سے وابستہ متقی نازک اندام پرائریس (Prioress) وغیرہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ سب کردار اگرچہ چاسر کے تخلیق کردہ ہیں مگر آپ کو وہ زندگی سے بھرپور حقیقی نظر آئیں گے۔ جو اپنے اپنے پیشوں سے منسلک ہونے کی وجہ سے اُن سب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب زائرین (Pilgrims) ہیں جو کنٹربری ہیں۔ مدفون مقدس بزرگ کی درگاہ پر زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

چاسر کی پکچر گیلری کے برعکس ملک مقبول احمد نے صرف اہل قلم کی گیلری سجائی ہے۔ جہاں ادیب، شاعر اور صحافی جلوہ گر ہیں۔ چاسر اپنے کرداروں کا پرولوگ میں تعارف ایک غیر وابستہ تماشائی (Detached Spectator) کی حیثیت سے کراتا ہے۔ جن میں ظاہری خوبیوں میں چھپی کمزوریوں کو نشان زد کر کے عمومی طور پر معاشرے میں پھیلی بدعنوانی، منافقت، ہوسِ زر، لالچ اور خودغرضی کو بے نقاب کرتا ہے۔ یوں اس کے

ہاں افسانے (فکشن) اور حقیقت (Reality) کا خوبصورت امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔ ملک مقبول احمد ہمدردی، محبت اور عقیدت سے بھرپور اپنے محترم کرداروں کے ساتھ روحانی طور پر وابستہ شاہد (Spiritually attached observer) ہیں۔ ملک مقبول احمد ایک ایسے قلمکار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جو اپنے حقیقی کرداروں کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور بشری خامیوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ یہ ملک صاحب کے مشرقی مزاج کا بھی تقاضا ہے اور اُن کی بچپن کی تربیت کا بھی اس میں دخل ہے۔ یہ پچاس نامور ادبی شخصیات وہ ہیں جن سے وہ محض شناسا نہیں بلکہ اُن سے محبت و مؤدت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ان میں بعض شخصیات اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ جن کی بلندیٔ درجات کے لیے وہ ہر دم دُعا کرتے ہیں اور ان کا شاندار تعارف نہایت ادب واحترام سے کراتے ہیں۔ اُن کے ادبی کارناموں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اُن کے احسانات بیان کر کے اُن کا تہہِ دل سے شکرگزار ہوتے ہیں۔ یہ رئیس احمد جعفری ہیں جنھوں نے ازراہِ لطف وکرم چند ملاقاتوں میں اپنے دو ناولوں کے مسوّدے دیئے جنہیں پا کر ملک صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ مسوّدے پا کر وہ انارکلی بازار میں احسان دانش کے پاس اُن کے مکتبہ ایبک روڈ پر جاتے ہیں۔ ان کتابوں کے مسوّدے دیکھ کر انہوں نے پیش گوئی کی۔

> "ان دو ناولوں کی اشاعت آپ کے نئے ادارے کے لیے نیک فال ثابت ہوگی۔"

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب جعفری صاحب کے ناول ناشروں کے لیے سونے کی کان ہوا کرتے تھے۔ ملک مقبول احمد نے یہ دونوں ناول نہایت اہتمام کے ساتھ اعلیٰ کاغذ پر اور غلطیوں سے پاک شائع کیے تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ ان کتابوں کے پہلے دو نسخے لے کر جب وہ جعفری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور

فرطِ مسرت سے انہیں گلے لگا لیا۔ ملک صاحب کو ایسا لگا کہ جعفری صاحب نے اپنی ادبی محنت کا سارا پھل اُن کی جھولی میں ڈال دیا۔ ملک مقبول احمد کا شکر گزاری کا یہ خوبصورت انداز ہے۔

مولانا حامد علی خاں صاحب کے بارے میں وہ ہمیں گرانقدر معلومات عطا کرتے ہیں اور اُن کا تعارف بصد احترام کراتے ہیں۔

"مولانا حامد علی خان اس انگریز دشمن خاندان کے فرد تھے جس کے بعض افراد نے سیاست اور صحافت کے وسیلے سے وطنِ عزیز کو برطانوی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی صرف کردی تھی۔ قوم کا یہ فردِ جلیل ظفر علی خان تھے۔ جنہوں نے اپنے اخبار "زمیندار" کے ذریعے انگریزی حکومت اور آل انڈیا کانگریس کا ناطقہ بند کیے رکھا۔"

"حامد علی خان، ظفر علی خان کے بھائی تھے۔ اُن کے جدِ امجد مولوی سراج الدین نے وزیر آباد کے قریب اپنا گاؤں کرم آباد کے نام سے قائم کیا تھا اور اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور ادب کے فنی رموز سکھائے۔ چنانچہ اس خاندان کے بیشتر بچے بڑے ہو کر اردو کے نامور ادیب بنے۔ ان میں ظفر علی خان حامد علی خان، حمید احمد خان، راجہ مہدی علی خان، فاروق علی خان اور خواتین میں سے حمیدہ بیگم (ح۔ب صاحبہ) اور زہرہ بیگم (ز۔ب صاحبہ) بہت مشہور ہیں۔"

بعد ازاں ملک صاحب نے ان کے ادبی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا اور اُن سے اپنی ملاقات کا تذکرہ اس خوبصورتی سے کیا کہ لطف آ گیا۔

''مولانا حامد علی خان کے ساتھ میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب مقبول اکیڈمی لاہور میں اپنا مقام بنا چکی تھی۔ اور اس کی چھپی ہوئی کتابوں پر ملک کے طول و عرض کے ادبی رسائل میں شاندار ادبی تبصرے چھپ رہے تھے۔ مولانا حامد علی خان سادہ طبع انسان اور ہمدرد خلائق شخصیت تھے۔ مقبول اکیڈمی کی چھپی ہوئی کتابوں کی انہوں نے ہمیشہ قدر افزائی کی اور کتاب چھپ کر آتی تو اس کی تحسین خط لکھ کر کرتے۔ میں کبھی دفتر میں حاضر ہوتا تو اُٹھ کر ملتے اور جتنی دیر وہاں بیٹھتا صرف کاروباری باتیں ہی کرتے۔ دفتر کے اوقات میں گپ شپ لگانا ان کے لیے کفر تھا۔ تاہم وہ تنک مزاج یا تنگ نظر نہیں تھے۔ مسکراتے تو سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو ان کی خوشی کا احساس ہو جاتا۔ میں نے انہیں قہقہہ مارتے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی دوستی ''ادبی دنیا کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر سے تھی۔ کبھی کبھی یہ دوست مل کر مقبرہ جہانگیر پر چلے جاتے اور دن بھر پکنک مناتے۔ ان میں سے ہر ادیب کا مزاج مختلف تھا لیکن سب کی دوستی پکی تھی اور دوسرے کی عزت دل و جان سے کرتے تھے۔''

اس مختصر سے تعارف میں مولانا حامد علی خان کی عظیم شخصیت ہمارے سامنے زندہ ہو جاتی ہے۔ عظیم لوگوں کے دوست بھی عظیم ہوتے ہیں۔ ملک مقبول احمد صاحب اپنے اسلوبِ بیان میں ایجاز و اختصار کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ چند جملوں اور لفظوں سے شخصیت کی تصویر پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ اب ایسی نابغۂ روزگار شخصیات کہاں؟ ہم دوستوں کو

اپنی کتاب بھیجتے ہیں تو وہ ملنے کی اطلاع تک نہیں دیتے حتیٰ کہ آپ خود ہی فون کر کے کتاب کے ملنے کی تصدیق کرتے ہیں۔ شکریہ ادا کرنا تو در کنار۔ ادبی رسالہ ہمایوں اُن کی ادارت میں چھپتا رہا۔ ازاں بعد انہوں نے اپنا مجلّہ الحمراء نکالنا شروع کیا۔ اب یہ رسالہ اُن کے ہونہار بیٹے۔ شاہد علی خان صاحب ہر ماہ باقاعدگی سے نکالتے ہیں اور اس میں چھپنا باعثِ افتخار ہوتا ہے۔ شاہد علی خان صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے نام کو زندۂ جاوید رکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس نیک کام کا اجرِ عظیم دے۔

ملک مقبول احمد اپنے ادیب دوستوں کا تعارف کرانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اُن کا اندازِ تعارف میں بلا کی بے ساختگی، سادگی اور پرکاری ہے۔ دیکھئے حمید کاشمیری کا تعارف وہ کس خوبصورتی سے کراتے ہیں۔

''حمید کاشمیری جن کا پیدائشی خاندانی نام عبدالحمید تھا، ۱۹۲۹ء میں بانسرہ گلی (مری) میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن سری نگر کشمیر تھا لیکن والد غلام نبی تلاشِ روزگار میں نکلے تو بانسرہ گلی میں آ کر آباد ہو گئے۔ حمید کاشمیری کی پرورش مری کی خوشگوار وادیوں میں ہوئی لیکن شومئی قسمت سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن فطرت نے انہیں حالات کا مطالعہ غور سے کرنے اور واقعات کا تجزیہ کرنے کی عمدہ صلاحیت عطا کی تھی۔ ماں کی گود ہی اُن کا گہوارہ بن گئی اور اُن سے کہانیاں سنتے سنتے وہ کتابوں کی طرف راغب ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے تھے اور خود بھی کہانیاں لکھنے لگے تھے جو ملک کے ادبی حلقوں میں پسند کی جانے لگیں تو عبدالحمید کے اندر سے افسانہ نگار حمید کاشمیری بیدار ہو گیا۔ جس نے کراچی کی

گلیوں میں زندگی کو قریب سے دیکھا اور گلی کے ہر موڑ پر ایک زندہ
کہانی کو چلتے پھرتے دیکھا تو اس کا نقش کاغذ پر اُتار دیا۔"

آپ نے غور کیا اس مختصر سے پیراگراف میں ملک صاحب نے نہ صرف ہمیں حمید کاشمیری کی بچپن کی زندگی سے متعارف کیا بلکہ اُن کا افسانہ نگار بننے کی صلاحیت کو بھی اُجاگر کیا۔ اُن کی افسانہ نگاری پر تحقیق وتنقید کے حوالے سے مشہور ناقدین کی آراء کو بھی منظر عام پر لاتے ہیں۔ ممتاز نقاد فرمان فتح پوری نے لکھا:

"حمید کاشمیری کے افسانے موضوعات کے لحاظ سے رنگا رنگ ہیں
اور سوچ کو احساس اور جذبے میں ڈھالنے کے بعد قلم اُٹھایا ہے۔"

اسی طرح وہ مُشفق خواجہ کا حوالہ دیتے ہیں جو اُن کے فن کے بارے میں کہتے ہیں:

"حمید کاشمیری عام افسانہ نگاروں کی طرح افسانہ نگاری نہیں کرتا بلکہ
کرداروں کی چند خصوصیات کو اس طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ کہ اُن کی
پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔"

ملک مقبول احمد نے اُن کے جو افسانوی مجموعے شائع کئے اُن میں دیواریں، "سرحدیں"، "ادھورے خواب"، "کافی ہاؤس" اور منٹو ادبی عدالت میں" شامل ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا ذکر وہ نہایت ادب سے کرتے ہیں اور محققانہ انداز میں اُن کی تدریسی، انتظامی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کی ادبی خدمات اور ادبی کارناموں کو سراہتے ہیں۔

"ڈاکٹر وحید قریشی اُردو زبان وادب کے نامور محقق، ممتاز تنقید نگار،
شاعر اور دانشور تھے۔ میں اُن کا شمار ایسی ادبی شخصیات میں کرتا
ہوں۔ جن کا نام لیتے ہی گردن ادب سے جھک جاتی ہے۔"

ان دو جملوں میں ملک صاحب نے حفظ مراتب کا بڑا خیال رکھا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کا تعارف ایک باشعور نقاد کی حیثیت سے کراتے ہیں۔

''میرے خیال میں ڈاکٹر وزیر آغا اردو کے واحد مصنف تھے جن کی شاعری اور تنقید کا سکہ ان کی زندگی میں پوری اردو دنیا میں چلتا رہا اور جن کے نظریات سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اُن کا انفرادی اعزاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اُردو کی ایک ناموسوم صنف کو جس میں اپنی ذاتی پسند کے حوالے سے کی جاتی ہے۔''انشائیہ'' کے نام سے موسوم کیا اور اس صنف میں ایسی اعلیٰ پائے کی تخلیق کاری کی کہ جناب مشتاق احمد یوسفی نے انہیں اس صنفِ ادب کا بانی قرار دیا۔''

ملک مقبول احمد صاحب نے اُن کی ادبی دنیا اور اوراق کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اُن کی تمام تصانیف سے ہمیں متعارف کیا۔ اس بھرپور تعارف سے ہم ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی کنٹری بیوشن کو یکجا دیکھ کر استفادہ کر سکتے ہیں۔

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' کے عین مطابق احسان دانش اُن لوگوں میں سے ہیں جو محنت و مشقت کی بھٹی میں سے گزر کر کندن بن جاتے ہیں۔انہوں نے زندگی کا آغاز ایک مزدور کی حیثیت میں کیا تھا لیکن علم کی لگن اور اس کے حصول کو جاری رکھتے ہوئے ملک کے مشہور و معروف شعراء میں شمار ہونے لگے۔ملک مقبول احمد صاحب جب لاہور آئے تو رسالہ ''چودھویں صدی'' کا منصوبہ بھی اپنے ساتھ لائے۔ملک صاحب کو انتظامی امور کا تجربہ تو تھا لیکن ادب کی اصنافِ نظم و نثر اُن کے محدود مطالعے کے باوصف اُن کی دسترس سے باہر تھے۔ لہٰذا اس سلسلے میں وہ حضرت احسان دانش کے ذاتی مکتبہ جو

ایبک روڈ پر تھا گئے اور اُن سے اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کے بعد پرچے کی ادارت قبول کر لی اور اُن پر ایک پابندی بھی لگا دی جس کا ذکر آپ ملک صاحب کے الفاظ میں سنیے! ''تاہم انہوں نے مجھے اس شرط کا پابند بنا رکھا تھا کہ اس پرچے میں چھپنے والے سب مضامین میں خود بھی پڑھا کروں گا اور جو بات مجھے سمجھ نہیں آئے گی اس کی وضاحت خود احسان دانش فرمائیں گے۔ اس وقت تو مجھے یہ مشقت نظر آتی تھی لیکن اب سوچتا ہوں تو واضح ہو جاتا ہے کہ احسان دانش میری تربیت کر رہے تھے۔ مطالعے کا ذوق پیدا کر رہے تھے۔ مضامین کی پرکھ پہچان کا سلیقہ پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ یہ تربیت اس وقت میرے لیے بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ جب میں نے مقبول اکادمی شروع کی اور ادیبوں کے مسودوں کا فیصلہ کرنا میری ذمہ داری بن گئی۔'' ملک صاحب آج تک حضرت احسان دانش کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے قدم قدم پر اُن کی راہنمائی کی اور اُن کے مشکل وقت میں کام آئے۔ اُن کا تعارف ملک صاحب نے اس خوبصورتی سے کرایا ہے کہ پڑھنے والے کے لیے احسان دانش ایک ایسی شخصیت کے طور پر ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں کہ جن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آپ اپنی زندگی کو اپنے اور دوسروں کے لیے کارآمد بنا سکتے ہیں۔ یہ احسان دانش کی تربیت اور شخصیت کا ہی فیض ہے کہ آج ملک مقبول احمد ناشر ہونے کے ساتھ ساتھ بطور ادیب بھی ادباء کی صف میں قابلِ قدر مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اُن کی پہلی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کو ملک کے سینکڑوں ممتاز ادیبوں نے پذیرائی بخشی۔ اُن کے دلچسپ، سادہ اور سلیس اسلوبِ تحریر کو سراہا۔ اُن کے مشاہدے، تجربے اور خلوص کی داد دی۔ متعدد ادباء نے اس خودنوشت پر گراں قدر تبصرے لکھے۔ اس خاکسار نے تو اس پر پوری کتاب لکھی جو راہ نوردِ شوق کے نام سے شائع ہوئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی آپ بیتی لکھنا بڑا مشکل کام ہے لیکن ملک صاحب نے یہ مشکل کام اس لیے آسان کر دکھایا

کہ وہ اپنی ذات کے خول سے نکل کر اہلِ قلم کو اپنے ساتھ شریک کرتے چلے گئے اور عین!
اس شعر کے مطابق ایک مستنیر قافلہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
اور لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

یہ ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' اسی قافلہ کے نامور افراد ہیں جن میں وہ یونانی دیو مالائی کردار نارسی سس (Narcissus) کی طرح اپنا ہی عکسِ جمیل دیکھ کر سرشار ہو جاتے ہیں۔

ملک مقبول احمد صاحب نہایت شگفتہ مزاج ہیں یہ شگفتگی ان کی تحریروں میں بھی خوشبو کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ بعض اوقات وہ اپنی ملاقات اور گفتگو میں بڑے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی کا تعارف بڑے شگفتہ ڈرامائی انداز سے کراتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''اردو کے شریف ترین ادیبوں کی مختصر ترین فہرست بھی بنائی جائے تو اس میں سید غلام الثقلین نقوی کا نام ضرور شامل ہوگا۔ وہ جب گلے میں مفلر ڈال کر مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ مولانا الطاف حسین حالی نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ مقبول اکیڈمی ان کی آمد سے مہک اُٹھتی۔ ایک واقعے کی یاد مجھے آتی ہے۔ تو میں خود بخود مسکرانے لگتا ہوں۔ میں نے ''مسدس حالی'' کا ایک ایڈیشن شائع کیا تو ایک دن غلام الثقلین نقوی آ گئے۔ میں نے اُٹھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ ان دنوں اُن کی کتاب ''سرگوشی'' میرے ادارے میں زیرِ اشاعت تھی۔ میں نے نقوی صاحب کو دیکھتے ہی کہا'' آیئے آیئے

نقوی صاحب آپ کی کتاب چھپ گئی ہے!'' خوشی سے اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ میں نے بھی اُن کے اشتیاق سے مزہ لیا اور اُٹھ کر کتاب پیش کی۔ دیکھ کر بولے یہ تو ''مسدس حالی'' ہے۔ میں نے جواب دیا۔''نقوی صاحب! آپ ہمارے عہد کے مولانا حالی ہیں۔ میں نے یہ تاثر آپ کی کتاب ''سرگوشی'' پڑھ کر قائم کیا۔'' نقوی صاحب نے میری بات کا نہ بُرا منایا اور نہ پسند کیا صرف یہ کہا ''کہاں مولانا الطاف حسین حالی اور کہاں غلام الثقلین نقوی۔''۔ میں نے اسی وقت اُن کی کتاب کا ایک نسخہ پیش کر دیا تو اُن کی آنکھیں دوبارہ خوشی سے چمک اُٹھیں اور میرے ساتھ گلے ملنے کے لیے کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔''میں یہ ابتدائی تعارفی کلمات اور واقعہ پڑھ کر بیحد محظوظ ہوا۔ یہ ہے کہ وہ مزاح لطیف (Subtle Humour) جو چاسر نے پرولوگ میں اپنے الفاظ سے پیدا کیا اور یہاں ملک مقبول احمد نے ڈرامائی انداز میں ایک واقعہ بیان کر کے پیدا کیا ہے۔ ایسا ہی شگفتہ حیران کن ڈرامائی انداز انہوں نے مجھ سے پہلی ملاقات کے حوالہ سے کیا۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ اُن کا ایک دوست مجھے ملنے آ رہا ہے۔ آپ ذرا اپنے گھر کا پتہ اور آس پاس کی نشانیاں بتا دیں۔ میں نے انہیں اپنے گھر کا پتہ دیا اور کہا کہ چاندنی چوک سے بائیں طرف مڑ کر فلاں جگہ پہنچیں۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ بہ نفسِ نفیس وہ خود تشریف لائے ہیں۔ میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ غلام الثقلین کے بارے میں ان ابتدائی کلمات کے

بعد انہوں نے اُن کی زندگی کے حالات اور اُردو افسانہ نگاری میں
اُن کی گراں قدر خدمات بیان کیں۔ اُن کی تقریباً تمام تصانیف کا
ذکر کر کے اُن کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔ اور ایک زیرک نقاد اور محقق
کی طرح مختلف حوالے دے کر بتاتے ہیں کہ وہ دیہات نگار ہیں اور
درانتی، کدال، پانی، ہوا اور مٹی تک کو اپنے افسانوں میں موضوع بنا
کر پیش کیا۔

مزاح لطیف کے حوالہ سے مجھے اُن کا علامہ عبدالستار عاصمؔ پر کتاب میں تحریر کردہ
تعارف بے اختیار یاد آ گیا۔ عاصم صاحب، ملک مقبول احمد سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں
لیکن وہ انہیں اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔ یہ سارا تعارف نامہ مزاح لطیف کو اپنے
دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اُن کے بسیار مطالعہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے
انہیں علم کی دولت سے سرفراز کیا ہے، جس میں اضافہ کرنے کے لیے وہ پاکستان میں چھپنے
والی ہر کتاب کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کی خاص خوبی یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ اپنی ذات
تک محدود نہیں رکھتے بلکہ پاکستان کے تمام اہم اخبارات میں اس کی خبر بھی چھپوا دیتے ہیں۔
لطیفے کی بات یہ ہے کہ وہ صبح کا ناشتہ اخبارات سے کرتے ہیں۔'' وہ چونکہ ملنسار شخصیت ہیں۔
ملک صاحب اپنی دوستی کے حوالے سے اُن کا ذکر بڑے شگفتہ انداز میں کرتے
ہیں۔ ''''علامہ عبدالستار عاصمؔ میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بہت
لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عبدالستار عاصمؔ کے پاس ضرور کوئی گیدڑ سنگھی
ہے کہ کئی ویلے مشٹنڈے، آوارہ گرد، اٹھائی گیرے، فلمی اداکار، صحافی، ادیب، صنعت کار،
سیاستدان، علماء، وکیل شاعر وغیرہ اُن کے گرویدہ ہیں۔ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے
ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت لاہور میں وہ واحد ادیب صحافی ہیں جن کا کوئی دشمن

نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دشمن سے بھی ملیں تو اس کو پہلے مٹھائی کا ڈبہ پیش کر دیتے ہیں۔'' یہ خوبصورت مزاح لطیف (Subtle Humour) کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ اُن کی تاریخ پیدائش کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے'' جناب عبدالستار عاصم کی تاریخ پیدائش پاکستان کے تاریخ پیدائش سے ہم آہنگ یعنی وہ ۱۴ اگست کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت پاکستان ۲۳ ویں برس کا ہو چکا تھا۔ یعنی یہ ۱۹۷۰ء کا سال تھا۔'' علامہ عبدالستار عاصم کا تعارف خاکہ نگاری کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اب ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ تاریخ پٹیالہ، تاریخ پنجاب، کلیات گیلانی اور صحافتِ شہر لاہور کے بعد انہوں نے مولانا سرفراز نعیمی شہید پر ایک جامع کتاب شائع کی ہے۔ علامہ عاصم پر لکھا خاکہ اور تعارف نہایت دلچسپ، شگفتہ اور پُر لطف ہے۔

اس کتاب میں شامل جتنے بھی محترم کردار ہیں انہوں نے ''خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر'' کے مطابق اپنی زندگیوں کو محنت، مشقت، دیانت، صداقت اور خلوص کے ساتھ خود بنائیں اور نام پیدا کیا۔ یہ اظہر جاوید صاحب ہیں جو گزشتہ چالیس سال سے ادبی مجلہ ''تخلیق'' نامساعد حالات کے باوجود بڑی باقاعدگی سے نکالتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں کرتے، اچھے اچھے پرچے نقوش، فنون اور اوراق قصہ پارینہ بن گئے ہیں لیکن ''تخلیق'' اس پُر آشوب دور میں بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سدا اس کو زندہ رکھے۔ اظہر جاوید صاحب کا تعارف وہ اس طرح کراتے ہیں:

> ''اظہر جاوید کو میں ان نوجوانوں میں شمار کرتا ہوں جنہوں نے تعلیم کی سندیں حاصل کرنے کے بعد ادب کے تحقیقی کام کو اپنی مرضی سے اختیار کیا اور سرکاری نوکری کی تمنا نہیں کی''

سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے ملک میں قلم سے روزی کمانا بڑا مشکل کام ہے یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے۔ جس کے اندر غیر معمولی قوت ارادہ، جہد مسلسل کا جوہر اور اپنے کام سے بے پناہ لگن ہو۔ اُن کی اس لگن (Devotion) کا ملک صاحب اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''کسی کو معلوم نہیں کہ وہ گزشتہ چالیس برس سے ''تخلیق'' کی اشاعت کو برقرار رکھنے کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیل رہا ہے۔ کتنی جسمانی اور روحانی مشکلات اُٹھا رہا ہے۔ اِن مشکلات میں ہی اس کے دل نے دو مرتبہ احتجاج کیا اور صحت مندانہ انداز میں دھڑکنے سے انکار کر دیا۔''

کچھ عرصہ پہلے اظہر جاوید کا شعری مجموعہ ''غم عشق اگر نہ ہوتا'' شائع ہوا تو اہل فکر ونظر نے اُن کی تخلیقی کاوش کی دل کھول کر داد دی۔ اُن کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ جب اُن کی بیماری کی خبر اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین فخر زمان کو ملی تو انہوں نے سرکاری فنڈ سے مدد کرنے کی کوشش کی لیکن اظہر جاوید نے یہ رقم لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اظہر جاوید صاحب پر لکھا تعارف نامہ شخصیت نگاری کی خوبصورت مثال ہے۔

مزاح لطیف کا رنگ تو نقش بند قمر نقوی بھوپالی کے خاکے میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ ''نقش بند قمر نقوی بھوپالی جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ اُن کے پاؤں میں چکر ہے، اس لیے کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے اور دوسری بات یہ کہ پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھتے۔ بھوپال سے نکلے تو لاہور پہنچے۔ لاہور سے ایران گئے اور اب خیر سے امریکہ پہنچ گئے ہیں۔ ان اسفار کے دوران بندوق ان کے کندھے پر ہوتی۔ وہ جنگل کی طرف نکل جاتے تو شیر، چیتے اور باگڑ بلے ڈر کر پناہ گاہیں تلاش کرنے لگتے لیکن نقش بند قمر نقوی بھوپالی کے نشانے سے بچ نہ سکتے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی بنیادی حیثیت ایک شکاری کی ہے لیکن میں انہیں بنیادی طور پر ایک

فطری ادیب سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔خواتین کی طرح وہ اپنی عمر کسی کو نہیں بتاتے۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی انہوں نے کہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے کہ کوئی تاریخ پیدائش پڑھ نہ لے"۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا تعارف وہ ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے کراتے ہیں کہ سلیم اختر صاحب نے نفسیات کا مطالعہ اپنے ذوق وشوق کے مطابق کیا۔ فرائیڈ ان کا پسندیدہ مصنف تھا۔ اپنے تنقیدی مضامین میں نفسیات کا خوب استعمال کیا اور نفسیات ہی اُن کی پہچان بن گیا۔ اُن کی پہلی محبت اُردو افسانے کے ساتھ تھی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نہایت جرأت مندی سے جنس کے تمام زاویوں کا احاطہ کیا ہے۔ ملک صاحب میرزا ادیب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ ملک مقبول احمد اُن کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اُن کی تالیف کردہ کتاب "اہل قلم کے خطوط" کا پیش لفظ لکھ کر انہیں باغ باغ کر دیا اگر چہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی بھی کتاب مقبول اکیڈمی سے شائع نہیں ہوئی تھی۔

تحقیق وتنقید کی نظر ہی سے وہ اُردو کے مشہورِ زمانہ افسانہ نگاروں کا بمعہ اُن کی کتابوں کے نہایت دلچسپ اور معلومات افزاء تعارف کرا کر ہمیں ثروت مند کر دیتے ہیں۔ ان عظیم افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر رشید امجد، محمد منشا یاد، عذرا اصغر، میرزا ادیب، رحمان مذنب، اے حمید اور صائمہ نورین بخاری شامل ہیں۔ منشا یاد کا تعارف وہ ایک منجھے ہوئے نقاد کی طرح کراتے ہیں۔

> "محمد منشا یاد اردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے تخلیق کار کے اس بنیادی فریضے کو اہمیت دی ہے کہ وہ وقت کا نباض ہوتا ہے اور معاشرے کے روگ کی نشاندہی واشگاف لفظوں میں کرتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے راجندر سنگھ بیدی کا مثیل قرار دیا، کچھ نے اسے کرشن

چندر کے مزاج کا افسانہ نگار شمار کیا لیکن سچ بات یہ ہے کہ منشا یاد نے اپنی دیہاتی آگہی کو قائم رکھا۔ کڑوے سچ کا گھونٹ پیا اور کہانی کی صورت میں شہری معاشرے کی وہ صورت پیش کی جسے ایک دیہاتی اپنی بصیرت اور ظاہری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔"

ڈاکٹر رشید امجد کے فن افسانہ نگاری پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

"رشید امجد کی شخصیت کے کئی زاویے ہیں۔ ادب میں افسانہ نگاری کی صنف طلوع ہوئے اور تجریدی افسانے کو فروغ دینے والوں میں شمار کیے گئے۔۔۔۔ ادبی رسائل کی ادارت میں انہوں نے خصوصی مہارت ظاہر کی۔۔۔۔ رشید امجد کا پہلا افسانوں کا مجموعہ "کاغذ"، "کاغذ کی فصیل" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ مقبول اکیڈمی کو ان کی کتابیں "یافت و دریافت"، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے"، "رویے اور شناختیں"، میرزا ادیب شخصیت اور فن" اور اس وقت تک کے افسانوں کی کلیات "دشتِ نظر سے آگے" چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔"

ابتداء میں انہوں نے محنت و مشقت سے بھرپور زندگی کا احاطہ کیا۔ صائمہ نورین بخاری کے حالاتِ زندگی کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"صائمہ نورین بخاری کو ادب کی وراثت اپنے خاندان سے ملی ہے۔ اس ادبی خاندان کا سب سے روشن نام خواجہ حسن نظامی کا ہے، جو اُردو ادب کے صاحبِ اسلوب ادیب ہیں۔۔۔۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "منظر، خواب، دریچے" اور شعری مجموعہ "سفر آغاز کرتے ہیں، منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔"

ملک صاحب نے ڈاکٹر انور سدید کا تعارف بطور دوست، ادیب اور نقاد کے بھرپور انداز میں کرایا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید زود اور بسیار نویس ہیں۔ وہ قلم کے شاہسوار ہیں، ان کے شب و روز پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتے ہیں۔ ملک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی تمام تصانیف اور ان کے ادبی کارناموں کا باتفصیل احاطہ کیا ہے اور ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ان کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

''بے شک اگر کسی نابغہ عصر ہستی نے سب سے زیادہ تاریخ ساز بے مثال اور یادگار کارکردگی کا تخلیقی اور تنقیدی سطح پر اظہار کیا ہے۔ تو وہ صرف اور صرف ڈاکٹر انور سدید کی ذات باصفات ہے۔''

• ملک مقبول احمد صاحب کو اپنے موقلم سے اپنے محترم کرداروں کی تصویر کشی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ میں یہاں صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ابوالامتیاز، ع۔س مسلم کی چند لفظوں میں اس طرح تصویر پیش کرتے ہیں۔

''بلاشبہ اس وقت ملک کے ایک کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ جن کے چہرے پر خوبصورت سفید داڑھی لہرا رہی ہے۔ سر پر قراقلی ٹوپی سجی ہے۔ آنکھوں سے دین کا نور جھلکتا ہے اور وہ ایک بے حد مقدس شخص نظر آتے ہیں۔ جس کی تصویر پر وقت کا اندھیرا ابھی اثر انداز نہیں ہو سکا۔''

اور علی سفیان آفاقی کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے:

''آفاقی صاحب ملے تو مجھے اُن کی تہذیبی شخصیت نے سرشار کر دیا۔ اُن کے چہرے پر متانت طاری تھی لیکن عینک کے عقب سے آنکھیں انکسار سے جھکی جاتی تھیں، انہوں نے استری شدہ نفیس

کوٹ پتلون پہن رکھا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ اُن کا لباس اُن کے جسم کی ضرورت تھی۔ جسم کی زیبائش نہیں تھی۔۔۔۔۔۔"

اس کتاب کا حرفِ آغاز بھی آفاقی صاحب نے لکھا ہے جبکہ عرضِ سدید ڈاکٹر انور سدید نے لکھا اور حرفِ شوق محمد سعید احمد بدر قادری نے لکھ کر اس کتاب کا بھرپور نچوڑ پیش کیا۔

محققوں، تاریخ دانوں اور دانشوروں کا ملک صاحب نے شایانِ شان تعارف کرایا بلکہ اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی گرانقدر کنٹری بیوشن پر روشنی ڈالی۔ طوالت کے خوف سے میں سب کا تذکرہ اس مضمون میں کرنے سے گریز کر رہا ہوں تاہم میں یہاں ملک کے نامور محقق، تاریخ دان اور دانشور ڈاکٹر صفدر محمود کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاکستانی سیاست اور تاریخ کے حوالہ سے روزنامہ "جنگ" میں باقاعدگی سے کالم چھپتے ہیں تو میں انہیں ضرور پڑھتا ہوں اور روشنی حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "شاخِ زیتون" کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا تو میں بہ نفس نفیس اُن کی خدمت میں ایک نسخہ پیش کرنے کے لیے اُن کے ہاں گیا تھا جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا لیکن اب اُن سے ملے ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ دیکھئے ملک صاحب اُن کا تعارف کس محبت، عقیدت اور احترام سے کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صفدر محمود کو تاریخِ پاکستان کا مؤرخ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن میں پاکستان کی تعمیر و تشکیل کو دیکھا تو مسلمانوں کی نظریاتی جدوجہد ان کے رگ و پے میں سما گئی۔۔۔۔۔" اُن کے جذبۂ خدمت کو سراہتے ہوئے ملک صاحب کہتے ہیں: "میرا مشاہدہ ہے کہ جس لگن سے صفدر محمود صاحب نے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور خدمتِ پاکستان اور

خدمتِ عوام کو پیشِ نظر رکھا ویسی لگن سیاستدانوں کے ''غلام افسروں''
میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔۔۔۔انہوں نے ہر مشکل کا پامردی سے
مقابلہ کیا اور بالآخر ۲۰۰۴ء میں سیکرٹری حکومتِ پاکستان کے عہدے
سے ریٹائر ہوئے وہ پورے ملک میں عزت مند، خوددار اور فرض
شناس افسر تسلیم کیے جاتے تھے۔'' ڈاکٹر صفدر محمود ایک ذمہ دار اور
سچے محقق ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں جگن ناتھ آزاد کی دروغ گوئی
کا سخت محاسبہ کیا۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ آزادی
سے پانچ روز پہلے پاکستان کا ترانہ قائداعظم کی فرمائش پر اس نے لکھا
تھا جو ۱۴ اگست کو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے
تاریخی شواہد سے ثابت کیا کہ یہ جگن ناتھ آزاد کی دروغ بیانی ہے
اُن کا ترانہ کبھی پاکستان ریڈیو سے نشر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صفدر محمود محقق
اور تاریخ دان ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت مزاح نگار اور
انشائیہ نگار بھی ہیں۔ اُن سے وابستہ مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔
سرگودھا میں میری کتاب ''شاخِ زیتون'' کی تعارفی تقریب میں
ڈاکٹر صاحب نے یہ خوبصورت جملہ کہا تھا۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا کا کمال ہے
کہ انہوں نے جمیل آذر کو انشائیہ نگار بنا دیا۔'' ملک مقبول احمد صاحب اُنکے
شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اُن کی سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' کی بھرپور
تعریف کی اور انہیں مشورہ دیا کہ ''اسے جاری و ساری رہنا چاہئے''
ملک صاحب اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''میں اُن
کے اس ارشاد پر عمل کی کوشش کر رہا ہوں اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے

اس راہ پر ڈاکٹر صفدر محمود نے ڈالا۔"

اس کتاب کے فریم ورک میں وہ لوگ نہیں آتے جنہیں وہ "وکھری ٹائپ کے مصنفین" سے موسوم کرتے ہیں۔ وکھری ٹائپ کے لوگوں کی ایک مثال ہمیں ابوالامتیاز ع۔س مسلم صاحب کے تعارف میں ملتی ہے۔ جسے آپ ملک صاحب کے الفاظ میں سنیں اور لطف اندوز ہوں۔

"شوکت صدیقی کا مشہور "ناول"، "خدا کی بستی" ع۔س۔ مسلم نے اس وقت شائع کیا جب کراچی کا کوئی اور اشاعتی ادارہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسلم صاحب نے اس کی پوری رائلٹی ادا کی اور ایک اچھا ناشر ہونے کا ثبوت دیا اور اس کے حقوق اشاعت حاصل کیے لیکن جب خدا کی بستی کو ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی تو شوکت صدیقی نے شہرت کی چاندنی میں ادبی اخلاقیات پر عمل نہ کیا۔ انہوں نے یہ ناول کسی اور ناشر کے پاس بھی فروخت کر دیا۔ پھر معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ ع۔س۔ مسلم صاحب نے یہ تمام واقعہ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اپنے تلخ تجربات کے سلسلے میں لکھا ہے"۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب نے تہذیبی اور اخلاقی آداب کے پیش نظر کسی کا نام لیے بغیر اپنی آپ بیتی میں اس قسم کے لکھنے والوں کو "وکھری ٹائپ کے مصنفین" کے نام سے ایک علیحدہ باب رقم کیا ہے۔ یہ وہ مصنفین ہیں جو اخلاقیات کا درس دیتے نہیں تھکتے لیکن خود عہد شکن، دھوکے باز اور دروغ گو ہوتے ہیں اور لالچ و خودغرضی کی وجہ سے ناشر سے ایڈوانس پیسے بھی لے لیتے ہیں اور پھر کسی اور ناشر سے زیادہ پیسے لے کر اس کے ہاتھ اپنے مسودو کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ پیدا گیری قسم کے

لوگ ہیں اور ہمیشہ حکومتِ وقت سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں اور قلم کی حرمت کو داغ دار کرتے ہیں۔

اس کتاب کے فریم ورک میں ایسے محترم کردار شامل ہیں جو اپنے علم و دانش، اخلاقِ حُسنہ اور حُسنِ صداقت میں ہمارے لیے نمونۂ عمل ہیں۔ ملک صاحب نے ان سب شخصیات کی پُرکشش خوبصورت قلمی تصویریں بنا کر ایسی پاکیزہ پکچر گیلری بنائی ہے، کہ جس کو دیکھ کر سر نیاز مندی سے جھک جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ملک مقبول احمد نے انشائی (تخلیقی) اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ جس میں لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے برعکس سادہ سلیس اور رواں اندازِ بیان ہوتا ہے۔ جس میں بے ساختہ پن (Spontaneity)، تازگی اور شگفتگی ہوتی ہے، جس میں خلوص، محبت اور یگانگت کی خوشبو ہوتی ہے، جس میں لکھاری کی سوچ منفی نہیں ہوتی بلکہ مثبت اور تخلیقی ہوتی ہے۔ جو محبت اور لطف و کرم سے لبریز، ہمہ گیر بڑھتی، پھیلتی اور لامحدود ہوتی چلی جاتی ہے۔

ملک مقبول احمد صاحب کی یہ کتاب اس لحاظ سے بے نظیر ہے کہ اس میں انہوں نے ملک کے پچاس نامور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، دانشوروں، محققین اور ناقدین کو اُن کی شخصیت کردار اور تصانیف کے حوالے سے اپنے ذاتی تجربہ مشاہدہ اور تحقیق وتنقید کو بروئے کار لا کر بے مثل تعارف کرایا ہے، جہاں ان کے اسلوب میں خاکہ نگاری کی دلچسپی، شخصیت نگاری کا حسن اور کردار نگاری کی صداقت کی مہک رچی بسی ہے۔ ملک صاحب کی شخصیات کو متعارف کرانے کا یہ فریم ورک (Frame Work) اُردو ادب میں بالکل اوریجنل (Original) ہے۔ جسے میں تعارف نگاری کہوں گا۔ یوں ملک مقبول احمد صاحب کی تین جہتیں ہمارے سامنے آئی ہیں جو بطور سوانح عمری نگار (سفر جاری ہے)، سیاحت نامہ نگار (سیاحت نامۂ ترکی) اور تعارف نگار (۵۰ نامور ادبی شخصیات) کے ہیں۔

میں یہاں محمد سعید احمد بدر قادری سے متفق ہوں۔ جنہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بہر حال یہ امر طے ہے کہ یہ کتاب حوالے اور ریفرنس کا کام دے گی اور ادب کے طلباء اس سے مستفید ہوں گے۔''

یقیناً ادب کے طلباء کے لیے، معلومات افزاء یہ کتاب، ان کے تحقیقی کاموں میں بے حد سود مند ثابت ہوگی۔

☆☆☆

پروفیسر نذیر احمد تشنہ
بھمبر، آزاد کشمیر

''۵۰ نامور ادبی شخصیات''

ملک مقبول احمد صاحب کی کتاب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' بذریعہ ڈاک وصول ہوئی۔ اس کتاب کی گٹ اپ کو مقبول اکیڈیمی کی دیگر کتب کی طرح دیدہ زیب اور دل فریب پایا۔ اس کے بعد فہرست پر نظر ڈالی اور پچاس نامور ادبی شخصیات، ملک صاحب کے ''مردم دیدہ'' کے اسماء کو ترتیب وار پڑھا۔ کیوں کہ ہم بھی دلی کے پانچویں سوار تھے۔ اس لیے بسم اللہ اپنے نام سے ہی کی، کہ دیکھیے! ملک صاحب، خاکسار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ملک صاحب کی یہ اعلیٰ ظرفی ہے کہ اُنھوں نے ناچیز کو بھی پچاس بڑوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سب ادبی علمی مشاہیر کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔

ملک صاحب! نام ور پبلشر تو تھے ہی، اب وہ ادب میں بھی، پاکستان اور بیرون ملک سے تقریباً ایک سو کے لگ بھگ دانش وروں سے اپنے ادیب ہونے کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان میں سے پچاس نامور ادبی شخصیات کا تعارف آپ پہلی قسط میں پیش کر چکے ہیں اور باقی پچاس کا احوال ان شاء اللہ اگلی قسط میں دیا جائے گا۔ میں نے اس کتاب کے پیش لفظ کی ابتدائی سطور پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور آپ بھی بین السطور مطالعے کے بعد یقیناً اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

پیش لفظ کا تیسرا جملہ یوں ہے، ''کتاب پڑھ کر میرے دوستوں نے مجھے ادیب سمجھنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ میں واشگاف الفاظ میں اس کی تردید کر چکا ہوں، لیکن میرے کرم فرما میری اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔'' ہر بڑا تخلیق کار ملک صاحب کی طرح انکساری و خاکساری کا اظہار کرتا ہے یہ بڑا پن بھی ہے اور آگے بڑھنے کا موثر ہتھیار بھی۔ جنھوں نے پہلی ہی منزل میں ''انا الحق'' کا نعرہ بلند کر دیا وہ تخلیقیت کے عمل سے نہ صرف محروم ہوئے بلکہ قدردانوں اور مہربانوں کی نگاہوں سے بھی محروم ہو گئے۔

اسی کتاب میں جناب سعید بدر صاحب کو دیکھئے، جو اوّل الذکر قافلے کے میرِ کارواں ہیں، وہ ص ۲۱ پر اپنے باادب ہونے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ ''ملک صاحب نے مجھ ایسے حقیر و ناچیز کو اس کتاب کا ''دیباچہ'' لکھنے کا ''حکم'' صادر فرمایا ہے۔ کئی دنوں سے حیران و پریشاں ہوں کہ آخر ملک صاحب کو یہ خیال کیوں سوجھا ہے کہ میں اُن جیسے بلند پایہ عالم و فاضل کی کتاب کا دیباچہ لکھوں، جن کی حیثیت چار دانگ عالم میں مسلمہ ہے۔ حالانکہ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ:

''من نہ ملا، نے فقیہہ نکتہ ور''

میرا خیال ہے کہ ہر بڑا ادیب تجاہل عارفانہ سے کام لیتا ہے تا کہ میرے دست و بازو کو کسی کی نظر نہ لگے۔ حالانکہ ہر ادیب یہ چاہتا ہے کہ مجھے سب کی نظر لگے، اسی نظر کا علاج ملک صاحب نے ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' تجویز کیا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ چراغ حسن حسرتؔ کو آغا حشر کاشمیریؒ کے سامنے پیش آیا۔ چراغ حسن حسرت کاشمیری مرحوم کی کتاب ''مردم دیدہ'' اور ملک مقبول احمد صاحب کی کتاب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں قدر مشترک یوں نظر آتی ہے کہ دونوں مصنف خاکہ لکھتے وقت کسی شخص کی کم زوریوں سے نہیں کھیلتے بلکہ پورے خلوص اور ہم دردی سے اس کی اچھی باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

وہ کسی طور بھی اپنے کردار کی شخصیت کے تاریک اور متضاد پہلو اُچھال کر مزاح کی کیفیت پیدا نہیں کرتے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ملک صاحب کے خاکوں کے مجموعے کا نام ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' ہے اور چراغ حسن حسرت مرحوم کے خاکے کے مجموعے ''مردم دیدہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (ادب میں مرحوم کے بعد صاحب نہیں لکھتے! اس لیے نہیں لکھا، تاہم ادب ملحوظِ خاطر ہے۔)

دونوں میں خلوص، ہمدردی اور احترام کے عناصر سے تحریر میں کردار و واقعات کے خوش نما امتزاج سے ایسی فضا پیدا کی گئی ہے کہ یہ ادب پارے اہل قلم کی زندگیوں کا حسین مرقع بن گئے ہیں۔

ملک صاحب کو جبراً ادیب منوانا پڑے گا۔ کیوں کہ سیال کوٹ والے ادب کی معراج پر پہنچ کر بھی ماننے کے نہیں ہیں۔ ملک صاحب کا تعلق ''دیووال''، ضلع سیالکوٹ سے ہے۔ اقبالؒ سیال کوٹی بھی ہے، مکھڑے پر کالا کالا تل اور زبان کا اتنا بڑا اپدیشک کہ من باتوں میں موہ لیتا ہے۔ کہا، نہ! کہ سیال کوٹ والے بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں مگر مانتے نہیں ہیں۔ ناقد اقبالؒ کو نقد کرتے وقت غالبؔ کے بعد سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ میں زبان کے اعتبار سے غالبؔ کو نفسِ مضمون کے اعتبار سے اقبالؒ کو بڑا شاعر مانتا ہوں، تاہم اقبالؒ اپنے اقبال کو یوں چھپاتے نظر آتے ہیں۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درونِ مے خانہ

ملک صاحب نے اپنے ادبی سفر میں پہلے خودنوشت ''سفر جاری ہے''، لکھی، سفر پر روانہ ہونے کی نوید سناتے ہی، دوسرے پڑاؤ پر ''پذیرائی''، ''اہل قلم کے خطوط''، ''پیغمبرِ عالمؐ اور اگلے پڑاؤ، گلشن ادب''، ''گمشدہ افسانے''، ''سیاحت نامہ ترکی'' قارئین کی

نذر کر ڈالیں۔ ابھی سفر جاری ہے۔ اللہ کرے، یہ سفر جاری ہے اور مزید وسیلہ ظفر بنے۔ سعید بدر صاحب لکھتے ہیں، ''واضح رہے کہ یہ کتاب ملک صاحب کی آخر کتاب نہیں بلکہ اس کے بعد وہ مزید ''دھماکے'' کرنے والے ہیں۔'' میرا بھی اُن کی طرح یہی خیال ہے۔

ملک صاحب پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ ''میرے کرم فرما! متعدد بار تقاضا کر چکے ہیں کہ ان ادیبوں کے خاکے لکھوں جن سے میں متعارف ہو چکا ہوں اور جن کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں۔'' ملک صاحب کی اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ خاکہ اُڑائے بغیر، کس سادگی اور پرکاری سے ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کے خاکے لکھ ڈالے اور بہتوں کو آپ بیتی سے بے نیاز کر دیا۔ پیش لفظ میں ملک صاحب لکھتے ہیں، ''خیال رہے کہ یہ خاکے نہیں ہیں، شاید یہ شخصیت نگاری کے زمرے میں بھی نہیں آتے ہیں۔ میں نے چند مخلص دوستوں اور شخصیات کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ گویا یہ یادوں کی بازگشت ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ دراصل دوستوں کے تعارف نامے ہیں جو انھوں نے میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کے تبصرے کے ساتھ مجھے ارسال فرمائے تھے اور میں نے ان کا اختصار اپنے الفاظ میں اپنی کتاب ''پذیرائی'' میں ان کی تصویر کے ساتھ شامل کیا تھا۔''

سادگی و پرکاری ادب اُردو کی تاریخ میں حالیؔ کی تحریروں میں ملتی ہے۔ سرسیّد احمد خان نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ شبلی کی تحریریں عالمانہ ہوتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد رواں اور شُستہ تحریر لکھتے لکھتے عربی کے روڑے ہی نہیں بل کہ پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں۔ آسان، رواں اور شُستہ زبان فطری اور خداداد صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ریاضت کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ مگر یہ انداز آتا ہے، آتے آتے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک مشاق سائیکل سوار پگڈنڈی پر بھی مہارت سے چلا جاتا ہے اور اناڑی شاہ راہ پر خوف زدہ رہتا ہے۔ ملک صاحب میں یہ خوبی فطری اور خداداد ہے یا یہ حسنِ تحریر ریاضت و مشق کا رہینِ منت، تاہم اس سلسلے میں

جناب علی سفیان آفاقی صاحب کی رائے میں آفاقیت نظر آتی ہے۔'' ملک صاحب نے انتہائی سلیس، بامحاورہ اور آسان زبان لکھ کر سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اگر چہ ان کا اب بھی یہی اصرار ہے کہ وہ ادیب نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں ان کے اس بیان کی نفی کرتی ہیں۔ سادگی پرُکاری ایک ایسی صنف ہے جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آسان، رواں اور شستہ زبان لکھنا کتنا مشکل کام ہے، یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو کوشش کے باوجود لفّاظی اور شوکت الفاظ کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ایک فطری اور خداداد صلاحیت ہے۔ جس سے ہر ادیب اور افسانہ نگار بہرہ ور نہیں ہوتا۔''

ادب میں تذکرہ نگاری بھی ایک صنف ہے۔ جس نے کسی کا تذکرہ لکھا، اُس نے اُسے زندہ کر دیا۔ ملک صاحب کا اعجاز ہے کہ انھوں نے پچاس نامور شخصیات کے تذکرے اس خوبی سے لکھے ہیں کہ سب کو ہنستا مسکراتا ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

ادب کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ایک ادیب پبلشر نے اپنے ادارے کے قلم کاروں کے کارواں کو ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں پیش کیا ہے اور اُسے ایک خوبصورت البم بنا دیا ہے۔ اُن کے اس کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور شاید اُردو ادب کی تاریخ اسے دہرا سکے۔ ملک صاحب کی پُرکشش شخصیت نے چھوٹے بڑوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ چھوٹے ان کی بزرگی پر اور بزرگ ان کی دوستی پر نازاں ہیں۔ پہلے وہ ادب شناس تھے اور اب وہ ادب دوست بھی ہو گئے ہیں۔ اللہ کرے کہ ان کا دست شفقت اور یدِ ولایت قائم دائم رہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆

حمید اختر

۵۰ نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد صاحب کو ابھی کچھ عرصہ قبل تک پاکستان کے ایک معروف ناشر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ انہوں نے اگرچہ ادبی، علمی اور تاریخی کتب کی اشاعت میں بڑا نام پیدا کیا اور بہت سے نئے تجربے بھی کئے لیکن کوئی دو تین برس قبل انہوں نے اپنی خودنوشت تحریر کر ڈالی۔ جس میں وہ یقینی طور پر ایک اچھے ادیب کی صورت میں قارئین کے سامنے آئے، وہ اگرچہ ادیب کہلانے سے انکاری ہیں مگر ''سفر جاری ہے'' اور اس کے بعد آنے والی ان کی تین چار کتابوں کے سلیس سادہ اور شستہ اسلوب سے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ملک مقبول احمد نے اس ملک کے ادیبوں میں نمایاں اور خوش گوار اضافے کی بنیاد ڈال دی ہے۔

ان کی تازہ ترین کاوش ''50 نامور ادبی شخصیات'' کے عنوان سے شائع ہونے والی ان کی کتاب ہے۔ جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔ ''خیال رہے کہ یہ خاکے نہیں ہیں، شاید یہ شخصیت نگاری کے زمرے میں بھی نہیں آتے۔ میں نے چند مخلص دوستوں اور شخصیات کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ کچھ تو یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں مگر زیادہ تر اس ملک کے ادبی میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں، احسان دانش، اسرار زیدی، اظہر جاوید، ڈاکٹر انور سدید، مولانا حامد علی خاں، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، رحمان مذنب، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، رئیس احمد جعفری، عبدالعزیز خالد، غلام الثقلین نقوی،

ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا، مگر یہ سبھی معروف نام ہیں۔ ملک مقبول احمد نے نسبتاً کم شہرت پانے مگر ٹھوس ادبی کام کرنے والے متعدد ادیبوں کے حالات زندگی بھی اس کتاب میں شامل کر لیے ہیں۔ اس لیے یہ کتاب موجودہ عہد کے ادیبوں کی داستان زندگی کی مستند دستاویز کے طور پر سامنے آئی ہے۔ جس سے ادب کے طالب علم آنے والے زمانوں میں بھی استفادہ کرتے رہیں گے۔

ملک صاحب کے ادیب کہلانے سے انکاری ہونے کے عمل کو رد کرتے ہوئے ان کے دیباچہ نگار علی سفیان آفاقی اور سعید بدر دونوں نے مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے کہ ان کی تحریریں ہر نوع سے ادب کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ آفاقی لکھتے ہیں: ''سفر جاری ہے'' میں ملک صاحب نے انتہائی سلیس بامحاورہ اور سادہ زبان لکھ کر سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ سادگی و پرکاری ایسی صنف ہے جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آسان، رواں اور شستہ زبان لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو کوشش کے باوجود لفاظی اور شوکت الفاظ کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔'' ڈاکٹر انور سدید نے بھی ان کی اس کتاب کو ان کی شخصیت کا ایک خوبصورت نقش قرار دیا ہے۔ سعید لکھتے ہیں کہ ''ملک صاحب نے نہایت عرق ریزی محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ 50 اہل قلم کے بارے میں نہ صرف مستند معلومات جمع کر دی ہیں بلکہ ان جلیل القدر شخصیات کا دلکش اور دل آویز مرقع پیش کر دیا ہے۔'' آیئے اب ذرا ملک مقبول احمد صاحب کے طرزِ تحریر کا نمونہ بھی دیکھتے چلیں تاکہ یہ فیصلہ کرنے میں آسانی رہے کہ وہ واقعی ادبی زبان لکھ رہے ہیں یا نہیں۔ پروفیسر جمیل آذر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اب جو ملے اور باتیں کرنے لگے تو محسوس ہوا وہ ایک ایسے انسان ہیں جو بازار سے گزر رہے ہیں لیکن دنیا کے خریدار نہیں، مکالمہ ان کی زندگی کو کشادہ کرتا ہے اور مصنفین عالم سے ملاقات ان کے خیالات کو وسعت دیتی ہے۔'' اسی طرح پروفیسر رفیع اللہ شہاب کے

بارے میں لکھتے ہیں ''ان کا شمار پاکستان کے ان فضلاء میں سے ہوتا ہے جو ساری عمر علم کی جستجو اور حق وصداقت کی تلاش میں کوشاں رہتے ہیں، وہ ہر سالک راہ حق کے ساتھ چلتے اور ان کے خیالات وتصورات سے فیض یاب ہونے کے لیے ان کی تصنیفات وتالیفات کا مطالعہ کرتے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مطالعے کا تجزیہ بھی کرتے اور اگر اختلافی نکتہ پیدا ہوتا تو اس کے اظہار سے گریز بھی نہیں کرتے۔''

پروفیسر رفیع اللہ شہاب صحیح معنوں میں عالمِ دین تھے، افسوس کہ نئی نسل ان کی تعلیمات کو بھولتی جارہی ہے۔ ہمیں ملک صاحب کی کتاب میں ان کا ذکر اور حالاتِ زندگی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج کے زمانے میں جب مولوی صاحبان اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی بجائے توہینِ رسالت کے قانون کے نام پر سیاسی دکان چمکا رہے ہیں۔ رفیع اللہ شہاب جیسے علماء کی ضرورت ہے جنہوں نے نہ صرف سیرت نگاری کو اپنا موضوع بنایا بلکہ اپنی زندگی ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی کوششوں کا آغاز بھی کیا۔ غرضیکہ ملک مقبول احمد صاحب کی یہ کاوش جس میں انہوں نے اپنے عہد کو 50 نامور ادبی شخصیات کے حوالے سے عصری ادبی مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ادب کے طالب علموں کے لیے انتہائی اہم کتاب ہے اور آنے والے زمانوں کے ادبی طالب علم بھی اس سے برابر استفادہ کرتے رہیں گے۔ کتاب کی طباعت کی توصیف کرنا اس لیے غیر ضروری ہے کہ ملک صاحب کے ادارے مقبول اکیڈمی نے اپنی کتابوں کو سلیقے سے چھاپنے میں خاصا نام پیدا کرلیا ہے۔

روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور

☆☆☆

سعید بدر

''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' اور ملک مقبول احمد

''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' ملک مقبول احمد کی نئی کاوش ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت منفرد اور اہمیت وافادیت کی حامل دستاویز ہے۔ کم وبیش نصف صدی قبل سیالکوٹ کے ایک غیر معروف گاؤں...... دیووال سے ایک نوجوان لاہور میں روزگار کی تلاش میں آیا اور چند ہی برسوں میں وہ چھا گیا۔ ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ انگریزی زبان میں کہا جاتا ہے کہ:

"A man is known by his company he keeps"

فارسی میں اسی مفہوم میں یوں کہا گیا ہے:

کند ہم جنس، باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز

یعنی

''ہر ہم جنس اپنی ہی جنس کے پرندوں کے ساتھ پرواز کرتا ہے، کبوتر ہمیشہ کبوتر کے ساتھ اُڑان بھرے گا اور باز، بازوں کے ساتھ محوِ پرواز ہوگا۔''

دیہی ماحول میں پروان چڑھنے والا نوجوان لاہور آ کر فیصلہ کرتا ہے وہ کتابوں کا کاروبار کرے گا اور ''چودھویں صدی'' کے نام سے ایک رسالہ کا بھی اجراء کرے گا۔ حیرانی کی بات ہے کہ ''چودھویں صدی'' نکالنے کا منصوبہ اس نے اپنے گاؤں میں قیام کے دوران ہی بنالیا تھا۔

غور کیا جائے تو اس نوجوان کے سامنے وسیع میدان تھا، کپڑے کا کاروبار، لوہے کا کارخانہ، یا پھر مشروب سازی کی فیکٹری، لیکن اس نے تمام شعبوں اور کاروبار کو تج کر ''کتب فروشی'' کو ترجیح دی۔ اس کام کا آغاز اس نے پہلے شاہ عالم مارکیٹ میں کیا لیکن آخر میں بعض وجوہات کی بناء پر وہ سرکلر روڈ پر اُردو بازار کے سنگھم پر اٹھ آیا اور چھوٹی سی دُکان سے کام کا آغاز کیا نیت نیک ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور برکت دیتا ہے۔ چنانچہ رب کریم و رحیم نے اس خوش صفات نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیرے دھیرے کاروبار میں پیش رفت ہونے لگی۔

مقبول اکیڈمی دیکھنے کو چھوٹی سی دکان ہے لیکن اب اس کی چار پانچ شاخیں لاہور کی اہم شاہراہوں پر موجود اور ''مقبول بکس'' کے نام سے کتابوں کی صورت میں علم و دانش کی دولت کو عام کر رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کتاب بہت کم بکتی ہے۔ لوگ کتاب پڑھتے نہیں اور اب تو ایسے جدید شعبے آ گئے ہیں کہ لوگوں کو ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ سے براہ راست علوم و فنون کے خزانے حاصل ہونے لگے ہیں۔ ان حالات میں کتاب کی اہمیت اور بھی کم ہو گئی ہے لیکن مقبول صاحب کے خلوص نیت، محنت، لگن اور کتاب سے محنت نے انہیں کتاب بیچنے کے ایسے گُر سکھائے کہ ان کی شائع کردہ کتاب بدستور اور مسلسل بک رہی ہے۔

دراصل اس طویل تمہید کا مقصد یہ تھا کہ پیشے کے انتخاب سے ''علوم و فنون'' اُن کی محبت اور رغبت کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب فروشی سے وہ کتاب بینی کے عادی ہوئے اور اب کتابوں کے مصنف بھی او مؤلف ہیں۔ نہایت مختصر عرصہ میں ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جنہوں نے اہل علم و ادب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے ان کتب میں ''سفر جاری ہے''، ''پذیرائی''، ''اہل قلم کے خطوط''، ''گلشن ادب''، ''سیاحت نامۂ ترکی''، ''۵۰ نامور ادبی شخصیات''، ''نیا علم شفا بخشی'' اور کئی دیگر کتب شامل ہیں۔

اور بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

ان کی تازہ ترین تصنیف ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' کے عنوان سے سامنے آئی ہے۔ کتاب فروشی انہیں کتاب دوستی کی طرف لے آئی یا پھر کتاب دوستی ہی دراصل بنیاد تھی جو انہیں کتاب فروشی کے میدان میں لے آئی۔ اس کے نتیجے میں اہل علم ودانش اور صاحبان حکمت وفن سے ان کے رابطے قائم ہوئے اور بعد میں یہی رابطے مضبوط تعلقات اور دوستیوں میں بدل گئے اور اس طرح انہیں کتاب شناسی کے ساتھ انسان شناسی اور انسان دوستی کا موقع ملا۔ انہوں نے علمی وادبی شخصیات کے ساتھ اپنے ان روابط، میل جول اور تعلقات سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور ان شخصیات کو آپ سے جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی اور پھر اپنی زندگی کے نچوڑ کے طور پر ''پچاس ادبی شخصیات'' کے دلچسپ اور دلکش عنوان سے نہایت عمدہ اور خوبصورت کتاب لکھ دی جس میں ان شخصیات کے متعلق بھرپور معلومات اور آراء موجود ہیں۔

اُن کی یہ کاوش نہایت منفرد اور انوکھی ہے۔ وہ خود رقمطراز ہیں، ''خیال رہے کہ یہ خاکے نہیں، شاید یہ شخصیت نگاری کے زُمرے میں بھی نہیں آتے، میں نے چند مخلص دوستوں اور شخصیات کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ میں اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ دراصل دوستوں کے وہ تعارف نامے ہیں۔ جو انہوں نے میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کے تبصرے کے طور پر مجھے ارسال فرمائے

تھے اور میں نے ان کا اختصار کر کے اپنے الفاظ میں اپنی کتاب ''پذیرائی'' میں ان کی تصویر کے ساتھ شامل کیا تھا۔''

''اس تعارف میں متعلقہ شخصیات کے متعلق اپنے تاثرات کے علاوہ جن معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، وہ معلومات میں نے مختلف ادبی رسائل، اخبارات ادبی صفحات اور چند خاص دوستوں سے حاصل کی ہیں۔ جن میں ڈاکٹر طارق عزیز، اظہر جاوید، محترم سعید بدر، پروفیسر تنویر حسین اور علامہ عبدالستار عاصم شامل ہیں۔''

ہمارے خیال میں یہ کتاب بیک وقت خاکہ نگاری اور سیرت نگاری کے ساتھ ساتھ تعارف ناموں کے اوصاف اور خصوصیات پر مبنی ہے۔ ملک مقبول احمد صاحب نے منتخب شخصیت کے متعلق نہ صرف عمدہ انداز میں تعارف کرایا ہے بلکہ اپنے تعلقات کے حوالے سے ان کی شخصیات اور سیرت کے بارے میں مؤقر رائے بھی دی ہے۔ جن میں خاکہ نگاری کا عنصر بھی شامل ہے۔ اب یہ ادیبوں اور تنقید نگاروں کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ دیں کہ اس کتاب کے اندازِ نگارش کو کون سی صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا پھر یہ ان تینوں خصوصیات پر مشتمل بالکل منفرد اور انوکھی صنف ہے۔

ملک مقبول احمد نے جن شخصیات کو منتخب کیا، ان میں بیشتر شخصیات علم و ادب کے بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام پر فائز ہیں اور دانش و حکمت میں ان کی رائے کو وقیع سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ان میں متعدد حضرات اساتذہ کا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم، احسان دانش، ڈاکٹر انور سدید، اے حمید، پروفیسر تنویر حسین، پروفیسر جمیل آذر، مولانا حامد علی خان (مدیر ہمایوں اور مخزن) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر رشید امجد، رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر سلیم اختر ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر طارق عزیز، علامہ عبدالستا عاصم، عبدالعزیز خالد،

علی سفیان آفاقی، غلام الثقلین نقوی، سید قاسم محمود، مجیب الرحمٰن شامی، ڈاکٹر مسکین حجازی، محمد منشایاد، مقصود احمد چغتائی، میرزا ادیب، سید واجد رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، جیسی محترم المقام شخصیات شامل ہیں۔ رہا راقم (سعید بدر) جیسے افراد کی شمولیت تو وہ ملک صاحب کا ''حسنِ نظر'' ہے۔ کہ ہم ایسے بے مایہ اور کم علم افراد کو بڑی شخصیات کے زُمرے میں شامل کرلیا جائے۔

کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ علی سفیان آفاقی جیسے سینئر صحافی اور نامور ادیب نے اس کا ''حرفِ آغاز'' لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

''ملک مقبول خود کو ادیب نہیں کہتے لیکن ان کی تحریر میں جو شگفتگی، تازگی اور بے ساختہ پن ہے۔ اس کی داد نہ دینا صریح بے انصافی ہوگی۔''

انہوں نے ان تحریروں کو خاکے قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ''عرضِ سدید'' کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کے رشحاتِ فکر ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں کہ

''ملک صاحب نے اپنی ذات کو ''مرکز کائنات'' بنانے کی بجائے ہمیں ''حدیث دیگراں'' سنائی ہے۔ جس کی فنی ٹیکنیک انہوں نے خود وضع کی ہے''۔

آخر میں ''حرفِ شوق'' کے عنوان سے راقم کی تحریر شامل ہے۔ اُمیدِ واثق ہے کہ اہلِ ذوق اس منفرد کتاب کا مطالعہ کریں گے اور اسے پسند کریں گے۔ بہر حال ۵۰ نامور ادیبوں اور شاعروں کے متعلق یہ کتاب ریفرنس بک کا کام دے گی اور قارئین کی معلومات میں اضافہ کا باعث بنے گی۔

؎ این دُعا از من ازو جملہ جہاں آمین باد

☆☆☆

علی سفیان آفاقی

۵۰ نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد صاحب جب سے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف مین طبع آزمائی کا مظاہرہ کیا ہے۔آغاز انہوں نے اپنی خودنوشت سے کیا تھا۔ جو انہوں نے اپنے نواسہ نواسی اور پوتا پوتی کے اصرار پر تحریر کی تھی۔ اردو ادب کے صاحب ذوق افراد کو ان بچوں کا شکر گزار ہونا چاہئے۔جن کی بدولت ایک نیا مصنف اور اہل قلم منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ملک صاحب کو لکھنے کا چسکا پڑ گیا اور انہوں نے لکھنے کے شوق کو اپنالیا۔

زیر نظر کتاب دراصل ان اہل قلم حضرات و خواتین کے قلمی خاکے ہیں۔جن سے ملک مقبول احمد کا بحیثیت ناشر اور پھر دوستانہ مراسم کی بناء پر واسطہ پڑتا رہا ہے اور انہوں نے ان کی ذات یا تخلیقات کے باعث انہیں قریب سے دیکھا بھالا۔یہ کتاب ایسے ہی تاثرات و احساسات پر مشتمل ہے۔جنہیں ملک مقبول احمد اپنے دل و دماغ سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر لائے ہیں۔اس مجموعے میں پچاس اہل قلم کے خاکے ہیں لیکن مستقبل قریب میں مزید کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

ملک مقبول کی تحریر میں سادگی کا عنصر زیادہ ہے۔ یہ ان کے خلوص کا نتیجہ ہے۔ جن سے ان کا ناشر اور ادیب کی حیثیت سے واسطہ پڑا وہ بھی ملک صاحب کے اخلاص اور

اپنی بعض خصوصیات کی بناء پر ان کے قریب آ گئے۔ ان کے بارے میں انہوں نے یہ خاکے تحریر کئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ابوالامتیاز ع۔س مسلم، احسان دانش، ڈاکٹر انور سدید، اے حمید، جبار مرزا، پروفیسر جمیل آذر، مولانا حامد علی خان، حفیظ تائب، حمید اختر، حمید کاشمیری، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا رحمٰن مذنب، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، رئیس احمد جعفری، ستار طاہر، ڈاکٹر سلیم اختر، صائمہ نورین بخاری، ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر طارق عزیز، عبدالعزیز خالد، علی سفیان آفاقی، غلام الثقلین نقوی، سید قاسم محمود، مجیب الرحمٰن شامی، ڈاکٹر مسکین حجازی، مرزا ادیب، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، عذرا اصغر، محمد منشا یاد اور دیگر صاحبِ قلم اور صاحب کمال افراد شامل ہیں۔

ملک مقبول احمد کا طرز تحریر سادہ سلیس اور پُر خلوص ہے۔ انہوں نے نقاد یا ناشر کی حیثیت سے نہیں ایک دوست کی حیثیت سے یہ سطور قلم بند کی ہیں۔ اگر چہ وہ اب بھی خود کو ادیب تسلیم کرنے سے انکاری ہیں لیکن ان کی تحریریں ان کے اس بیان کی نفی کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ تحریریں خاکے اور شخصیت نگاری کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ کچھ یادیں اور دوستوں کے تعارف نامے ہیں۔ ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ بے ساختگی ہے۔ انھوں نے بے تکلفی سے ان یادوں کو تازہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ تحریریں ان کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ اب یہ کام نقادوں کا ہے کہ وہ ان تحریروں کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ جن میں ملک صاحب نے مختصر سطور میں قلم کاروں کی ذاتی خصوصیات اور سراپا کو معصومیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ادب کو ان کا احسان مند ہونا چاہئے۔ انہوں نے بہت سے ادیبوں شاعروں اور نقادوں کو دور دراز علاقوں سے کھوج لگا کر ادب کی مسند پر بٹھایا ہے۔ ناشر کی حیثیت سے لین دین میں ان کی شہرت بہت اچھی رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ زندگی کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد انہوں نے قلم سنبھالا ہے تو اس کے ساتھ

کتنا انصاف کرتے ہیں۔

کتاب کا سرورق با مقصد اور دیدہ زیب ہے۔ طباعت و پیشکش مقبول اکیڈمی کی روایات کے مطابق ہے۔

ہفت روزہ ''فیملی''

لاہور

☆☆☆

50 نامور ادبی شخصیات

نپولین کے بارے میں ایک جملہ مشہور ہے۔

وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا......

بس، یہی کچھ ملک مقبول احمد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی بات ہے۔ ان کی آپ بیتی چھپی، سفر جاری ہے۔ یہ زندگی کے سفر کی کتھا تھی۔

اہلِ ادب نے اسے سراہا، مصنف کو تھپکی دی، شاباش سے نوازا اور ہلا شیری سے ان کے حوصلے کو دوچند کر دیا۔...... عمر کا سفر تو رہا ایک طرف، اب کتابوں کے لکھنے، ترتیب اور انہیں لپا جھپ چھاپ لینے کا سفر جاری ہو گیا۔

صاحبانِ علم و دانش انگشت بدنداں...... یہ حضرت اب تک انکسار کی چادر کیوں اوڑھے رہے اور اندر کے ادیب کو کیوں سلائے رکھا......؟ دوسری، تیسری، چوتھی کتاب بھی آ گئی...... انگریزی محاورے کے مطابق...... گرم کیک کی طرح...... لیکن ایک اڑچن رہی، موصوف ابھی تک عجز کا چولا نہیں اُتار رہے...... بار بار، اصرار کر کے کہے جا رہے ہیں۔ صاحبو...... نہ میں ادیب نہ قلم کار...... کون ان سے پوچھے، انور سدید، اے حمید، جمیل آذر، علی سفیان آفاقی سے لے کر تازہ وارِدِ تنقید، ذہین و معاملہ فہم لڑکی صائمہ نورین بخاری تعریفوں کے انبار لگاتے جا رہے ہیں۔ یہ تو ایسے کھرے لوگ ہیں، برسوں سے لکھنے اور

چھپنے والے لوگوں کو بھی مان کے نہیں دیتے...... ملک مقبول کی تحسین کہیں ان کے اندر سے پھوٹی ہے۔

ان کی یہ کتاب خاکہ اور مضمون نگاری کی ملی جلی پیش کش ہے۔ کچھ لوگ تو واقعی نامور ہیں، کئیوں کو ملک مقبول کے قلم نے نامور بنا دیا ہے۔ احسان دانش، میرزا ادیب، حمید اختر اور باقی سب صاحبان انہیں کسی نہ کسی اشاعتی حوالے سے ملے، ملنے والے کی عزت اور وضع داری سے گھایل ہوئے، ملک مقبول ان کی محبت اور بے لوث خلوص کے قائل ہوئے اور ان کے لیے کچھ لکھنے پر مائل ہوئے۔

یہ کتاب بھی اپنی انفرادیت اور ملک مقبول کے حسن قلم اور دوستوں سے ان کے حسنِ سلوک کی وجہ سے مقبول ہو رہی ہے۔ مقبول ہو چکی ہے۔

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

جون 2011ء

☆☆☆

عذرا اصغر

۵۰ نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد کی پہلی پہچان نشرو اشاعت کا ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' تھی جو اعلیٰ معیار کی علمی و ادبی کتابیں شائع کرنے میں مقام بنا چکی تھی۔ ''مقبول اکیڈمی'' کا ناشر بااخلاق، بامروت اور اپنی منکسر المزاجی کے سبب اپنی ساکھ بنا چکا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ''مقبول اکیڈمی'' کا تمام تر نظام اپنی اولاد کے سپرد کیا اور خود تحقیق و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ گویا رانجھا رانجھا کرتے خود رانجھا ہو گئے۔ چنانچہ ملک صاحب کی ابتدائی تصنیفی کاوش ''سفر جاری ہے'' نے ادبی دنیا میں ایک خوش گوار تہلکہ مچا دیا اور ادب پڑھنے اور تخلیق کرنے والوں میں حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملک صاحب نے سفر جاری رکھنے کا ہی اعلان نہیں کیا تھا تحریر و تصنیف کا سفر بھی جاری رکھنے کا فیصلہ سنایا تھا۔

''سفر جاری ہے'' کے بعد ان کی متعدد کتابوں نے چھپ کر نہ یہ کہ اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا انہیں بھی تخلیق کاروں کی صف میں لا کھڑا کیا اور ادباء و شائقین ادب کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی تازہ ترین کاوش ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' ہے جس میں انہوں نے اپنی پچاس پسندیدہ قلمکار شخصیات کے مختصر خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان خاکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود صاحب شخصیت کا مکمل تعارف قارئین سے کراتے ہیں۔ یہاں ہمیں ملک صاحب کی ادبی بصیرت کی داد دینا پڑتی ہے۔ تحریر کی شگفتگی ان کی کہنہ مشقی کا ثبوت ہے۔ کہیں کہیں برجستہ اور شگفتہ جملوں پر مسکرائے بغیر نہیں رہا جاتا

مثلاً قاضی ذوالفقار کے خاکے میں رقمطراز ہیں: ''وہ اسلامیہ کالج لاہور کے آسمان سے گر کر شیخوپورہ کے ایک کالج کے کھجور میں جا اٹکے۔''

ستار طاہر کے بارے میں کہتے ہیں: ''ستار طاہر کی ہتھیلی میں کئی سوراخ تھے۔ ادھر اسے اپنی کسی تحریر کا معاوضہ یا سرکاری دفتر سے ماہانہ تنخواہ ملتی اُدھر وہ اس آمدنی کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں غلطاں ہو جاتا۔ پیسہ ہاتھ کی موری سے نکل جاتا اور ستار طاہر پھانک ہو جاتا۔''

علی سفیان آفاقی کے متعلق لکھتے ہیں: ''باتیں کریں گے تو اتنی دھیمی آواز میں کہ سننے کے لیے کان کھڑے کرنے پڑیں گے۔'' نقش بند قمر نقوی بھوپالی کے لیے یوں اظہار خیال کرتے ہیں: ''نقش بند قمر نقوی بھوپالی جہاناں جہاں گشت ہیں۔ ان کے پاؤں میں چکر ہے اس لیے کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ اور دوسری بات یہ کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے۔ بھوپال سے نکلے تو لاہور سے ایران گئے اور اب خیر سے امریکہ پہنچ گئے ہیں۔ ان کے اسفار کے دوران بندوق ان کے کندھے پر تھی۔ وہ جنگل نکل جاتے تو شیر، چیتے اور باگڑ بلے ڈر کر پناہ گاہیں تلاش کرنے لگتے۔'' ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' لکھ کر جناب مقبول احمد نے اپنے بہترین اور مستند خاکہ نگار ہونے کا ثبوت مہیا کر دیا اور اب وہ شخص جو ایک محض ناشر تھا ہمارے سامنے معتبر و مستند ادیب بن کر کھڑا ہے جس نے بیحد مختصر وقت میں ادب کی قلمرو میں کئی اصنافِ ادب کے قلعے فتح کر لیے ہیں۔ لیکن اس کے مزاج کا انکسار اسی طرح برقرار ہے۔

ملک مقبول احمد، محمد طفیل صاحب ''نقوش'' کے بعد دوسرے ناشر ہیں جو پبلشنگ کے توسط سے ادب میں داخل ہوئے اور نام پایا، مقام بنایا لیکن ملک مقبول احمد جیسا بامروّت اور منکسر المزاج ناشر کوئی دوسرا میری نظر میں نہیں گزرا۔ خدا انہیں اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازتا رہے۔ آمین!

ماہنامہ ''الحمراء'' جون 2012ء

علامہ عبدالستار عاصم
سیکرٹری جنرل کتاب دوست تحریک انٹرنیشنل

۵۰ نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد کا شمار وطن عزیز کی ان عظیم علمی، ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے مملکت خداداد میں تصنیف و تالیف اور اشاعت کتب کی بنیاد رکھی۔ ملک مقبول احمد نے 60 سال قبل مقبول اکیڈمی کے نام سے اُردو بازار لاہور میں ایک ایسے ادارے کی ابتداء کی جس کا مقصد ہر موضوع پر مشتمل کتب کی اشاعت تھا۔ اپنے قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے 2500 سے زادء کتب کے ٹائٹل شائع کر کے اپنے بہت زیادہ فعال اور متحرک ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں بچوں، نوجوانوں، اساتذہ کرام اور خواتین کی ذہنی آبیاری کے لیے دنیا کے ہر موضوع پر نامور محققین دانشوروں، اہل زبان، اہل ہنر اور اہل قلم مصنفین کی کتب شامل ہیں۔

اپنے خلوص، لگن اور شوق کی بناء پر وہ کاروباری حلقوں میں جلد ہی ایک دیانتدار اور محنتی پبلشر کے طور پر پہچانے جانے لگے اور اب تو کوئی کاروباری لین دین کی میٹنگ ہو یا کوئی معاشرتی و سماجی معاملہ مد مقابل ان کے نام اور تعارف سے ہی ان پر ہر قسم کے اعتماد اور تعاون کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

آج سے 4 سال قبل انہوں نے اپنے حالات زندگی ''سفر جاری ہے'' کے نام پر

لکھ کر علمی، ادبی حلقے میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کتاب پر تقریباً ہر بڑے اخبار، صحافی اور ادیب نے خوب تبصرے کیے اور اسے قوم کے لیے ایک انمول تحفہ قرار دیا۔ ''سفر جاری ہے'' پر تبصروں کی شکل میں ''پذیرائی''، بعد میں ''اہل قلم کے خطوط''، ''پیغمبر عالم ﷺ''، ''ارمغان غزل''، ''گمشدہ افسانے''، ''سیاحت نامۂ ترکی'' جیسی کتابیں لکھ کر وہ ادیبوں کی صف اوّل میں شامل ہو گئے۔ حال ہی میں ان کی تازہ تصنیف ''50 نامور ادبی شخصیات'' شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب حقیقت میں شخصیتی خاکوں اور شخصیت نگاری کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس کتاب کا انتساب ''نوائے وقت'' گروپ کے ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' کے ایڈیٹر جناب علی سفیان آفاقی کے نام کیا گیا ہے۔ ایسے لوگ ساری زندگی قلم اور کاغذ کے رشتے سے منسلک رہتے ہیں۔ لیکن وہ کسی بھی صلہ یا ستائش کے بغیر اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ حقیقت میں یہی لوگ کسی بھی معاشرہ کا تاج ہوا کرتے ہیں اور آنے والی نسلیں ان عظیم لوگوں کی زندگی سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کی راہیں متعین کرتی ہیں۔ ملک مقبول احمد نے ایسے 50 لوگوں کی زندگی کا تجربہ طالب علموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ آج کا عہد ڈاکٹر انور سدید کا عہد ہے۔ جتنا کام ڈاکٹر انور سدید نے کیا گزشتہ اور آنے والی صدی میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''سفر جاری ہے'' میں ملک صاحب نے اپنے ادارے کے مصنفین کو بھی متعارف کرایا اور ان کا تذکرہ خوبصورت انداز میں رقم کیا۔ یہ کتاب سوانح عمری ہی نہیں، بلکہ یہ ایک معروف اشاعتی ادارے کی تعمیر و تشکیل اور فروغ وارتقاء کی تاریخ بھی بن گئی ہے۔ 50 ادبی شخصیات جن میں اے حمید، احسان دانش، ابوالامتیاز، ع۔س مسلم، پروفیسر جمیل آذر، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، ڈاکٹر صفدر محمود ڈاکٹر طارق عزیز، سید قاسم محمود، مجیب الرحمٰن شامی، جبار مرزا، محمد آصف بھلی، ناصر نقوی، اظہر جاوید، میرزا ادیب، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید شامل ہیں۔ ان ادباء میں شامل اے حمید اُردو

افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ احسان دانش ادبی تاریخ کا سرمایہ ہیں، ع۔س مسلم پر ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے ہیں، پروفیسر جمیل آذر جدید انشائیہ نگاری کے بانی ہیں۔ اظہر جاوید ادیبوں کے معمار ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید جادوگر ادیب، نقاد، کالم نگار، شاعر، تبصرہ نگار کے طور پر پاکستان کی پہچان ہیں۔

پروفیسر تنویر حسین جدید دور کے قابل احترام مزاح نگار ہیں۔ جبار مرزا کالم نگاروں کے امام ہیں۔ جمیل اطہر قاضی صحافت کی عظمت کا نشان ہیں۔ حفیظ تائب عہد حاضر کے مجدد نعت ہیں۔ حمید اختر مظلوم، غریب عوام کے ترجمان اور مسیحا ہیں۔ خواجہ محمد زکریا علم اور ادب کے خوبصورت مینار ہیں۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب کو آج ان کی عظمت اور علمی مسیحائی کی وجہ سے زمانہ یاد کرتا ہے۔ سعید بدر نعت گوئی کے بے تاج شہنشاہ ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود حقیقی تاریخ نویسی کی وجہ سے ہر طبقہ میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق عزیز کی محنت، دیانت اور خلوص ان کی پہچان ہے۔ غلام الثقلین نقوی کے افسانے ہر دور کی یاد دہراتے رہیں گے۔ سید قاسم محمود جیسا محنتی ادیب صدیوں تک پیدا نہیں ہوگا۔ مجیب الرحمٰن شامی چیف ایڈیٹر روزنامہ ''پاکستان'' اپنی بصیرت کی وجہ سے تمام دانشوروں کی صف میں ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی پی ایچ ڈی کرنے والے طلباء کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گا۔ ناصر نقوی اپنی سادگی، علمی شناسی اور خبر نویسی کے حوالے سے لاہور کی پہچان رہے گا۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم آج حمید اختر، اے حمید، اظہر جاوید، جبار مرزا، جمیل اطہر قاضی، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر انور سدید کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ مجھے اس کتاب میں قابل احترام حمید اختر کے حالات زندگی پڑھ کر بڑا لطف آیا حمید اختر اگرچہ ترقی پسند تحریک کے مخلص ترین رہنما کی حیثیت سے دنیا میں جانے جاتے ہیں اور رائٹ اور لیفٹ دونوں حلقے انہیں احترام سے دیکھتے ہیں۔ جب سجاد ظہیر کو کمیونسٹ پارٹی نے آزادی کے بعد پاکستان

میں خدمات سرانجام دینے کے لیے بھیجا اور انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے زیرِ زمین رہنا ضروری ہو گیا تو اس وقت انہوں نے حمید اختر پر اعتماد کیا۔ پنجاب کے کسی اور ترقی پسند ادیب، حتیٰ کہ اس پارٹی کے سیاسی کارکن کو بھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ حمید اختر پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ بہر حال ''50 نامور ادبی شخصیات'' نامی یہ کتاب ہر طالب علم ہر اُستاد اور تحقیقی صحافی کے لیے ہمیشہ ریفرنس بک کے طور پر کام آتی رہے گی۔ ہم ملک مقبول احمد کو خوبصورت کتاب لکھنے اور شائع کرنے پر تحسین پیش کرتے ہیں اور دُعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے جانشینوں کو علم، ادب کی خدمت کرنے کی ہمیشہ توفیق دے۔ (آمین)

ہفت روزہ اخبار خواتین لاہور۔ ۲۵ اپریل ۲۰۱۱ء

☆☆☆

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

گوشۂ محققین، نکا مہ صاحب 0301-4360919

50 نامور ادبی شخصیات

229 صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت، ہارڈ جلد اور اہل قلم کی تصویروں سے مزین ۵۰ شخصیات کے بارے میں مصنف کے بزرگانہ، برادرانہ، عادلانہ، مشاہدانہ تاثرات پر مشتمل ایک خوبصورت کتاب بازار میں آئی ہے۔ اس کے مصنف ملک مقبول احمد صاحب ہیں۔ میری ہر مہینے ملک صاحب سے ملاقات ہوتی ہے اور یہ ملاقات گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے ہو رہی ہے۔ بڑے محبت کرنے والے، بڑی حوصلہ افزائی کرنے والے، وسیع القلب، وسیع الظرف، مسکراتے چہرے کے حامل، جاذبِ نظر شخصیت غالب کبھی ناراض نہ ہونے والے، کبھی محسوس نہ کرنے والے، اپنے ملاقاتی کے دل میں اُتر جانے والے، یاروں کے یار، مہربانوں پہ مہربان، محسنوں کے محسن، مقناطیسی کردار، دل لبھانے والی شخصیت، بہترین مشیر، ہمدرد طبیب (ہائیڈرو پیتھی کے ماہر غرض۔

وہ ایک شخص خُوب ہے اور ایک ہی مقبُول

آپ نے پہلے "سفر جاری ہے" لکھ کر اپنا لوہا منوایا، پھر پذیرائی لکھ کر مرتب ہونے کا حق ادا کیا۔ پھر "اہل قلم کے خطوط" لکھ کر احسان شناسی اور حُسن بیانی کا حق ادا کیا۔ پھر "پیغمبر عالم" لکھ کر ایک مختصر مگر مبسوط سیرت نگار ہونے کا حق ادا کیا۔ پھر "ارمغانِ غزل" لکھ

کرایک خُوب چنیدہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ پھر ''گلشنِ ادب'' شائع کر کے بہترین چُنیدہ ہونا ثابت کیا۔ پھر ''سیاحت نامۂ ترکی'' لکھ کر بہترین مشاہد اور قلم کار ہونا ثابت کیا۔ اب ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' لکھ کر ''یاروں کا یار'' اور ''ادیبوں کا جلیس'' ہونا ثابت کر دیا ہے۔

واللہ! ایک شخص ہے اور ایک ہی مقبول

''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کا انتساب ''علی سفیان آفاقی'' کے نام ہے۔ جو ''نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو'' کی عمدہ مثال ہیں۔ لکھتے بے مثال ہیں، فرد باکمال ہیں، اپنی ذات میں جمال ہیں، کیا خوش خصال ہیں کہ جن کی تعریف میں ملک مقبول احمد صاحب رطب اللسان ہیں۔

حرفِ آغاز بھی مکرم علی سفیان آفاقی نے لکھا ہے اور ''عرضِ سدید'' تو تعارف و ''تبصرۂ کتب'' کی شناخت ڈاکٹر انور سدید صاحب ہیں۔ ''حرفِ شوق'' کے لکھاری صاحبزادہ سعید بدر قادری ہیں۔ ان سب حضرات کی قلمی مہارت اور علمی جلالت پر گفتگو کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔

واللہ! نہیں کر سکتا ہرگز مَیں نہیں کر سکتا
مَیں ان کی شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا

جناب ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم صاحب کے تذکرہ پُرشوق سے ''تذکارِ گل فشار'' کا آغاز ہوتا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں الفاظ باذوق اور تاثراتِ پُرشوق کے ساتھ کتاب کا انجام ہوتا ہے۔ بیچ میں بڑی قد آور، بامِ شہرت کو چھونے والی، ماہرین فن شخصیات بھی ہیں اور گم نام و بے نام مگر اہلِ قلم شخصیات بھی ہیں۔ گویا

یہ قلم ملک کا ہے اعجاز ناصر
کہ محبوب اپنے کئے ذکر سارے

''پیش لفظ'' میں ملک مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں۔

''میرے کرم فرما متعدد بار تقاضا کر چکے ہیں کہ ان ادیبوں کے خاکے لکھوں جن سے میں متعارف ہو چکا ہوں اور جن کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں۔ان کرم فرماؤں میں جناب علی سفیان آفاقی، برادرِ عزیز پروفیسر جمیل آذر، جناب ڈاکٹر انور سدید اور محترم سعید بدر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان دوستوں کے بار بار کے تقاضوں اور ارشاد کی تعمیل کے لیے میں نے یہ حل نکالا کہ اپنی کتاب پذیرائی میں اپنے تبصرہ نگاروں کو متعارف کرانے کے لیے میں نے جو سوانحی حالات ان سے حاصل کیے تھے ان سے استفادہ کیا جائے اور ان کی فراہم کی ہوئی معلومات سے ہی یہ کتاب مرتب کی جائے میں نے اس کاوش میں اپنا ذاتی تاثر شامل کرنے کی سعی بھی کی ہے۔میں نے اپنے دوستوں کے حُسنِ ظن کی لاج کو پیشِ نظر رکھا ہے۔''

''خیال رہے کہ خاکے نہیں شاید یہ شخصیت نگاری کے زمرے میں بھی نہیں آتے ہیں۔میں نے چند مخلص دوستوں اور شخصیات کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔''

محترم علی سفیان آفاقی فاضل مصنف کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اپنی تازہ ترین تصنیف میں انہوں (ملک صاحب) نے اُردو کی پچاس نامور شخصیات کے خاکے پیش کیے ہیں۔ملک صاحب نے ناشر کی حیثیت سے ساری زندگی گزاری ہے اور ادیبوں اور شاعروں کے وہ ناشر بھی رہے ہیں اور قریبی شناسا اور ملاقاتی بھی۔جن لوگوں سے انہیں واسطہ پڑا ہے انہوں نے ان کی قلمی تصویریں ایک ماہر عکاس کی طرح پیش کردی ہیں۔ان کے پیچھے ان کا مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ کارفرما ہے۔جن شخصیات کے بارے میں انہوں نے اپنے ذاتی تاثرات اور مشاہدات پیش کیے ہیں۔یہ وہ قلمی تصویریں ہیں۔جو انہوں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے سپردِ قلم کی ہیں...... اگلے صفحات میں

آپ خود ان آفتاب و ماہتاب شخصیات کو جگمگاتا ہوا دیکھیں گے۔"

گرامی قدر ڈاکٹر انور سدید صاحب رقمطراز ہیں۔

"عام لوگ صرف اپنی ناک کے نیچے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور وہ اپنے بہترین دوستوں کا تذکرہ کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ لیکن ملک مقبول احمد نے پہلے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا اور پھر "صحبت ہم نشیں" پر فخر کا اظہار کیا آخری بات کا احساس ہوتے ہی ان کو خیال آیا کہ جن ادیبوں نے ان کے ادارے کو اپنی اعلیٰ پائے کی کتابوں سے معیار، اعزاز اور وقار عطا کیا ہے ان کا ذکر الگ سے ہونا چاہئے...... زیرِ نظر کتاب ان کی شخصیت نگاری کا ایک خوبصورت نقش ہے۔"

جناب سعید بدر قادری صاحب مدظلہ اس کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ملک صاحب کا اندازِ تحریر بہت دل کش اور دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے اندازہ ہوتا ہے کہ "ملک صاحب سب کے دوست ہیں اور سب ان کے دوست ہیں۔"

ان کے دل میں سب حضرات کے لیے ایک خاص جگہ ہے اور دل میں احترام موجود ہے اور یہ احترام، یہ تعلق خاطر بظاہر کاروباری ہونے کے باوجود (بے لوثی اور بے غرضی پر مبنی نظر آتا ہے پوری کتاب میں انہوں نے کسی قلم کار کے خلاف ایک جملہ تو کجا، ایک حرف تک نہیں لکھا یوں لگتا ہے کہ سبھی کے سبھی نیک، پارسا اور دوست نواز لوگ ہیں اور سبھی انسانیت کے عالمگیر رشتہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ ملک صاحب سب کو ہی دوست یا بھائی گردانتے ہیں۔"

جناب ملک مقبول احمد صاحب نے ادباء و شعراء و عظماء سے اپنی نیاز مندی اور

دلبری کا اظہار کن کن الفاظ میں کیا ہے اور ان کے کون کون سے خصائص اپنے قارئین پر منکشف کئے ہیں۔ آیئے چند ایک تاثرات کا مطالعہ کریں۔

۱۔ ع۔س مسلم نوے سال گزار لینے کے بعد بھی صحت مند ہیں۔ چاک و چوبند ہیں۔ توانا ہیں۔ ان کا قلم روانی سے چل رہا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُنہیں علامہ ع۔س مسلم لکھوں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی میری تائید کریں گے۔

۲۔ ''ان (احسان دانش) کی خودنوشت سوانح حیات ''جہان دانش'' میرے لیے ہمیشہ ایک رہنما کتاب ثابت ہوتی رہی مجھے جب بھی زمانہ مشکلات سے دوچار کرتا تو میں احسان دانش کی خدمت میں حاضر ہوتا ان کی باتیں سنتا اور میرا ٹوٹا ہوا حوصلہ قائم ہو جاتا۔''

۳۔ ''اختر شمار لاہور میں تھے تو مقبول اکیڈمی پر ہر ہفتے تشریف لاتے اور ہمارے ادارے کی کتابوں کے علاوہ دوسرے ناشرین کی چھپی ہوئی کتابیں بھی دل چسپی سے پڑھتے تھے۔ وہ زیادہ باتیں کرنے اور اپنی انا کے غبارے میں ہوا بھرنے والے ادیب نہیں ہیں۔ سرائیکی خطے کے حوالے سے ان کی زبان میں بڑی مٹھاس ہے اور جونیئر ادیبوں سے اسی طرح پیش آتے ہیں جیسے ان کے سینئر ہوں۔''

۴۔ ''اسرار زیدی کی زندگی کی متاع عزیز ان کا خلوص ہے وہ کم گفتار انسان ہیں لیکن دوسروں کی تمام باتیں بڑے غور سے سنتے ہیں شاعری میں انہوں نے ہمیشہ انسان دوستی کے موضوعات کو اہمیت دی

اور پاکستان کے سہانے مستقبل کے خواب دیکھے۔ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے لیکن اسرار زیدیؔ نے اُمید قائم رکھی ہے۔

۵۔ ''ندائے ملت'' سیاسی ہفت روزہ ہے لیکن میں رسالہ اعتبار ساجد کا کالم ''ہم لوگ'' پڑھنے کے لیے خریدتا ہوں۔

۶۔ بے شک اگر کسی نابغہ عصر ہستی نے سب سے زیادہ تاریخ ساز، بے مثال اور یادگار کارکردگی کا تخلیقی اور تنقیدی سطح پر اظہار کیا ہے تو وہ صرف اور صرف ڈاکٹر انور سدید کی ذاتِ باصفات ہے۔

۷۔ مجھے فخر ہے کہ اے حمید میرا دوست ہے اور مقبول اکیڈمی کا معاون ہے۔ خدا ان کے قلم کو رواں دواں رکھے وہ دکھی انسانیت میں محبتیں تقسیم کر رہا ہے۔

۸۔ پروفیسر تنویر حسین دوسروں کی دل و جان سے عزت کرتے ہیں اور اپنی عزت کرانے کا فن جانتے ہیں زندہ باد پروفیسر تنویر حسین، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

۹۔ جبار مرزا عمر کے اعتبار سے مجھ سے چھوٹے لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں اتنی محنت کی ہے اتنے تجربات سمیٹے ہیں اور اتنے بڑے بڑے لوگوں کی مجالس سے فیض اُٹھایا ہے کہ میں ان کو ایک بڑا آدمی اور بڑا انسان تسلیم کرتا ہوں اور ان کو جھک کر ملتا ہوں۔

۱۰۔ پروفیسر جمیل آذر کا ظاہر باطن ایک ہے اور وہ ایک نیک دل اور سادہ انسان ہے اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔

۱۱۔ جمیل اطہر قاضی میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں مقبول اکیڈمی

کی نئی کتاب چھپتی ہے۔تو خرید کر پڑھتے ہیں اور جب کبھی ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں تو ہمارے گھر کو اس خوشبو سے معطر کر دیتے ہیں۔ جوان کے بدن میں ''شیخ سرہند'' نے سرایت کر دی ہے۔

۱۲۔ ملازمت کے دوران ہی (حفیظ تائب نے) پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پنجابی کی ڈگری لی۔ محکمہ بجلی (برقیات) کی تیس سالہ ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۷۹ء میں ریٹائرمنٹ لے کر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں لیکچرار مقرر ہو گئے اور چند برسوں کے بعد ''یوسف زلیخا کے قصے'' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کا مقابلہ لکھا لیکن اپنی طبیعت کے فطری انکسار کی وجہ سے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی ''ڈاکٹر'' نہیں لکھا کہتے تھے کہ اس سے نخوت کی بُو آتی ہے۔

۱۳۔ حمید اختر کو خود نمائی سے شدید نفرت ہے۔ وہ قریبی دوستوں کی محفل میں بھی اپنے کام کی خود تعریف نہیں کرتے اور ملال کا اظہار کرتے ہیں کہ روٹی روزی کی مصروفیت نے انہیں ادب کا فریضہ پوری طرح انجام دینے کی فرصت ہی نہیں دی۔

۱۴۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بالعموم اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں جسے بالعموم دوسرے اساتذہ بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اکبر الہٰ آبادی پر ان کا پی ایچ ڈی کا کام ہے۔ اس سے قبل یہ موضوع اورینٹل کالج کے دو تین اساتذہ نے منظور کرایا تھا۔ لیکن وہ اس اہم کام کی مناسبت سے تحقیق کی محنت نہ کر سکے اور چھوڑ گئے خواجہ صاحب نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور پھر اکبر الہٰ آبادی

کے بارے میں بہت سی نئی چیزیں سامنے لے آئے۔

''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں شامل تمام شخصیات کے بارے میں انفرادی طور پر ملک مقبول احمد صاحب کے رشحات اتنے زیادہ قابل مطالعہ، معلوماتی، مشاہداتی اور تاثراتی ہیں کہ ان کو پڑھنے اور آگے دوسری جگہوں پر لکھنے (Reproduce) کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر شخصیات پچاس ہیں۔ رشحات مقبول طویل و قیصر ہیں اور سینکڑوں ہیں۔ ان سب کا احاطہ اس مختصر مضمون میں کرنا مشکل ہے۔ تاہم مختصراً یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک صاحب نے اپنی کتاب میں:

۱۔ اپنے ہر ممدوح کا ذکر خیر ہی کیا ہے۔

۲۔ ان کے حالات ایسے لکھے ہیں گویا آپ ان کے شاہد ہیں۔

۳۔ اندازِ بیاں بہت سادہ اور سلیس ہے۔

۴۔ اپنے زیر قلم دوستوں کی محنت اور مشقت کے پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔

۵۔ دل کھول کر تعریف بھی کی ہے اور پذیرائی بھی۔

۶۔ ان حضرات کے حالاتِ زندگی سے کئی یقینی مثبت اور فکری گوشے بے نقاب کیے ہیں۔

۷۔ دوست کو دوست اور خیر خواہ کی نظر سے دیکھا ہے اور یہی تصویر آگے دکھادی ہے۔

۸۔ قارئین کے علمی، ادبی، تدریسی اور قلمی شوق کو ہوا دی ہے۔

۹۔ زبان و بیان پر گرفت مثالی ہے۔

۱۰۔ ملک صاحب کسی ''محبوب'' کی تعریف کرتے ہیں۔ کسی کی

زندگی کا کوئی پہلو سامنے لاتے ہیں، کسی کو دُعا دیتے ہیں، کسی کے بارے میں ''خیر'' کی اُمید کا اظہار کرتے ہیں۔

غرض زبانِ قلم سے ملک صاحب اپنے تمام قارئین کو یہ پیغام دے رہے ہیں۔

یہ میرے ہیں دوست اور بھائی عزیزو!
میں نے ان سے چاہت لگائی عزیزو!
میں نے ان کو دیکھا ہے حُسنِ نظر سے!

یہ میری عمر کی کمائی عزیزو!
جسے تم بناؤ خلیل اور ہمدرد
کرو پھر نہ اس سے جُدائی عزیزو!
نہیں ہیں میسر خِرد مند ایسے
میں نے لَو ہے جن سے لگائی عزیزو!
عزیزو یہ دنیا بڑی مختصر ہے!
گھٹاؤ نہ اس کی چھوٹائی عزیزو!
پھر بانٹو محبت شب و روز ایسے
ختم ہو نہ پھر یہ کمائی عزیزو!
زاہدؔ دوست تو ہیں انعامِ خدائی
ملک صاحب نے راہ بجھائی عزیزو!

ملک صاحب نے ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں جس جس شخصیت پر قلم اُٹھایا ہے اپنی محبت، عقیدت، شفقت اور موانست کا حق ادا کر دیا ہے۔ ملک صاحب ان حضرات کے بارے میں الفاظ کے چناؤ، جملوں کی ترتیب، فقروں کی تسہیل اور تاثرات کی تحریر

کرتے وقت کن کٹھنائیوں سے گزرے ہوں گے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر اس کی گواہی دے رہی ہے۔ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ ملک صاحب کو اپنے دوستوں میں کوئی قابلِ اصلاح بات نظر نہیں آئی بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر ملک صاحب ایسا نہ کرتے تو شاید جذبہ دوستی اور غلبۂ شوق واردات سے انصاف نہ کر سکتے۔ ان کی آنکھ میں ایسا آئینہ فِٹ ہے۔ جو صرف حسن وخوبصورتی کو دیکھتا ہے خامی وقبح ان کے آرسی میں نظر ہی نہیں آسکتا۔

ملک صاحب نے صرف لکھنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ ہر ادیب کی تصویر سے بھی تحریر کو سجایا ہے اور اندرون کتاب یہ تصویریں بلیک اینڈ وائٹ ہیں جبکہ ٹائٹل پر 24 ادباء کی رنگین تصویروں نے ٹائٹل کو گل وگلزار بنا دیا ہے یہ وہ مخصوص احباب ہیں جو شاید ملک صاحب کو اپنے خلوص واپنائیت سے مجبور کر چکے ہیں کہ وہ ان کو دل کے اندر بھی یاد رکھیں اور دل کے باہر بھی یاد رکھیں۔ اگر کتاب کو ''دل'' قرار دے دیا جائے۔

زندگی فانی ہے نہ یہاں کوئی ہمیشہ رہا ہے اور نہ رہے گا۔ میں اکثر یہ شعر گنگناتا ہوں۔

بدنیا گر کسے پائندہ بودے

ابو القاسم ۔ محمدؐ زندہ بودے

اگر کسی کو بقا حاصل ہے۔ بقا حاصل تھی اور بقا حاصل رہے گی تو وہ اللہ کریم کی ذات ہے اور پھر وہ باقی رہ سکتا ہے جو ''اللہ والا'' ہو جائے یا ''اللہ کے بندوں'' کا ہو جائے۔ ملک صاحب نے ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں بہت سے ایسے ادیبوں کو بھی زندہ کر دیا ہے جو دراصل دُنیائے رنگ وبو میں سانس نہیں لے رہے اور بہت سوں کی دیر تک زندگی کا سامان کر دیا ہے۔ جب تک یہ کتاب لائبریریوں اور مطالعاتی میزوں پر موجود رہے گی۔

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دُنیا

ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک فرد ۵۰ افراد کے زندہ رہنے کا امکان پیدا کرے اور وہ مرجائے۔ جب بھی ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کا ذکر ہو گا۔ اس کا حوالہ لکھا جائے گا۔ اس سے استفادہ کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ملک مقبول احمد صاحب کا نام بھی صفحۂ قرطاس پر آئے گا۔ ان کے فقرے، جملے، پیرے، آراء، تاثرات، حوالے اور صفحات نقل کیے جائیں گے۔ آپ کو دوست نواز اور منبعٔ محبت کے طور پر یاد کیا جائے گا۔

یہی زندگی ہے، یہی زندگی ہے
کوئی یاد آئے، یہی زندگی ہے

جو شخص بھی ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کا فرنٹ ٹائٹل دیکھے گا۔ اسے بیک ٹائٹل بھی دیکھے گا۔ وہاں ملک مقبول احمد صاحب مسکراہٹ نہیں مسکان لیے نظر آ رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں۔

دُنیا والو! مل کے ہم سے دل ہمارا دیکھنا
ہم سمندر ہیں کنارے سے ہمیں کیا دیکھنا

میں بطور خاص شکر گزار ہوں ملک صاحب کا کہ انہوں نے مجھے بھی ''نامور'' ادیبوں/ اہل قلم میں شامل کر دیا ہے ورنہ حق یہی ہے کہ یہ بھی ملک صاحب کی نظر کا کمال ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم والا معاملہ ہے''

☆☆☆

حکیم محمد عزیز الرحمٰن جگرانوی
چیئرمین حمایتِ اسلام طبیہ کالج لاہور

"۵۰ نامور ادبی شخصیات"

محترم جناب قبلہ ملک مقبول احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ایک دو مرتبہ آپ سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے لیکن وہ اتنی محدود تھیں کہ جس طرح ایک تصویری جھلکی ہوتی ہے مجھے یاد ہے چند ماہ قبل عزیزم علامہ عبدالستار عاصم کی کتاب "انوارِ جمیل" کی تقریب رونمائی جس کی صدارت آپ نے کی اور چیف گیسٹ ڈاکٹر پروفیسر شفیق جالندھری اور راقم تھا۔ وہاں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، آپ جیسے فرشتہ صفت انسان سے مل کر روحانی مسرت نصیب ہوئی۔ ابھی ابھی آپ کی نئی کتاب "50 نامور ادبی شخصیات" علامہ عبدالستار عاصم نے بطور تحفہ پیش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں "50 نامور ادبی شخصیات" کی تاریخ اور خدمات ہی نہیں بلکہ ایک پوری صدی کی جامع تاریخ بھی ہے۔ اس کتاب کا انتساب آپ نے پاکستان کے مایہ ناز ادیب، صحافی، کالم نگار، فیچر نگار اور انسانیت سے محبت کرنے والے بہت ہی قابلِ احترام جناب علی سفیان آفاقی سے منسوب کر کے پاکستانی ادب کا حق ادا کیا ہے بلکہ انہیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ 50 لوگ آپ سے جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں اور آپ کا احترام کرتے ہیں۔ آپ بھی ان سب کا احترام کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ 50 لوگ آپ کی چلتی پھرتی لائبریریاں اور اشتہارات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انٹرنیٹ کے دور میں سب

سے اچھیور سب سے سستے ''ایڈ'' ہیں۔ جنھیں آپ نے ادب کی دنیا میں امر کر دیا۔
ڈاکٹر انور سدید، سعید بدر، پروفیسر ڈاکٹر تنویر حسین، جبّار مرزا (ممتاز کالم نگار روزنامہ جنگ)،
جمیل اطہر قاضی، حمید اختر، ڈاکٹر صفدر محمود، مجیب الرحمٰن شامی، ڈاکٹر طارق عزیز، علامہ عبدالستار عاصم،
سید قاسم محمود، محمد آصف بھلی (ممتاز کالم نگار روزنامہ نوائے وقت) محمد منشایاد، پروفیسر ڈاکٹر مسکین حجازی،
ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا جیسے علم وادب کے کوہ ہمالیہ کے خاکے لکھ کر تاریخ کے طالب
علموں کے لیے علم اورادب کی شمع روشن کردی ہے۔ جب بھی پاکستان کی ادبی تاریخ لکھی جائے
گی۔ یہ کتاب ہمیشہ حوالہ کے طور پر پیش کی جاتی رہے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتاب
کے انگلش، پشتو، سندھی، عربی، پنجابی، بلوچی اور دُنیا کی دیگر زبانوں میں تراجم کروا کے عالمی سطح
پر اس کتاب کو متعارف کروایا جائے۔ 50 علمی ادبی ہیرے جو طلباء و طالبات کے لیے رول
ماڈل کا درجہ رکھتے ہیں۔ نئی نسل کو بالخصوص اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ میں دُعا گو
ہوں کہ جس طرح آپ نے یہ کتاب منظر عام پر لا کر اہل وطن پر احسان کیا ہے۔ مزید کتابوں کا
سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ایک ضروری گزارش آپ سے یہ کرنا ہے کہ آپ اپنی ہر کتاب میں
اپنے بیٹوں کا ضرور تعارف کروائیں تا کہ دیئے سے دیا جلتا رہے۔ آخر میں سوسائٹی کے صاحبِ
حیثیت، ادب نواز، علم نواز، انسانیت نواز خواتین و حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ایسی ادبی
کتابیں خرید کر معاشرے کے ایسے لوگوں میں تقسیم کریں جو کتابیں خرید کر نہیں پڑھ سکتے اور اس
حوالے سے الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کو کتاب کی اہمیت کو خوب اُجاگر کرنا چاہئے۔ جس طرح
درویش دانشور افتخار مجاز (پی ٹی وی) کتاب پر ایک پروگرام کر کے پاکستانی ادیبوں، شاعروں،
دانشوروں کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہتے ہیں۔ میں دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ پر،
آپ کی فیملی پر، آپ کے دوستوں پر، آپ کے ادارے کی کتب پڑھنے والوں پر اور آپ کی
اکیڈمی سے محبت کرنے والوں پر اپنا فضل جاری رکھے۔

ایک جامع اور خوبصورت کتاب

''علامہ عبدالستار عاصؔم نے ۵۰ نامور ادبی شخصیات کی کتاب مجھے تحفتاً بھجوائی تھی......اور میں نے یہ سوچ کر اُس کی ورق گردانی کی تھی......کہ انٹرویو کرنے والے نے شخصی خاکوں میں ڈھونڈ کر خامیاں مزاحیہ پیرائے میں اس طرح بیان کی ہوں گی۔ کہ وہ تعریف لگے......کہ کچھ اسی طرح کے خاکے میری نظر سے بھی گزرے تھے۔ اُس کی صبح دوپہر تین بجے ہوتی ہے، کیا کرے کہ وہ ساری رات جاگتا ہے۔یا وہ دین دار تو نہیں ہے۔ مگر دین داروں سے اچھا ہے'' ......میری سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا...... یہ سچ ہے یا جھوٹ...... کہ کسی کی مبالغہ آمیز تعریف کرنے میں......ہم......اچھے لوگوں کو بھی رگڑا دے دیں......یہ عزت دی جا رہی ہے......یا بھگو کر جوتے لگائے جا رہے ہیں......لوگ کہتے بھی یہی ہیں......کہ عزت اور بے عزت میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ جب کہ میرا یہ ماننا ہے کہ زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

میں سچ کہہ رہی ہوں......بلکہ اپنی کم علمی کا اعتراف کرتی ہوں کہ میں ملک مقبول احمد کو بالکل نہیں جانتی......ان کی تحریریں کبھی نہیں پڑھیں۔ باوجود اس کے میری کتابیں زیادہ تر لاہور سے ہی شائع ہوتی ہیں......جن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ مگر میری کوئی بھی کتاب ان کے ادارے سے شائع نہیں ہوئی۔ اور جب...... پچاس ادبی شخصیات کا تعارف پڑھا......اکثر کو میں جانتی تھی......(حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کی جوائنٹ سیکرٹری رہ چکی ہوں)......اور بہت شخصیات کے بارے میں آگاہی ہوئی......مگر ایک ایسی شخصیت

جو پس پردہ تھی۔ جو اپنے آپ کو سمیٹ کر...... صرف ادیبوں کے بارے میں لکھنے کی خواہش مند تھی۔ وہ اپنی تحریر کے آئینے میں مجھے صاف نظر آ گئی۔

میں واقعی کم علم ہوں...... کہ کبھی ملک مقبول احمد سے ملی ہی نہیں تھی۔ کبھی فون پر بات نہیں ہوئی تھی۔

ایک ایسا صحافی...... اپنے اندر...... اتنا انکسار رکھتا ہے...... کہ اپنی ذات کی نفی کر کے دوسروں کی صرف خوبیاں ہی دیکھتا ہے۔

میں نے تو...... ایسے صحافی نہیں دیکھے...... واقعی نہیں دیکھے...... میں عبدالستار عاصم سے بھی یہی کہتی ہوں...... کہ آپ اس دنیا کے تو نہیں نظر آتے...... اپنے دل میں ہمہ وقت فلاحی کاموں کے لئے بے چین، دوسروں کو عزت و توقیر دینے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ (آج کے لوگوں کو تو اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔)

اسی طرح...... مجھے ملک مقبول احمد...... بھی ایسے ہی لگتے ہیں...... کہ تاریخ کے صفحات سے نکل آتے ہیں۔

جن کا مقصد لوگوں سے بے لوث محبت کرنا اور عزت دینا ہو۔ (ماشاءاللہ)

آج کے نفسا نفسی کے اس دور میں کوئی کسی سے اُس وقت تک بات تک نہیں کرتا جب تک اس کا کسی کے پاس کوئی کام نہ اُڑا ہو! مگر ایسے لوگ بھی بہر حال موجود ہیں......!

مختصر یہ کہ کتاب نہ صرف اچھی...... بلکہ اس کا انتساب جس شخصیت کے نام ہے...... میں حقیقتاً ان کا دل سے احترام کرتی ہوں۔ علی سفیان آفاقی...... بہترین مصنف اور بہترین انسان ہیں۔

اور میں سمجھتی ہوں کہ سچے انسانوں کی تحریروں میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے...... جو قاری کو اپنی جانب کھینچتی ہے......!

لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کی آبادی میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔شاید غلط کہتے ہیں۔

''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں صرف دو خواتین ہیں......!

میرا یہ مشورہ ہے کہ ایسی جامع کتاب کو میٹرک کے کورس میں شامل کرنا چاہئے۔ ہمارے طالب علموں کو اپنے ملک کے نامور ادیبوں کے بارے میں مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔

مدیر ''ماہنامہ پاکیزہ'' کراچی

☆☆☆

ڈاکٹر تنویر حسین

931/G، سید عمران علی سٹریٹ 2، نادر آباد
بیدیاں روڈ، لاہور، کینٹ

50 نامور ادبی شخصیات

فن تعارف نگاری کی ایک اہم کتاب

کسی ایک موضوع پر مبسوط، مربوط اور مضبوط کتاب تحریر کرنا ایک مشکل عمل ہے مگر کسی نئے اور اچھوتے موضوع کو دریافت کرنا بھی کارِدارد ہے۔ بعض مصنفین متفرق موضوع پر خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں لیکن کسی خاص موضوع پر مربوط کتاب لکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ملک کے نامور اشاعتی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کے مہتمم ملک مقبول احمد صاحب اس اعتبار سے ذہنِ رسا کے مالک ہیں کہ وہ بہت قلیل عرصہ میں نیا موضوع بھی سوچ لیتے ہیں اور پھر اس پر ایک مربوط اور مضبوط کتاب بھی لکھ دیتے ہیں۔ حال ہی میں ملک صاحب ایک نیا موضوع ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کتابی صورت میں دنیائے ادب کے سامنے لائے ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوع کو غزل کے اشعار کی طرح سجا دیا ہے۔ غزل کے اشعار پھولوں کی مانند ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی پھول گلاب کا ہوتا ہے۔ کوئی چنبیلی کا، کوئی نسرین کا اور کوئی نسترن کا۔ ملک مقبول احمد صاحب نے اپنی کتاب میں ایک ایسی کہکشاں سجائی ہے کہ اس کہکشاں کا ہر ستارہ اپنی ضو سے خود پہچانا جاتا ہے۔ ملک صاحب کی شاہ کار خودنوشت ''سفر جاری ہے'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مارکیٹ میں آئی تو پاکستان اور

بیرون پاکستان سے دانش وروں اور تبصرہ نگاروں نے اس پر داد وتحسین کے نہ صرف ڈونگرے برسائے بلکہ اسے ایک ادبی خودنوشت قرار دیا۔ ملک صاحب نے اپنے تبصرہ نگاروں کے سوانحی حالات یکے بعد دیگرے جمع کیے اور پھر انہیں اپنے خاص اسلوب میں گوندھ کر خاکوں کی صورت میں پیش کر دیا۔ ان تبصرہ نگاروں کے تعارف نامے تو ملک صاحب نے اپنی کتاب ''پذیرائی'' میں مع تصاویر شائع کر دیئے تھے۔ لیکن یہ کتاب ان تعارف ناموں کی ایک ادبی شکل ہے۔ ملک صاحب کے ان تعارفی خاکوں کو پڑھتے جایئے تو ملک صاحب کے تخلیقی جملوں کی سوندھی سوندھی خوشبو مشامِ جاں کو معطر و معتبر کرتی چلی جاتی ہے۔ ادیبوں شاعروں کے حالات و واقعات پر مبنی اس کتاب کو اسی طرح سوچا اور لکھا گیا ہے، جس انداز سے تخلیقی خاکے سوچے اور لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ملک صاحب نے اس کتاب کو صرف جملوں کے ادبی چسکے اور محض عبارت آرائی تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ یونیورسٹیوں کے ان اسکالروں کی ضروریات کا خیال رکھا ہے۔ جو اپنے ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کے لیے شہد کی مکھیوں کی طرح مواد جمع کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ کتاب ہمارے نئے اسکالروں کے لیے کسی سوغات سے کم نہیں۔ ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' ایک پکچر گیلری کی مانند ہے۔ جس میں عہدِ رفتہ اور عہدِ حاضر کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ملک صاحب نے جن ادبی شخصیات کی قلمی تصویریں بنائی ہیں، ان میں ابوالامتیاز ع۔ س مسلم، احسان دانش، احمد پراچہ، ، ڈاکٹر اختر شمار، اسرار زیدی، اظہر جاوید، اعتبار ساجد، ڈاکٹر انور سدید، اے حمید، پروفیسر تنویر حسین، جبار مرزا، پروفیسر جمیل آذر، جمیل اطہر قاضی، مولانا حامل علی خان، حفیظ تائب، حمید اختر، حمید کاشمیری، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، قاضی ذوالفقار احمد، رحمان مذنب، ڈاکٹر رشید امجد، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، رئیس احمد جعفری، ستار طاہر، سعید بدر، ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر طارق عزیز، علامہ عبدالستار عاصم، عبدالعزیز خالد، علی سفیان آفاقی،

غلام الثقلین نقوی، مجیب الرحمٰن شامی، محمد آصف بھلی، محمد منشایاد، ڈاکٹر مسکین حجازی، میرزا ادیب، ناصر نقوی، پروفیسر نذیر احمد تشنہ، سید واجد رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا اور دیگر شامل ہیں۔ اسے مقبول اکیڈمی اُردو بازار لاہور نے نہایت خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

☆☆☆

سید مسعود اعجاز بخاری
بانی وصدر نشیں مجلس تحقیق فکر وفلسفہ پاکستان
32۔بی تھری پارٹ سیکنڈ میر پور آزاد کشمیر
موبائل:0312-5506180

اُردو ادب کا جی ایچ کیو

ایک عہد ساز ناشر، ادارہ مقبول اکیڈمی کے روح رواں، ملک مقبول احمد خود ایک عالی قدر ادیب اور دانشور ہیں۔ان کی کتاب ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' ایک گراں قدر ادبی کاوش ہے۔اس نادر علمی و ادبی کاوش کے منظر عام پر آنے کے سبب وہ خصوصی تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

تازہ کاری، خلوص، بے ساختہ پن، ایجاز و اختصار، جامعیت، سادگی وپُر کاری، حلاوت، متانت وشائستگی، بُردباری اور وقار، ان کی تخلیقی انفرادیت کے خصوصی جوہر ہیں جو کہ ان کی تحریر کو دلآویز، جاوداں اور جادو اثر اُسلوب سے ہمکنار کرتے ہیں۔

''پچاس نامور ادبی شخصیات'' میں پیش کردہ شخصیات میں سے ہر شخصیت اپنی ایک پہچان اور شناخت رکھتی ہے۔

ملک مقبول احمد ایک وسیع المطالعہ، مضبوط قوت مشاہدہ اور تجربات ومحسوسات کی حامل شخصیت ہیں۔ ہر ایک فرد سے مختلف اوقات میں ملاقاتوں، مشاہدے اور تجزیہ وتحقیق کے عمل سے گزر کر، اپنی طرز کی واحد کاوش منظر عام پر لانے میں کامرانی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ بڑی بات یہ کہ ان میں سچائی اور انکسار جابجا جلوہ گر ملتے ہیں۔ تخلیق کی دُنیا میں انھیں

وہ کامرانی، اعتماد اور انفرادیت عطا کرتے ہیں جو کسی اور کو نصیب نہیں۔ وہ ہمدرد اور رقیق القلب ہونے کی بلند تر انسانی صفات سے بھی آراستہ و پیراستہ اور متصف ہیں جو انھیں صوفیانہ مزاج سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ یہ صفات انھیں انسانیت سے ہم رنگ کر کے اہل دانش و بینش اور ادب دوستوں کی قربت سے آشنا کر دیتی ہیں اور ان کی شخصیت کو وہ دلآویزی اور نُدرت عطا کرتی ہیں جو انھیں اُردو ادب میں ممتاز اور رفیع الشان مقام و حیثیت کا حامل بنانے اور ہر دلعزیز شخصیت بننے میں اساسی کردار ادا کرتی ہیں۔

ملک مقبول احمد نے ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' میں اس قدر بڑے ناموروں کی کہکشاں سجائی ہے کہ ان میں کوئی آفتاب ہے تو کوئی ماہتاب، کوئی ستارہ ہے تو کوئی جگنو اور کوئی دیا۔ گویا ہر کوئی اپنی جگہ بے مثال و بے عدیل۔

یہ کتاب شخصیت نگاری اور خاکہ نویسی کا دلفریب نمونہ، تجزیہ و تحلیل اور تحقیق جو جستجو کا خوبصورت امتزاج ہے۔

بجا طور پر انھیں اور ان کے ادارہ کو اُردو ادب کا جی ایچ کیو کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ادباء و شعراء اور تحقیق و تخلیق سے وابستہ، دانشوروں کی اکثریت، ان کے فیض سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

اس گراں قدر کاوش پر انھیں ایک بار پھر خصوصی مبارک باد قبول ہو۔ اُمید ہے کہ وہ اُردو ادب کو ایسی تخلیقات سے مزیّن و منور اور مہکاتے رہیں گے۔

☆☆☆

راجہ عدیل بھٹی
مجلس فکر و دانش۔میر پور (آزاد کشمیر)

رابطوں کے سفیر......ملک مقبول احمد

اِنج ہے ٹُٹے دِل وِچ اَرمان دا آ جانا
جیویں جسم چو ں نکلی ہوئی جان دا آ جانا
خاناں دے خان پروہنے ساجن سب نے ویکھے نیں
اَج ویکھو میری جُھگی تے سُلطان دا آجانا

علاقہ دینہ ضلع جہلم سے تعلق رکھنے والے نامور پنجابی شاعر بابو ساجن کے درج بالا شعر کے مصداق ہم دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں، جنہیں مملکت خداداد پاکستان کی مشہور و معروف ''مقبول اکیڈمی'' کے رُوح رواں، زندہ دلوں کے شہر کے وسینک اور ''رابطوں کے سفیر'' عزت مآب ملک مقبول احمد کی تصنیف ''سفر جاری ہے''، ''آپس کی باتیں''، ''پیغمبر عالم ﷺ''، ''قرآنی دُعائیں''، ''حج و عمرہ''، ''گمشدہ افسانے'' اور ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' نہ صرف بطور تحفہ موصول ہوئی ہیں بلکہ وہ بھی ملک صاحب کے آٹوگراف کے ساتھ۔

ملک صاحب کی تصانیف ہمارے لئے کسی بہت بڑی نعمت سے کم ثابت نہیں ہوئی ہیں، بلکہ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ''کسی جھگی/جھونپڑی میں سلطان کا آجانا''۔

جس طرح کسی جھگی میں کوئی سلطان آجائے تو پھر سلطان کی موجودگی کی وجہ سے اُس کٹیا کی قسمت سنور جاتی ہے، بالکل ایسے ہی ملک صاحب کی بھیجی ہوئی ان کی تصانیف نے ہماری قسمت بھی بدل کے رکھ دی ہے۔

ملک صاحب کی تصانیف کے ایک ایک لفظ میں پاکیزگی، سچائی، سادگی اور دِل کے ساتھ ساتھ رُوح کو بھی معطر کر دینے والی گلاب کی خوشبو پائی جاتی ہے، جو قاری کو اپنے حصار میں لئے یادوں کے گہرے سمندر میں نہ صرف غوطہ زن ہونے کیلئے مجبور کر دیتی ہیں بلکہ قاری کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ملک مقبول احمد کی تحریر ایسے جادوئی اثرات رکھتی ہے کہ جب تک قاری ساری کی ساری کتاب ختم نہ کر لے، اُسے چین نصیب نہیں ہوتا۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ہم نے سکول کے بچوں کے ٹائم ٹیبل کی طرح بیک وقت ملک صاحب کی تمام تصانیف کا مطالعہ ٹائم ٹیبل کے مطابق کیا ہے۔

ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جہاں ملک مقبول احمد کی تصانیف انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں، وہیں ملک صاحب بھی اپنی ذات میں ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتے ہیں (جس کا اندازہ قاری اِن کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد بخوبی کر سکتا ہے)۔ اِن کی تصانیف جہاں حاجی صاحب کے ظاہری اور باطنی حسن سے پردہ چاک کرتی ہیں، وہیں قاری کو علم و دانش کے بلند مرتبہ پر فائز اہل علم حضرات کے حالات و واقعات سے بھی روشناس کراتی ہیں۔ ملک صاحب نہ صرف علم دوست انسان ہیں بلکہ علم پرور بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر رابطوں کے سفیر ہیں، ان کی تصانیف کی وجہ سے ہی ہم بہت سے صاحب علم حضرات بارے آگاہی حاصل کر سکے، یہ صرف ''رابطوں کے سفیر...... ملک مقبول احمد'' ہی کے فیضان کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔

ہمارا یارانہ ملک صاحب سے گو اتنا پرانا نہیں اور نہ کوئی روبرو ملاقات ہے لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار و باک نہیں کہ ملک صاحب سے ہمارا نہ صرف صدیوں پرانا ناطہ ہے بلکہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا ملک صاحب سے رُوحانی رشتہ بھی ہے۔ ملک صاحب کی تصویر دیکھنے کے بعد دل کو عجیب سا سکون ملتا ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت ہی اپنا ہو۔

ملک صاحب نہایت ہی ہمدرد، شفیق اور مہربان شخصیت ہیں اپنے انہی اوصاف کی وجہ سے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں، ملک صاحب زبان کا پاس اور دوستی کی لج پالنے والے انسان ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کی اس عنایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم علم و ادب کے ذیشان مکتب کے ادنیٰ سے طالب علم ہیں۔ بذریعہ فیکس ملک صاحب سے ان کی تصنیف ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کے حصول کیلئے استدعا کی۔ ملک صاحب نے کمال شفقت اور انتہائی خوش دلی سے مقبول اکیڈمی کی شائع کردہ ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' سمیت ۱۴ کتابیں بذریعہ رجسٹرڈ پارسل ارسال کر دیں۔ یہ ملک صاحب جیسے ہی بڑے لوگوں کا اعلیٰ ظرف اور بڑا پن ہے کہ ہمارے جیسے ادنیٰ طالب علم کے ساتھ بھی نہایت ہی ہمدردی اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔

یہاں عجب اتفاق دیکھئے! جس دن ہم نے ملک مقبول احمد کی تصنیف ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں منشایاد مرحوم کے متعلق لکھے گئے مضمون کا رات پونے بارہ بجے مطالعہ کیا، اُسی رات منشایاد اس جہان رنگ و بو کو ویران کر گئے۔ دوسرے دن شام کو اُستاد محترم پروفیسر ملک ایس اے یوسف کے ہمراہ فاضل عربی پروفیسر غازی علم الدین (جن کا تعلق پنجاب کے ضلع قصور سے ہے) کے دولت کدہ واقع سیکٹر F/1 میر پور میں جانا ہوا، وہیں غازی صاحب نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ آج رات منشایاد ملک عدم سدھار

گئے ہیں۔ اِناللہ وانا الیہ راجعون اللہ تبارک وتعالیٰ کی اُن پر کروڑوں رحمتیں ہوں۔

ملک صاحب کی تصانیف کا اگر غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے ہمارے سمیت ہر قاری یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ ملک صاحب واقعی رابطوں کے بہت بڑے سفیر ہیں۔ ملک صاحب کا ایک اور انوکھا عشق بھی ہے کہ ملک صاحب نصف صدی گزرنے کے باوجود اپنے ادبی رسالہ ''چودھویں صدی'' کی یاد اپنے دل سے محو نہیں کر سکے۔ ''چودھویں صدی'' سے ان کی محبت ان کے حقیقی بچوں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

ہم ملک صاحب کو علم وادب کی گراں قدر خدمت کرنے پر خراج تحسین اور ان کی عظمت کو سلام پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تا ابد قائم ودوائم رکھے اور ان کی شفقت اور پیار ہمیں نصیب ہوتا رہے۔ آمین ثم آمین

روزنامہ ''اپنا دیس'' میرپور

۳۰ نومبر ۲۰۱۱ء

روزنامہ ''رہبر'' مظفر آباد

۳۰ نومبر ۲۰۱۱ء

............☆☆............

میاں محمد ابراہیم طاہر

205/H، ماڈل ٹاؤن لاہور

موبائل: 0300-4154083

50 نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد صاحب نے جب سے اپنی اور سرگذشتِ حیات ''سفر جاری ہے'' پیش کی، ادبی دُنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کی مقبولیت نے ''پذیرائی'' کو جنم دیا۔ پھر ''اہلِ قلم کے خطوط''، ''ارمغانِ غزل''، ''گمشدہ افسانے''، جیسی معرکتہ الآراء کتب تولد ہوئیں۔ اب تو ملک صاحب سب مقبول ادیبوں، شاعروں اور لکھاریوں کو پچھاڑتے ہوئے اکیلے ہی ادبی اکھاڑے میں دندناتے اور کشتوں کے پشتے لگاتے نظر آ رہے ہیں۔

ملک صاحب کی تازہ ترین ادبی تخلیق ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' حضرت علامہ عبدالستار عاصم صاحب کے توسط سے نظر نواز ہوئی تو نظروں کے سامنے ادبی دُنیا کے ستاروں کی ایک کہکشاں روشن ہوگئی۔ ہر معزز شخصیت کا تذکرہ اتنا پُرلطف، دلپذیر اور دلچسپ ہے کہ کتاب ابتداء سے انتہا تک پڑھے بغیر ہاتھ سے چھوڑنے کو دل ہی نہیں مانا۔ شخصی خاکوں کو افسانوں سے زیادہ دلچسپ انداز میں پیش کرنا صرف ملک مقبول احمد صاحب کا ہی حصہ ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

اس کتاب میں ملک صاحب اپنے فنِ تحریر کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریر میں نہ صرف مٹھاس ہے۔ بلکہ کھٹی میٹھی چاشنی بھی ہے۔ کتاب کی کتابت (کمپوزنگ) جلد بندی اور کاغذ کی اعلیٰ و عمدہ کوالٹی ملک صاحب کے اعلیٰ وارفع ذوق ادب کی عمدہ نمائندگی کرتی ہے۔ کیوں نہ ہو، ان کا اشاعتی ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' پہلے ہی اشاعتی دُنیا کی بلندیوں پر فائز ہے۔

مجھے اُمید واثق ہے کہ ملک صاحب کی دیگر کتب کی طرح یہ کتاب بھی مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرے گی۔

☆☆☆

انوار قمر

50 نامور ادبی شخصیات

خیر کی ترویج واشاعت کو جناب ملک مقبول احمد نے مقصد حیات بنا رکھا ہے۔ یہ کام ان کا پبلشنگ ہاؤس (مقبول اکیڈمی) بھی انجام دے رہا ہے اور وہ خود بھی خامہ فرسائی سے ذہنوں کو منور کرنے کا مشن سنبھالے ہوئے ہیں۔ قارئین کی نذر ''اہل قلم کے خطوط'' کریں یا خودنوشت ''سفر جاری ہے'' ان کا مطمعٔ نظر خیر ہی کو عام کرنا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک دوسری قلمی کاوش ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' منصۂ شہود پر آئی ہے۔ کتاب کیا ہے۔ یوں سمجھئے زندگی کے تاریک راستوں پر ایک ننھا سا دیا روشن کر دیا ہے۔ ممکن ہے آپ سوچیں ایسے گھور اندھیروں میں دیئے کی بھلا کیا حیثیت اس کا جواب مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں یہ ہے کہ جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو تو ایسے تیرہ و تار ماحول میں ایک دیا سلائی بھی جلوۂ طور سے کم نہیں ہوتی۔

ملک صاحب کی خوش بختی دیکھئے کہ ان کی زندگی کتابوں اور لکھاریوں کے درمیان گزری ہے۔ ایسے ہی پچاس چہروں کے انہوں نے دلآویز خاکے رقم کیے ہیں۔ ایک اعتبار سے ان کی یہ ممدوح شخصیتیں نیکی، شرافت، علم، دوستی، جہد مسلسل اور ایمان و یقین کے تابناک استعارے ہیں۔ فاضل مصنف نے شخصیات کے پردے میں دراصل ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے جو کسی بھی زوال پذیر معاشرے کو ترفع بخش سکتی

ہیں۔ تمام خاکے الف بائی ترتیب کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ پہلا خاکہ حضرت احسان دانش کے بارے میں ہے۔ علم وادب سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ انہوں نے کس طرح افلاس کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چل کر زندگی بتائی تھی۔ ملک صاحب نے ان کے کوائف حیات پیش کر کے درحقیقت نئی نسلوں کو جو صحت بخش پیغام دیا ہے وہ انہی کے ایک شعر میں یوں ملتا ہے:

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

ملک صاحب نے جن شخصیتوں کے ذکر سے کتاب کی معنوی اور صوری آرائش کا اہتمام کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا تعلق صحافت سے ہے۔ جیسے علی سفیان آفاقی، مجیب الرحمٰن شامی، جمیل اطہر، اظہر جاوید، ڈاکٹر مسکین علی حجازی، حمید اختر، محمد آصف بھلی، سعید بدر وغیرہ۔ بعض ادبی مذاق کے لوگ ہیں۔ جیسے غلام الثقلین نقوی، میرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا، سیّد قاسم محمود، عبدالعزیز خالد، رحمٰن مذنب، مولانا حامد علی خان، ابوالامتیاز، ع۔س مسلم، ڈاکٹر انور سدید، اے حمید وغیرہ۔ بعض تعلیمی دنیا سے متعلق ہیں۔ جیسے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر تنویر حسین، ڈاکٹر اختر شمار، حفیظ تائب، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، پروفیسر نذیر احمد تشنہ وغیرہ۔ ان دو دائروں سے باہر کے لوگوں میں ڈاکٹر صفدر محمود، ناصر نقوی، عبدالستار عاصم اور ستار طاہر شامل ہیں۔

ان میں اکثر کے ساتھ ملک صاحب کا بطور پبلشر تعلق رہا۔ آج کے دور میں یہ بڑا ہی نازک تعلق ہے۔ ہماری معلومات کی حد تک ملک صاحب اس تعلق کے آداب سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کی خوش معاملگی ہی نے ان کو لکھاریوں سے بہت نزدیک کر دیا۔

مصنف نے مدیر روزنامہ ''پاکستان'' مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے صحافت میں

شاندار کردار کو جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں شک بھی کیا ہے کہ جب جمہوریت کے نام پر آمریت قائم ہوئی اور قومی ادارے زلزلوں کی زد میں آنے لگے تو شامی صاحب نے نہایت پامردی کے ساتھ حکمرانوں کو ٹوکا اور اس کی پاداش میں کئی طرح کے شدائد بھی برداشت کیے۔ ملک مقبول احمد صاحب کو حضرت حفیظ تائب کے دوسرے نعتیہ مجموعے ''وسلموا تسلیما'' چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کے تائب صاحب سے بہت محبت آمیز تعلقات تھے۔ اس کا ذکر خود حفیظ صاحب نے ہمارے سامنے بھی کئی دفعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک صاحب کے اس خاکے کا لفظ لفظ گہری محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ البتہ ملک صاحب سے ایک بھول ہوگئی جس کی وضاحت ضروری ہے۔ انہوں نے لکھا کہ حفیظ تائب صاحب نے ''یوسف زلیخا'' قصے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی لیکن ازراہ انکسار نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حفیظ صاحب نے تحقیقی کام کرنے کے لیے مذکورہ بالا عنوان ہی پنجاب یونیورسٹی میں رجسٹر کروایا تھا لیکن مصروفیات کے باعث وہ یہ کام نہ کر سکے۔ بالآخر ایک دن گوجرانوالہ ایجوکیشن بورڈ کے سابق اسسٹنٹ سیکرٹری جناب حفیظ احمد باجوہ ان کی خدمت میں یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے کہ اگر آپ یہ کام کرنے کا اب ارادہ نہیں رکھتے تو مجھے اجازت دی جائے۔ حفیظ تائب صاحب نے نہ صرف درخواست پر دستخط کیے۔ بلکہ جو ممکن ہوا اُن کی معاونت بھی فرمائی۔

حفیظ تائب پہلے پہل نعت، کے موضوع پر کام کرنا چاہتے تھے لیکن بقول ان کے شریف کنجاہی مرحوم نے انہیں اس کے بجائے کوئی اور موضوع اختیار کرنے کو کہا۔ دراصل اس دور میں ہمارے اہل ادب نعت نگاری کو ابھی ادب کا حصہ ہی تصور نہیں کرتے تھے۔ حفیظ صاحب نے نیازمندی کے جذبے کے تحت شریف کنجاہی صاحب کی بات مان لی لیکن بعد میں حسرت سے کہا کرتے تھے کہ اگر مجھے یہ موضوع مل جاتا تو ممکن ہے۔ بہت اچھا کام

ہو جاتا۔ چند سال بعد پنجاب یونیورسٹی نے یہ موضوع ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی مرحوم کو سونپا۔ حفیظ صاحب کو یہ کام خود نہ کرنے کا قلق ضرور تھا لیکن یہ ان کی وسعت قلبی کہیئے کہ انھوں نے ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کو مواد کی فراہمی اور مناسب رہنمائی دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ شاید اس کا بڑا سبب ان کی نعت سے بے پایاں محبت تھی۔

محترم ملک مقبول احمد نے پچاس نامور ادبی شخصیتوں پر کتاب لکھ کر علم و ادب کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ ہم نوجوان قلمکار عبدالستار عاصم کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ جن کی معرفت یہ تازہ ادبی کاوش ہم تک پہنچی اور ہم نے اس کے مطالعہ سے لطف اُٹھایا۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

۱۷۔اپریل، ۲۰۱۱ء

☆☆☆

رانا عامر رحمٰن ایڈووکیٹ

چیئرمین رانا فضل الرحمٰن محمود فاؤنڈیشن

"۵۰ نامور ادبی شخصیات"

نقش ہے میرے دل پر نصف صدی کی تاریخ
لوگ پیش کرتے ہیں مجھے حوالوں کے لیے

ملک مقبول احمد کی نئی کتاب "۵۰ نامور ادبی شخصیات" جناب علامہ عبدالستار عاصم کے ذریعے ملی تو خیال آیا کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ قارئین کی نظر سے گزرنا چاہئے۔ اس لیے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ کچھ کتابیں ملک صاحب سے خرید کر دوستوں کو تحفہ میں دوں۔ ایسی کتابیں زندہ معاشروں کی ترجمان اور عکاس ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں بہتا پانی ہی زندگی کے وجود کا پتہ دیتا ہے اور چلتے پانی میں ہی مچھلیاں اور دیگر جانور اپنی افزائش اچھے طریقے سے پاتے ہیں۔ اسی طرح اچھے ادارے بھی معاشرے کے ادیبوں، دانشوروں کی علمی کاوشوں کو معاشرے میں پروان چڑھاتے ہیں۔ اس کتاب میں ایسے صاف ستھرے کردار کے لوگ زیرِ تبصرہ ہیں۔ جن میں ڈاکٹر صفدر محمود، سید قاسم محمود، حمید اختر، حضرت حفیظ تائب، اظہر جاوید جیسے بزرگ دانشور شامل ہیں۔ ان کے شخصی خاکے لکھ کر دیگر پبلشروں کو بھی روشنی دکھائی گئی ہے کہ وہ بھی پبلشنگ کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی لکھیں اور ترتیب دیں اور ویسے بھی ہر پبلشر تقریباً ادیب اور دانشور ہوتا ہے۔ جن معاشروں میں حمید اختر جیسے دانشور موجود ہوں وہ معاشرہ ہمیشہ امن کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ یہ پوری قوم کی بدقسمتی ہے کہ گزشتہ تقریباً 3 دہائیوں سے عالمی سطح سے پاکستانی قوم اور عالمِ اسلام کے

خلاف سازشیں ہورہی ہیں۔ان سازشوں کا پہلا شکار پاکستانی قوم ہے اب تک بم دھماکوں اور ڈراؤن حملوں سے ہزاروں معصوم خواتین، بچے، نوجوان اور بزرگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان ہلاکتوں پر قومی سطح پر سیاسی، مذہبی اور دانشوروں کی قیادت نے باضابطہ طور پر احتجاج نہیں کیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری قوم اس امر پر یکجا ہو جائے کہ ڈرون حملے نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں دانشوروں کو سب سے پہلے آواز بلند کرنی چاہیے۔50 ادیبوں کے علاوہ وطنِ عزیز کے 5 ہزار ادیبوں کو بھی ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو کر ڈراؤن حملوں اور بم دھماکوں کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے تا کہ وطنِ عزیز امن کا گہوارہ بن سکے۔ جب سوسائٹی امن کا گلشن بنتی ہے تو پھر ہی ادب پروان چڑھتا ہے۔ جب ادب ترقی کرتا ہے تو معاشرہ خود بخود ترقی کی سیڑھیاں چڑھ کر ترقی یافتہ معاشروں میں شامل ہو جاتا ہے۔جن میں چین، کوریا، جاپان جیسے ممالک شامل ہیں۔ میں دُعا گو ہوں پاکستان کے تمام دانشور، پبلشرز، کالم نگار، نقاد، صحافی ملک مقبول احمد جیسا کردار ادا کریں تو وہ دن دور نہیں جب وطنِ عزیز ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلیم اختر

محترم ملک مقبول احمد صاحب

جناب عالی

شکریہ، مجھے بھی نامور ادبی شخصیات میں شامل کرنے کا، آپ نے
بہت دلچسپ انداز اور رواں اسلوب میں شخصیات کا تعارف کرایا ہے۔ آپ نے
کسر نفسی سے کام لیا اور انہیں خاکے نہ قرار دیا لیکن ان عزیزوں میں خاکہ نگاری
کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ سادہ اسلوب ذات کا حوالہ، اختصار اور جامعیت
آپ چند فقروں میں شخصیت کا تعارف کرا دیتے ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ مختصر بلکہ
مختصر ترین ہونے کی بناء پر انہیں Mini خاکے قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ کی صحت و سلامتی کی دُعا کے ساتھ۔

☆☆☆

اہل قلم کے خطوط

◆◆

فہرست

...........o...........

روزنامہ ''نوائے وقت''

ڈاکٹر انور سدید

25 اکتوبر 2009ء

اہل قلم کے خطوط

زیرِ نظر کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں ملک کے قریباً ڈیڑھ سو نامور ادیبوں کے وہ خطوط پیش کئے گئے ہیں جو انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ مقبول اکیڈمی کے ڈائریکٹر ملک مقبول احمد کے نام اپنی کتابوں کی اشاعت اور اس سلسلے کے دوسرے امور کے بارے میں لکھے تھے۔ ان ادیبوں میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، عشرت رحمانی، سید ضمیر جعفری، شفیق الرحمان، عبد العزیز خالد، رئیس احمد جعفری، مرزا ادیب، مولانا حامد علی خان، رفیع اللہ شہاب، حاجرہ مسرور، جوگندر پال، بانو قدسیہ، انصار ناصری، ادا جعفری، غلام الثقلین نقوی اور مشفق خواجہ جیسے نامور ادیب شامل ہیں۔ ان خطوط میں مجھے خطوط نگار ادیبوں کے بارے میں کئی نفسیاتی نقطے ملے جن سے مجھے ان کے اندر کے انسان کی نئی جہت دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ ملک صاحب کے پاس ملک کے بہت سے نامور ادیبوں کے خطوط محفوظ ہیں تو میں نے اصرار سے کہا کہ اس خزینے کو منظر عام پر لائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ملک صاحب نے اپنے دوستوں کی اس رائے کا احترام کیا اور زیرِ نظر کتاب شائع کر دی۔ بلاشبہ یہ کتاب معنوی طور پر ناشر اور مصنف کے تعلقات کا آئینہ ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ تمام خطوط کتابوں کے ایک نامور ناشر کو مرکز بنا کر لکھے گئے ہیں اور اشاعتی ضرورت کے باوصف ان سے ناشر کے علاوہ خط نویس کا شخصی کردار بھی سامنے آتا ہے۔

پروفیسر جمیل آذر

874-B سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

ناشر کے نام

جب 2007ء میں ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی تو اَدبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اِس کی شہرت کا ہر طرف ڈنکا بجنے لگا کہ ایک ناشر نے اپنی جیون بیتی لکھی ہے۔ اِس سے پہلے غالباً یہ کام کسی ناشر نے نہیں کیا تھا۔ ملک صاحب نصف صدی سے ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں شائع کرتے رہے تھے۔ اُنہیں یہ کبھی خیال نہ آیا کہ وہ بھی کتاب لکھیں لیکن بھلا ہو ان کے پوتے بابر مقبول کا کہ جس نے دادا ابو کو اپنی داستانِ حیات لکھنے کی ترغیب دی۔ اُن کی نواسی ماریہ کے اصرار نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنی کہانی اپنی زبانی لکھنے میں دیر نہ کریں۔ دوسری نواسی بینا بھی اِس تقاضے میں پیچھے نہ رہی اور بھارتی فلم باغبان کے حوالے سے یاد دہانی کراتی رہی '' آپ کی کتاب باغبان کا کیا بنا'' بالآخر جب کتاب شائع ہوئی تو اَدیبوں اور شاعروں نے اِس کی بے مثال پذیرائی کی اور ملک صاحب کو دل کھول کر داد دی۔ کم وبیش سو ادیبوں نے اپنی آراء دیں اور درجنوں مشہور روزناموں ہفت روزوں اور ماہناموں نے اِس پر گراں قدر تبصرے شائع کئے۔ ملک صاحب نے اِن آراء اور تبصروں کو نہایت قرینے سے اکٹھا کر کے ''پذیرائی'' کے نام سے 2008ء میں شائع کیا۔ پذیرائی کی پذیرائی بھی ویسے ہی ہوئی جیسے ''سفر جاری ہے'' کی ہوئی تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مجھے اُن کی سوانح

عمری پر ایک مکمل کتاب لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی جو ''راہ نورِ دِشوق'' کے نام سے 2008ء میں شائع ہوئی۔

ملک مقبول احمد صاحب کو اہل قلم سے قلبی لگاؤ رہا ہے۔ وہ انہیں قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کی کتابیں عقیدت اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے اشاعتی ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' کی زیرِ نگرانی تزئین و آرائش سے شائع کرتے ہیں۔ سینکڑوں قلم کاروں نے انہیں متعدد خطوط لکھے جو اُن کے حسن سلوک کی وجہ سے کاروباری سطح سے بلند ہو کر دوستی کی روشنی میں لکھے گئے۔

اِن خطوط کو ملک صاحب نے ''اہل قلم کے خطوط'' کے نام سے کتابی شکل میں امسال 2009ء میں شائع کیا ہے۔ یوں اُن کی شخصیت کے حوالے سے اِن تین سالوں میں یہ اُن کی تیسری کتاب ہے۔ گویا یہ اُن کی اَدبی دنیا میں انوکھی ہیٹ ٹرک (Hat Trick) ہے۔ خطوط نگاری پر تاریخی حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر دیباچہ میں رقم طراز ہیں! ''مرزا غالب کے ''عودِ ہندی'' (1868ء) اور اردوئے معلّٰے (1869ء) سے اردو میں بھی خطوط کی اشاعت کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ تقریباً سبھی قابل ذکر ادبی شخصیات کے خطوط چھپ کر حوالہ کی چیز ثابت ہو رہے ہیں۔ مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو کسی ناشر کے نام ''اہل قلم کے خطوط'' کی اشاعت تو یہ کام پہلی مرتبہ ہوا ہے۔'' اِن خطوط کو پڑھنے سے نہ صرف ملک مقبول احمد کی بھرپور شخصیت کا ادراک ہوتا ہے بلکہ ادیبوں کی نفسیات، اُن کی دسترس سے باہر للچائی خواہشات (Tantalizing desires) اور اُن کی حسن طلب کے انداز کا بھی پتا چلتا ہے۔ حسنِ طلب کے اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

''اہل قلم کے خطوط'' کا مطالعہ دلچسپ ہے کہ اہل قلم نے ایک ناشر کو کس انداز اور کس

اسلوب کے خطوط لکھے کیسے دل کی بات کہی، حسنِ طلب کے کیا کنایئے تھے۔ کیسے ستائش کی اور کس طرح گلہ کیا۔ بعض خطوط طویل ہیں اور بعض مختصر ترین ہیں۔ ہر انداز اور اسلوب میں تحریر کردہ یہ خطوط بالواسطہ طور پر ملک مقبول احمد صاحب کے پورٹریٹ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔'' اِن خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حرفِ آخر میں ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں: ''بلاشبہ یہ خطوط نجی نوعیت کے ہیں اور اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے گئے لیکن ان کو ضابطہء تحریر میں لانے والے ملک کے نامور ادیب اور مشاہیر اہلِ قلم ہیں۔ اِس لیے ان خطوط کی اَدبی اہمیت مسلّمہ ہے۔''

ملک صاحب کی جس خوبی کا انکشاف مجھ پر اِس کتاب کو پڑھ کر ہوا وہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل قلم دوستوں کے خطوط اِس طرح سنبھال کر اور حفاظت سے رکھے جیسے وہ کوئی آسمانی صحائف ہوں۔ میری اُن سے دوستی، محبت اور عقیدت کا رشتہ اپریل 2007ء سے شروع ہوا جب اُن کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' میرے مطالعہ میں آئی اور اس پر اپنے خیالات ضبطِ تحریر میں لایا۔ ان دو تین سالوں میں، میں نے انہیں کتنے خطوط لکھے اور اُن میں کیا لکھتا رہا مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میری بہت ساری بری عادات میں ایک بری عادت یہ ہے کہ نہ تو میں اپنے خط کی کوئی نقل رکھتا ہوں اور نہ ہی کسی دوست کے خط کو محفوظ کرتا ہوں۔ یہ میری ناقابل اصلاح عادت ہے۔ جب میں نے ''اہل قلم کے خطوط'' میں اپنے سترہ (17) خطوط دیکھے اور پڑھے تو خوشگوار حیرت ہوئی کہ میں نے اتنے سارے خط ملک صاحب کو کب اور کس طرح لکھ ڈالے اور ابھی تو بقول اُن کے کچھ خط اور بھی ہیں جو انہوں نے اِس کتاب میں شامل نہیں کیے۔ میں حتیٰ الوسع کوشش کرتا ہوں کہ اپنی بیماری کا کسی سے ذکر نہ کروں اور ڈاکٹروں اور ہسپتالوں سے تو مجھے ویسے ہی وحشت ہوتی ہے۔ ملک مقبول صاحب جہاں غیر رسمی مقبول اکیڈمی کے میری

نظر میں وائس چانسلر ہیں وہاں وہ غیر رسمی فزیشن بھی ہیں اور روحانی طور پر وہ آنجہانی جرمن ڈاکٹر لوئی کوہنی کے شاگردِ رشید ہیں۔ میں نے جب پانی کے ذریعہ طریقہ علاج ملک مقبول صاحب کی زبانی اُن کی آپ بیتی میں پڑھا تو میرا تجسس بڑھا اور اُن کے کہنے کے مطابق عمل کیا تو اِس علاج کو حیرت انگیز طور پر موثر پایا۔ ملک صاحب نے میرے وہ خط بھی اہل قلم کے خطوط میں شامل کر دیئے۔ یہ اگرچہ نجی خطوط تھے لیکن اِن میں خیر کا پہلو بھی ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ ہم جب روحانی طور پر بیمار ہو جاتے ہیں تو پھر ہم جسمانی طور پر بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ پانی کا طریقہ علاج روحانی علاج ہے۔ ملک صاحب نے یہ طریقہ علاج نہ صرف خود آزمایا بلکہ متعدد دوستوں کا موثر علاج بھی کیا۔ اور ڈھیروں دعائیں لیں۔ بہرکیف اپنے خطوط کو کتاب میں طبع شدہ صورت میں پڑھ کر ایک روحانی خوشی ملی۔ اہل قلم دوستوں کے خطوط کو جس حفاظت اور احتیاط کے ساتھ انہوں نے اپنے پاس رکھا اور جس قرینے سے انہیں زیورِ طبع سے آراستہ کیا اِس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک منظم شخصیت (Disciplined personality) کے مالک ہیں۔ اُن کی طبیعت میں عمدہ نظم وضبط، احتیاط اور سلیقہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

اِن خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ملک صاحب ایک نہایت قابلِ اعتماد شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی امانت، دیانت اور صداقت کی تمام اہل قلم نے تعریف کی ہے۔ کسی ناشر کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ملک صاحب ادیبوں کو معاوضہ دینے میں ہمیشہ فراخ دل رہے ہیں اور اکثر ادیبوں کو رقم پیشگی ادا کر دیا کرتے تھے جس کا انہیں خاصا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا مگر یہ اُن کی عظمت ہے کہ انہوں نے نہ تو اُن ادیبوں کا کہیں نام لیا اور نہ اُن سے کوئی شکوہ کیا اِس کے برعکس انہوں نے انہیں دعائیں دیں جب کہ عام ناشرین کا عالم یہ ہے کہ وہ ادیبوں کو معاوضہ بھی کم دیتے ہیں اور اُن کی

تذلیل بھی کرتے ہیں۔ اِس پس منظر میں پروفیسر عنبرین تبسم شاکر مقبول احمد صاحب کو اِس طرح خط لکھتی ہیں: ""اگرچہ آپ کی سوانح حیات بہت مختصر ہے لیکن ہر لکھنے والے نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آپ کاروباری اور سماجی معاملات میں ایک سچے اور کھرے انسان ہیں اور یہی آپ کی نیک نامی کی بنیادی وجہ ہے۔ آپ نے جس ادیب اور شاعر سے جو بھی کاروباری معاہدہ کیا اس کی پوری طرح پاسداری کی۔ میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر کروں گی کہ ہمارے ملک کے ایک مایہ ناز شاعر یوسف ظفر کو ایک ناشر نے محض اس لیے دھکا دے کر سیڑھیوں سے گرادیا تھا کہ انہوں نے اس ناشر سے اپنی کتاب کا معاوضہ طلب کیا تھا۔ جب کہ آپ کے بارے میں ہر ادیب اور شاعر نے یہی بات کی ہے کہ آپ امانت، دیانت اور صداقت کے پیکر ہیں۔"

کتاب میں شامل مکاتیب سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب ایک ناشر کے پیکر سے نکل کر ادیب کے پیکر میں ڈھل گئے تمام ادیبوں نے آپ کے سر پر ادب کی دستارِ فضیلت سجادی۔ محترم اے حمید صاحب انہیں اِس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں: "واہ! کیا کتاب لکھی ہے آپ نے! اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ پھر میں کیا لکھوں گا تو میں آپ سے ضرور کہتا کہ اس طرح کی ایک آپ بیتی میری بھی لکھ دیجیے...... "سفر جاری ہے" اس اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ آج تک بڑے بڑے ناشروں نے دوسروں کی کتابیں چھاپی ہیں لیکن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اپنی کتاب لکھ کر کبھی کسی نے نہیں چھاپی۔ یہ کام آپ نے کر دکھایا ہے۔" "اہل قلم کے خطوط" ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اِس کا حرف آخر ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے۔ اپنے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں: "خوشی ہوئی کہ ہر ادیب نے آپ کے طرزِ عمل اور ناشرانہ کردار کی داد دی۔ اِس کتاب کا ایک دلچسپ باب "وکھرے ٹائپ کے لوگ" ہے۔ اس باب میں

جگ بیتی نمایاں ہے۔ آپ نے کسی شخص کا نام نہیں لیا۔ اس لیے مجھے ان لوگوں کو پہچاننے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔ اگر نامناسب نہ ہو تو اُن کے نام مجھے میرے کان میں بتا دیں۔ بالخصوص میں ''ایک نامور سکالر''...... ''ایک معزز ناول نگار''...... اور ''انوکھی ناراضی'' کے کرداروں سے تعارف کا خواہش مند ہوں۔'' اپنے اِسی خط میں ڈاکٹر انور سدید ملک صاحب سے اپنی دوستی کے آغاز کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں:

''میں اظہر جاوید کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے آپ سے تعارف کرایا تھا جو اب دوستی میں تبدیل ہو گیا ہے۔''

محترم اظہر جاوید صاحب تخلیق کے مدیر ہیں۔ گذشتہ چالیس سالوں سے وقیع ادبی ماہنامہ نکال رہے ہیں۔ مالی دشواریوں کے باوجود جس باقاعدگی سے وہ یہ پرچہ شائع کر رہے ہیں یہ انہیں کا حوصلہ ہے۔ ملک مقبول احمد صاحب جب کسی سے دوستی کرتے ہیں تو پکی کرتے ہیں اس میں خلوص، محبت اور سخاوت کی خوشبو ہوتی ہے۔ اظہر جاوید صاحب اُن کی محبت اور کرم فرمائی کا اِس طرح اظہار کرتے ہیں: ''ایک چیز ہوتی ہے دوستی، ایک کرم فرمائی۔ آپ مسلسل دوسرا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دوستی بھی برحق۔ لیکن آپ احسان بھی کرتے رہتے ہیں۔ خداوند کریم آپ کو مزید برکتیں اور نعمتیں دے تاکہ آپ اور زیادہ ''تخلیق'' کی سرپرستی کر سکیں۔''

ملک صاحب کی ایمانداری کا ذکر ہر ادیب نے کیا۔ دیکھئے اختر جمال کس عقیدت سے اُن کی ایمانداری (Honesty) کا ذکر کرتی ہیں: ''...... مجھے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ آپ نے میری کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں دلچسپی لی اور ایک بہت اچھا انتظام کرایا۔ اس سے پہلے ''ایماندار ناشر'' کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہ تھا اور ایک ناشر نے تو مجھے اتنا تنگ کیا تھا کہ میرا کتابت شدہ ایک مجموعہ سنہ 81ء سے

اُن کے قبضہ میں ہے۔ طفیل بھائی بھی وہ مجموعہ اُن کے قبضہ سے نکلوانے کی کوشش کر کے ہار گئے تھے۔'' یہ خط اختر جمال نے ملک صاحب کو 3 جون 1988ء کو لکھا تھا۔

اِن خطوط میں ادیبوں کی نفسیات کا بخوبی پتا چلتا ہے۔ اُن کے اندر اپنی کتابوں کی اشاعت کی بے پناہ خواہش اور اس کے ساتھ ہی پیسہ کمانے اور نامور بننے کی تمنا۔ بعض ادباء نے ایسے خطوط بھی لکھے جو ان کی انا پرستی پر دال ہیں۔ خودستائش اور انا پرستی (EGOTISM) کی ایک مثال ہمیں جناب غلام احمد حریری کے خط سے ملتی ہے۔ اُن کے خط کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجئے'' جواب اوّلین فرصت میں دیجئے اور یہ سمجھ کر کہ میں ارزاں قسم کا مصنف و مترجم نہیں ہوں تاکہ مراسلت میں وقت ضائع نہ ہو۔ ممکن ہے یہی کتاب آئندہ تعلقات استوار کرنے کا زینہ ثابت ہو۔''

یہ کتاب ادیبوں کے دلچسپ خطوط ہی نہیں بلکہ ہر ادیب کی اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جو اُن کی کتابوں اور مسودوں کے گرد گھومتی ہیں۔ کہیں شکوے اور شکائتیں ہیں، کہیں جذباتِ تشکر ہیں، کہیں خوشیوں اور مسرتوں کا اظہار ہے، کہیں مالی تنگ دستی کا رونا ہے، یہ حساس دل کے مالک ادیبوں کے خطوط ہیں جو چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے سرشار ہو جاتے ہیں اور ذرا سے غم سے نڈھال۔ یہ علم و ادب کی کائنات میں بستے ہیں ان کے مالی وسائل محدود ہیں۔ یہ رزقِ حلال کمانے والے لوگ ہیں، ان کے کوئی لمبے چوڑے بینک بیلنس نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اَدب و ثقافت اور تہذیب و تمدن کی شمعیں جلاتے ہیں اور ہمیں زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ ملک مقبول احمد صاحب نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا کہ انہوں نے یہ دلپذیر خطوط شائع کر کے ہمیں اُن کے ملفوظات پڑھنے کا موقع عطا کیا۔ یقیناً یہ خطوط نوجوان نسل کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گے۔
جن ممتاز اہل قلم کے خطوط اِس کتاب میں شامل ہیں اُن میں ڈاکٹر وحید قریشی،

ڈاکٹر وزیر آغا ابوالامتیاز ع۔س مسلم ، ادا جعفری ، اظہر جاوید ، امین راحت چغتائی ،
ڈاکٹر انور سدید، انیس ناگی ، اے حمید، بانو قدسیہ، پرتو روہیلہ ، پروین طارق ، جان کاشمیری،
جوگندر پال حاجرہ مسرور، حامد علی خان ، رشید نثار ، رئیس احمد جعفری، شفیع ہمدم ،شاہد علی خان ،
ڈاکٹر سلیم اختر، شفیق الرحمٰن، شہزاد منظر، صائمہ نورین بخاری، ضمیر جعفری، عبدالعزیز خالد ،
عذرا اصغر، علی سفیان آفاقی ، غلام الثقلین نقوی ،سید قاسم محمود، قمر نقوی نقشبندی، مشفق خواجہ
منشا یاد، رشید امجد اور ڈاکٹر کیول دھیر قابل ذکر ہیں۔ مجھے امید ہے ملک مقبول احمد کی یہ
مرتب کردہ کتاب اربابِ علم وادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جائے گی۔

ماہنامہ ''نوازش'' لاہور

جون 2010ء

☆......☆......☆

اہل قلم کے خطوط

567 صفحات پر مشتمل، ہارڈ کور (مجلد) کتاب، بہترین، نفیس کمپوزنگ، ذوق آمیز سیٹنگ (Setting) اور طباعت و نفاست کا منہ بولتا ثبوت اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ سادہ، خوبصورت اور دل کش ٹائٹل (Title) پر پر کا قلم، بند (کاک لگی) دوات، ایک مختصر (خط کا) پرزہ اور عقب سے جھانکتے ہوئے مؤلف موصوف کا نصف چہرہ ٹائٹل کو ''باغ و بہار'' بنا رہا ہے۔ بیک ٹائٹل پر دو ماہرین تبصرہ تنقید اور ماہرین کتب و کتابی مواد اور پارکھ علم و فن ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید کے اقتباسات نظری و توصیفی کتاب کی زینت کو بڑھا رہے ہیں۔

ملک مقبول احمد صاحب مؤلف کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' نے ایک سوانح حیات کیا لکھی کہ وہ کتب کثیرہ و وقیعہ کی طباعت کا باعث بن گئی چراغ سے چراغ جلنا اور مہمیزی کارنامہ اسی کو کہتے ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' (خودنوشت ملک مقبول احمد) کے جواب میں تبصرے موصول ہوئے تو ''پذیرائی'' کی شکل میں محفوظ ہو گئے۔ رسیدی خطوط توصیفی کلمات اور اصلاحی تنقیدات موصول ہوئیں تو ''اہل قلم کے خطوط'' کی شکل میں طبع ہوئے پروفیسر جمیل آذر صاحب نے تو کمال کر دیا ''سفر جاری ہے'' پر کیا تبصرہ کیا خود اپنی خودنوشت کے موتی بھی بکھیرتے چلے گئے اور آج یہ تبصرہ نما خودنوشت ''راہ نوردِ شوق'' بن کر طاقوں میں سج گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں ''محبت کے کرشمے''۔ ملک صاحب کی ''سفر

جاری ہے،" پر تبصروں کی ایک اور کتاب (شائد) "شناسائی" کے نام سے جلد منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔ شائد کسی دن "محبت کے کرشمے" بھی کتاب کی شکل اختیار کر لے۔

ہم نے تو یہی دیکھا، سنا اور مطالعہ کیا ہے کہ کتاب کی پیش لفظ یا دیباچہ ہوتا ہے جو عموماً مؤلف یا مصنف کے علاوہ کوئی دوسرا ماہر صاحب علم و اہل فن تحریر کرتا ہے مگر "اہل قلم کے خطوط" کا حرف اوّل کے ساتھ ساتھ "حرف آخر" بھی تحریر کیا گیا ہے۔ حرف اوّل کے نگار ڈاکٹر سلیم اختر صاحب ہیں اور حرف آخر کے قلمکار ڈاکٹر انور سدید صاحب ہیں۔ ان دونوں شخصیات کا ایک علمی مقام ہے اور ایک معتبر نام ہے۔

133 شخصیات کے خطوط کو "اہل قلم کے خطوط" کے مرقع میں شامل کیا گیا ہے۔ اس صف میں پہلی جگہ پانے والے محمد آصف بھلّی صاحب ہیں۔ آپ کی تحریریں (چوتھا ستون) اور ایڈیٹر کے نام خطوط روزنامہ نوائے وقت لاہور میں نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔ اہل قلم کے مکتوب نگاروں میں پندرہ (۱۵) خواتین ہیں اور باقی مرد حضرات! گویا دونوں انسانی صنفوں نے اپنی قلمکاری کے جوہر دکھائے ہیں اور ان کی تحریروں سے فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کو مزین کیا ہے۔ میں نے بڑی جُستجو کی، باریک بینی سے ڈھونڈا، میگنی فائنگ (Magnifying) گلاس سے بھی دیکھا مگر مجھے شبیر احمد میواتی ملک صاحب کے دوستوں کی فہرست میں کہیں نظر نہ آئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ "اہل قلم کے خطوط" میرے دوستوں سے خالی ہے۔ کئی نام ایسے ہیں جو مجھے جانتے ہوں گے اور کئی حضرات ایسے ہیں جن کے ساتھ تعلق کا مجھے دعویٰ ہے۔

ان تمام حضرات میں اہل علم بھی ہیں اور اہل ادب بھی، صاحب شوق بھی ہیں اور یاروں کے یار بھی، ماہرین بھی ہیں اور ناقدین بھی، مبصرین بھی ہیں اور قلمکار بھی، مؤرخین بھی ہیں اور محققین بھی، اپنی ذات میں انجمن بھی ہیں اور استاذ الاساتذہ بھی، غرض

یہ نجوم وکواکب کی ایک کہکشاں ہے جسے ملک مقبول احمد صاحب نے ''اہل قلم کے خطوط'' میں لا سجایا ہے۔ کسی تحفے یعنی کتاب کی وصولی کی محض رسید دنیا بھی کردار کی علامت ہے اوران ذکورواناث میں سے کوئی بھی کردار کی اس خوبی سے محروم نہیں ہے۔ کسی کی کارکردگی کو سراہنا، بڑے ہونے کی علامت ہے اس بڑائی سے ان میں سے کوئی بھی خالی نہیں ہے۔ احسانات کا ذکر کرنا انسانیت ہے ملک صاحب کی نرم گوئی، دریا دلی، علم پروری اور یار باشی کے سے ''احسانات'' کو گنوانے والے یا مہربانیوں کی طرف اشارہ کرنے والے یقیناً بڑے کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ یہ خوبیاں ان حضرات کی مہارت وفنکاری پر مستزاد ہیں۔

حرف اوّل میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے اپنے رشحات واحساسات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اختر جمال، ادا جعفری، افتخار امام صدیقی، ستار طاہر، سید ضمیر جعفری، ظفر تاج، محشر بدایونی، مشفق خواجہ اور مرزا ادیب کے خطوط سے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں لہٰذا حرف اوّل، اَدب آئینہ ادب، کا نشان بن گیا ہے۔

☆ ملک صاحب ایک دو نہیں، دس بیس نہیں، پچاس سو نہیں بلکہ دو اڑھائی سو کتابوں کے تحفہ سے نواز سکتے ہیں۔ جسے یقین نہ آئے۔ جناب محمد آصف بھلّی کے مکتوب صفحہ ۱۹ کی سطر ۳ پڑھ کر دیکھے۔ کوئی ایسا دریادل پبلشر؟

☆ نیا علم شفا بخشی یا پانی کا علاج (Hydrotherapy) کے حوالے سے ملک مقبول احمد صاحب ایک جیّد حکیم (Specialist) ہیں۔ اسی نام سے آپ نے مقبول اکیڈمی سے جرمنی کے ڈاکٹر لوئی کوہنی کی کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع کیا ہے اور تقریباً پانی سے ہر مرض اور عارضہ کے علاج کے لئے آپ بہترین حکیم ومشیر ہیں۔ انیس یعقوب اور ڈاکٹر انور سدید کے خطوط میں اس کا مفصل تذکرہ پڑھا جاسکتا ہے۔

☆ راولپنڈی کے پروفیسر جمیل آذر صاحب نے ملک مقبول احمد صاحب کو حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی، گیارہویں والے پیر کی دعا کا عملی نمونہ قرار دیا ہے۔

وہ دعا یہ ہے۔

''بارِالہا! حُسنِ سخا اور حُسنِ عطا تیری صفتیں ہیں۔
اور ہم تیرے غلام ہیں۔
پس اس میں سے کچھ ہم کو بھی عطا فرما دے
کہ سخی بن کر دنیا کو لُٹا دیں''

سبحان اللہ! کیا نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے ملک صاحب کے داد ودہش کا!

☆ صفحہ ۱۸۰ پر حضرت مولانا علی کرم اللہ وجہہ کا قول غلط کمپوز ہو گیا ہے۔ درست اس طرح ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

(Who knows himself, he knows his lord)

☆ مجھے تو پچھلے آٹھ دس سال کے مسلسل تقاضوں کے باوجود سعید بدر صاحب نے روزنامہ ''امروز'' لاہور کے ۱۹۷۴ء کے ''ختم رسالت ﷺ نمبر'' کی نقل نہیں دی ہے مگر ملک مقبول احمد صاحب کو ''سفر جاری ہے'' لکھنے پر ''نوبل پرائز'' ملنے کی تمنا کر رہے ہیں۔ ملک صاحب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں، کچھ صدقہ کر دیں۔ نظر بد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ سعید بدر صاحب! کیا یہ مصرعہ آپ کو اپیل (Appeal) کرتا ہے۔

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

☆ ملک مقبول احمد صاحب عامل کامل بھی ہیں اور دوسروں کو اس قرآنی وظیفہ کی

اجازت بھی دیتے ہیں۔

کثرت ورد: لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّی كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

درمیان میں کہیں کہیں یہ پڑھیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیۤ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَ رَحْمَتِكَ
حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ امن وسکینت عطا ہوگی اور زیارت رسول مقبول
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ملک صاحب کو یہ فضیلت حاصل ہو چکی ہے۔
(صفحہ ۲۶۸۔۲۶۷) صفحہ ۔ ۳۱۱،

☆ ڈاکٹر علی محمد خان نے خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں یوں لکھا ہے۔
مجھے آپ کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' بہت پسند آئی اور بلا تامل علامہ اقبالؒ
کا یہ مصرعہ ذہن میں آیا۔

انہی کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

واقعی آپ عزم وتقلید کی قابل تقلید مثال ہیں۔ مصاف زندگی میں ایسی عمدہ
مثال بننا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ڈپٹی نذیر احمد اپنے شاگردوں کو بڑے زعم میں
آکر بتایا کرتے تھے کہ

I am a self made man.

یہی جملہ آپ پر بھی صادق آتا ہے۔ (''سفر جاری ہے'' سے یہی مترشح ہوتا ہے)

☆ دو شخصیات نے کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں اپنی بے بضاعتی ظاہر کی ہے
اور ملک صاحب سے ان ڈائرکٹ اور فی سبیل اللہ کتب طلب فرمائی ہیں۔ کیا
خوبصورت مثال دی ہے۔ ''پھلدار درخت کے قریب سے گزرنے والا ہر شخص
پھل کو للچا کے دیکھتا ہے بیروں سے لدی بیری پر راہ گیر ہاتھ ڈالنے کی کوشش
کرتا ہے۔'' (صفحہ ۳۵۳)

یعنی ملک مقبول احمد صاحب پھلدار درخت اور بیروں سے لدی بیری ہیں اور ہم
سب علماء، ادبا ان کے پھلوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

☆ قمر نقوی نقشبند ملک مقبول احمد کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ (صفحہ ۴۰۸)
''آپ روزانہ سو بار لاحول والا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھا کریں
تاکہ شر و فساد سے محفوظ رہیں۔''

☆ کلیم اختر صاحب اپنی ایک مزاحیہ تصنیف کے کئی نام تجویز کر کے ملک مقبول احمد صاحب کی خواہش کو قول فیصل مانتے ہیں۔ کاروان ظرافت۔ روح ظرافت۔ قصر ظرافت انگ ظرافت۔ جہانِ ظرافت۔ اردو طنز و مزاح...... عہد بعہد اکبر الہٰ آبادی سے نیاز میواتی تک۔ چند مزاح نگار (شخصیت و فن)
مجھ سے پوچھیں تو میں ان ناموں پر یہ اضافہ کر سکتا ہوں۔ ظریف و ظرافت، مجالس ظرافت، محافل ظرافت، مکالمات ظرافت محادثات ظرافت، لطافت و ظرافت، زعمائے ظرافت، مزاح و ظرافت، ظرافت و ظرافت وغیرہ وغیرہ۔

☆ جناب علامہ عبد الستار عاصم صاحب میرے عزیز دوست صادق علی زاہد ننکانوی کے دوست ہیں لہٰذا صادق کے محبّ صادق میرے بھی محبت صادق ہوئے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کنول عاصم نے ملک مقبول احمد کی شخصیت کو چند سطروں میں بیان کر دیا ہے فرماتی ہیں۔ ''آپ بیک وقت پبلشر، ادیب، صوفی، جوہر شناس اور علم دوست ہیں کہ آپ علمی و ادبی شخصیت ہیں۔'' (صفحہ ۴۲۹)

☆ عنبرین تبسم شاکر صاحبہ نے اپنے مکتوب میں یہ افسوسناک خبر سنائی کہ
ہمارے ملک کے ایک مایہ ناز شاعر یوسف ظفر کو ایک ناشر نے محض اس لئے سیڑھیوں سے دھکا دے کر گرا دیا تھا کہ انہوں نے اس ناشر سے اپنی کتاب کا معاوضہ طلب کیا تھا۔ (صفحہ ۴۴۵) یہ بھی ہوتا ہے پبلشرز کا کردار،

☆ میرزا ادیب نے اپنے ناشر کا ایک شکوہ کیا ہے جو اس طرح ہے۔
ایک بات کی مجھے سخت شکایت ہے ایک ظالم شخص تلمیذ میرے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک کر رہا ہے میری دو کتابوں کے آخری ایڈیشن کو دس برس ہو گئے ہیں کوئی اخلاقی و

قانونی جواز ایسا نہیں ہے کہ اسے ایک مصنف کے ساتھ ایسا ظلم کرنے کی اجازت دے۔

(صفحہ ۵۱۱) یہ بھی ہوتا ہے پبلشرز کا کردار:

حرف اوّل کے دروغ بر گردن راوی کے ذیل میں ایک فکاہیہ و مزاحیہ تحریر سے پبلشر، ادیب اور بک سیلر کا مقام بھی ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے واضح کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے ملک مقبول احمد صاحب بھی یہاں بیان کردہ پبلشر کی کیٹگری میں آتے ہوں۔ مگر متعدد خطوط کے مطالعہ اور قلم کاروں کے اعترافات وانکشافات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملک صاحب نے ''لکھاریوں'' کے لئے اپنی بند مٹھی اور اپنی بند جیب کھولی ہوئی ہے نہ صرف یہ کہ ایڈوانس ادائیگیاں کر دیتے ہیں بلکہ یاد بھی نہیں کرواتے۔ رقم ادھار دے دیتے ہیں کبھی نہیں جتاتے کوئی شخص کتاب مانگ کر تو دیکھے اپنی گرہ سے خرید کر بذریعہ ڈاک بھجواتے ہیں اپنے ادارہ کی تو دو دو، اڑھائی اڑھائی سو کتابیں ''مفت'' بھجوا دیتے ہیں اور ''اُف'' تک نہیں کرتے۔ ملک صاحب یاروں کے یار ہیں، ادیبوں میں ادیب ہیں، رفیقوں میں رفیق ہیں، علمی سرپرستی فرماتے ہیں دل شکستہ اہل قلم کی اخلاقی و مالی دلجوئی فرماتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ان کے مال، اولاد، کاروبار اور گھربار میں برکت و عافیت عطا کی ہوئی ہے۔ سچ کہا ہے کہ کسی نے شریفوں کے گھر میں ہی چراغ جلتا ہے لٹیروں کے گھروں میں اندھیرا ہی رہتا ہے۔

☆ ملک مقبول صاحب کے شاباش کہ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں لکھے گئے۔ خطوط بھی سنبھال کر رکھے اور ''اہل قلم کے خطوط'' میں شامل کر کے مرحومین کو زندہ کر دیا۔ مثلاً صفحہ ۱۹۰ پر حامد علی خان صاحب کا خط ۱۹۵۹ء میں لکھا گیا ہے اور صفحہ ۱۹۱ پر لکھا گیا خط ۱۹۶۴ء میں تحریر میں آیا تھا۔

☆ کچھ حضرات کے خطوط کے عکس دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ملک صاحب غور فرمالیں اگر کرسکیں تو

(۱) تمام اہل قلم کے خطوط کے عکس شائع کر دیں خود کمپوز نہ کروائیں۔ ''اہل قلم کے خطوط'' کا شمار اگر ''نوادرات'' میں نہ ہو تو بات کریں۔

(۲) تمام زعما کے خطوط کو کمپوز کروائیں۔ کسی کا بھی عکس شائع نہ کریں۔ اس طرح یکسانیت اور خوب صورتی قائم رہے گی۔

ملک مقبول احمد صاحب ''بہت اچھے ہیں'' (گڑ جیسے) تبھی تو ان کے ارد گرد اتنے زیادہ احباب جمع ہیں۔ ملک صاحب کے تمام احباب (ملک صاحب کی طرح ہی ''بہت اچھے ہیں'' شہد جیسے۔ تبھی تو وہ ملک صاحب کے دوست ہیں اور ملک صاحب ان کے دوست ہیں۔ بضحوائے مصرعہ فارسی

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

اللہ سے دُعا ہے کہ اس دوستی کے گلشن کو ہمیشہ آباد اور مسرور رکھے اور دیکھنے والوں کے دل بھی شادر رکھے۔ واہ ملک صاحب، واہ احبابِ ملک صاحب، واہ دوستی علم و ادب، سلامت، بخیر سرور آرائی!

خلوص کیش

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

پروفیسر نذیر احمد تشنہ

بھمبر آزاد کشمیر (براہ گجرات)

4 جنوری 2010ء

امسال جنوری اور محرّم کا قِران ہوا ہے اس لیے سنِ عیسوی 2010ء کے ساتھ سنِ ہجری 1431ھ مبارک ہو۔ سنِ عیسوی تو بچہ بچہ جانتا ہے البتہ سنِ ہجری رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین مفتی منیب الرحمان صاحب کے اعلان سے ہی پتہ چلتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جلوہ بد سے محفوظ رکھیں۔

گذشتہ ماہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی صاحب کا انتقال ہوا۔ آپ سے ملاقات پر موصوف کی آپ کے ادارے سے طبع شدہ کتب کی فہرست لی۔ خیال تھا کہ پروفیسر صاحب کے بارے میں میری ذاتی لائبریری میں خاصی معلومات مل جائیں گی مگر مایوسی ہوئی۔ آپ کے ادارے کی خوبصورت اشاعت ''اہل قلم کے خطوط'' نکالی، اس میں تقریباً ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ''اہل قلم کے خطوط'' آپ کے نام کی فہرست دیکھی تو اس بات کی حیرانی ہوئی کہ آپ نے جس صاحبِ قلم کی نصف درجن کے قریب ضخیم کتب بڑے اہتمام سے زیورِ طباعت سے آراستہ کیں، اس کا ایک بھی خط آپ کے نام نہیں آیا۔

اہل قلم کے خطوط میں اکثر اہل قلم کے خطوط سے دو باتیں بڑے تواتر سے پڑھنے کو ملیں۔ ایک مسودے کی کتابی شکل میں آنے کی جلدی اور دوسری دبی زبان میں معاوضے کی ادائیگی کا تقاضا۔ مگر اس قلندر اور عالی ظرف انسان کی سیر چشمی اور قناعت دیکھیے کہ ایک بار بھی کتابوں کی طباعت میں جلدی اور معاوضے کی ادائیگی کا تقاضا نہیں

کیا۔ شاید موصوف نے خط لکھنے کے وقت کو بھی اقبال، رومی اور سعدی کے فارسی کلام کو اُردو نظم میں لانے میں برتا اور بڑی کامیابی سے برتا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا تھا کہ ''پروفیسر عبدالعلیم صدیقی ایک انجمن ہے۔ موصوف سدھنوتی کے جنگل میں منگل کیے بیٹھا ہے۔''

آزاد کشمیر میں فارسی دانی میں میرے ہم عصروں میں تین نام سردار بشیر صدیقی، پروفیسر عبدالعلیم صدیقی اور ڈاکٹر صابر آفاقی بڑے اہم ہیں۔ پہلے دو اللہ کو پیارے ہو چکے، البتہ تیسرے پیرانہ سالی کے باوجود جواں ہمت اور بلند حوصلہ ہیں۔ حال ہی میں ان کی نئی تصنیف ''مظفر آباد'' مقبول اکیڈمی لاہور سے طبع ہوئی ہے۔

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کی شخصیت اور فارسی دانی سے مجھے کشمیر کا مشہور فارسی شاعر ''غنی کاشمیری'' یاد آرہا ہے۔ غنی کاشمیری اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے زمانے میں سری نگر میں دریائے جہلم کے کنارے ایک کٹیا میں رہتا تھا۔ جب کٹیا سے باہر جاتا تو کواڑ کھلے چھوڑ جاتا اور جب کٹیا کے اندر ہوتا تو اندر سے دروازہ مقفل کر لیتا۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا اس کٹیا کی اصل دولت غنی کاشمیری ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے کشمیر کے گورنر کو لکھا کہ غنی کاشمیری کو دہلی بھیج دو۔ گورنر غنی کاشمیری کی کٹیا میں حاضر ہوا اور بادشاہ کا پیغام پہنچایا تو غنی کاشمیری نے مسکرا کر کہا کہ بادشاہ کو کہہ دو کہ غنی کاشمیری پاگل ہو گیا ہے۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ غنی کاشمیری پر دیوانگی کا دورہ پڑا اور تین دن کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

کشمیر بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ علامہ اقبال اور غنی کاشمیری کی فارسی شاعری کو ایران کے اہل زبان بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امام خمینی کا اسلامی انقلاب اقبالؒ کی فارسی شاعری کا مرہونِ منت ہے۔ اہل فارسی سردار بشیر صدیقی،

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی اور ڈاکٹر صابر آفاقی کو ان کی فارسی دانی کی وجہ سے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی اور ڈاکٹر صابر آفاقی کی علمی ادبی کاوشوں کو کتابی شکل دینے میں آپ نے بڑی فیاضی اور کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر پروفیسر رشید احمد قاسمی صاحب کے مشورے کو خاطر میں لائیں۔ اقبالؔ، سعدیؔ اور رومیؔ کا فارسی کلام اور پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کا منظوم اُردو کلام کو یکجا کر دیں تو یہ ایران اور پاکستان کے تشنگانِ علم پر آپ کا احسانِ عظیم ہو گا۔

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی آزاد کشمیر کی اَدبی دنیا کے نامور صاحبِ قلم تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ صاحبِ قلم بھی تھے اور صاحبِ زبان بھی تھے۔ عمر بھر کالج کے طلبا و طالبات کو پڑھایا۔ اس لیے درس وتدریس کے میدان میں اور علمی وادبی دنیا میں آپ کا فرمانا مستند تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں آپ ودانہ سدھنوتی (پلندری) لے گیا اور اُسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ اس کے باوجود آپ کے علمی واَدبی مراکز راولپنڈی، لاہور اور کراچی تک رسائی انتہائی مشکل تھی۔ اس کے باوجود آپ کے علمی وادبی مقام ومرتبے کا کھوج ایک صاحبِ نظر، مردم شناس، جہاں دیدہ پبلشر ملک محمد مقبول احمد صاحب نے لگا ہی لیا اور ان کی نصف درجن کتب کو حسن طباعت سے آراستہ وپیراستہ کر دیا۔

اہلِ قلم کے خطوط، خاصے کی چیز ہے۔ آپ نے ایک نئی طرح نکالی ہے اور اس طرز خاص کے آپ ہی موجد ہیں اور شاید کوئی دوسرا آپ کا تتبع کر سکے۔ اس کی بڑی وجہ آپ کے اندر کا ادیب ہے جو فنِ طباعت کے عروج پر پہنچنے کے باوجود، بے قرار رہا، سفر جاری رہا، اب بھی سفر جاری ہے، یہ سفر ''پذیرائی'' سے ہوتا ہوا، ''اہل قلم کے خطوط'' تک پہنچا اور اِن شاء اللہ رواں دواں رہے گا۔

اب تک ہم خطوط کی تین اقسام، نجی، کاروباری اور سرکاری پڑھایا کرتے

تھے۔ اب آپ ماشاء اللہ چوتھی قسم منصۂ شہود پہ لائے ہیں جس میں نجی اور کاروباری دونوں کو یک جا کر دیا ہے، اِسے ''احساس و محسوس'' کی صنف قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی واحد مثال ''اہل قلم کے خطوط'' کہی جا سکتی ہے۔ اس سے قبل مکتوبات کے چند مجموعے مکاتیب غالب، اقبال نامہ، مکتوبات نیاز، خطوط افضل حق، مکاتیب نمبر نقوش، غبارِ خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد) لیلیٰ کے خطوط (عبدالغفار) صحرانورد کے خطوط (مرزا ادیب)، گویا دبستان کھل گیا (محمد علی رودلوی) بارِ خاطر (شوکت تھانوی) روحِ مکاتیب (ساغر نظامی)، نقوش زنداں (سجاد ظہیر)، زیرلب (صفیہ اختر) حرف آشنا (صفیہ اختر)، باتیں ہماریاں (عصمت شکیل) وغیرہ جو میری نظر سے گزرے ہیں ان میں ''اہل قلم کے خطوط ایک یادگار اور قابل قدر اضافہ ہے۔

اہل قلم کے خطوط، ڈیڑھ سو کے قریب ادبا کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اکثر خطوط فنِ خطوط نگاری کا شاہکار ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے ''اچھے خط کو وہ مقصد ضرور پورا کرنا چاہیے جو اس کا اصل محرک ہو یعنی خط نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ایسے انداز میں کہے کہ مکتوب الیہ کو پیغام کا قطعی علم ہو جائے اور اچھے خطوں کے سلسلے میں بڑی بنیادی چیز ان کی لطافت ہے۔'' اہل قلم کے خطوط میں اکثر مکتوب نگاروں نے وہ باتیں خط میں بڑے لطیف پیرائے میں بڑی خوبی سے کہہ دی ہیں جو منہ سے کہنے سے کتراتے تھے۔ مرزا ادیب کا ایک خط صفحہ 503 پر یوں ہے۔ ''آپ سے ملاقات ہوتی ہے تو میں آپ کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر نہ جانے دل مطمئن نہیں ہوتا۔ میں اصل میں قلم کا آدمی ہوں۔ میرا صحیح اظہار قلم ہی سے ہوا ہے تو میرا قلم جو میرے دل کی نمائندگی کرتا ہے۔''

اہل قلم کے خطوط پڑھ کر یہ تاثر عام ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف کاروباری پبلشر

ہیں بلکہ ادبا و شعرا کے محسن بھی ہیں۔ مشتے از خروارے دو مثالیں صفحہ 113 اور صفحہ 129 سے درج ہیں۔ ''اس دن آپ سے مضمون نویسوں کو دینے کے لیے چند کتابوں کے بارے میں کہا تھا، ان کا منتظر ہوں کیوں کہ بصورت دیگر وہ مطالبہ کرتے ہیں۔'' ''اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کم از کم معاوضہ فی صفحہ کتابت، کاتب کے برابر یعنی دس روپے تو دیں۔ اس سے اوپر عنایت فرمائیں تو یہ آپ کی ذرہ نوازی اور دوست نوازی ہوگی۔''

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں۔ ''بہترین خطوط وہ ہوتے ہیں جو پڑھ کے پھاڑ دیئے جاتے ہیں۔'' یہ خط اکثر جذبات سے مغلوب ہو کر لکھے جاتے ہیں جو مکتوب الیہ کبھی پھاڑ دیتا ہے اور کبھی سینے سے لگا کے رکھتا ہے تاہم خطوط کی چوتھی قسم ''نجی و نیم کاروباری'' میں پھاڑے جانے کے لائق وہ خطوط ہوتے ہیں جن میں کتاب کی رائلٹی پوری لینے کے بعد مزید کا مطالبہ کیا گیا ہو۔

ادیب جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے اور جب پبلشر سے واسطہ پڑتا ہے تو پھر اُسے اپنے بندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جن ادیبوں نے ''قلم'' کو اپنے پیشے کا ہتھیار بنا لیا ہے، ان کی حوصلہ افزائی پبلشر کو دل کھول کر کرنی چاہیے۔ اس کو قلم قافلے کے ایک

سالار نے یوں نظم کیا ہے۔

لفظ تاجر خود ہے اے اکبر ثبوت
دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے

اہل قلم کے خطوط، ادب میں یقیناً پہلی کوشش ہے جس میں ادیبوں نے مختلف انداز، ندرت پیرائے اور عمدہ اسلوب میں اظہار خیال کیا ہے اور آپ نے ان کے خیالات کو خوبصورت انداز اور عمدہ طباعت کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ آپ کی ادب نوازی اور فن طباعت پر دسترس کی چغلی کھا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سفر تا دیر جاری رہے۔

آپ کا تشنہ
پروفیسر نذیر احمد تشنہ

☆......☆......☆

سعید بدر

''اہلِ قلم کے خطوط'' پر ایک نظر

فن خطوط نویسی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اگر صرف تاریخ اسلام کو پیش نظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نبی محترم و محتشم حضرت محمد ﷺ کے اُن مکتوبات سے اس فن کا آغاز ہوتا ہے جو آپ ﷺ نے نبوت کے اعلان کے کچھ دیر بعد اس دور کے بادشاہوں، سلاطین اور سربراہان مملکت کو لکھے تھے۔ ان میں اہم ترین وہ خطوط ہیں جو شہنشاہ روم ہرقل اور شہنشاہ ایران کسریٰ کو لکھے گئے۔ ایران شہنشاہ نے آتشِ غضب میں جل کر آپ ﷺ کے خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور خط لانے والے ایلچی کی توہین کی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے اپنے ماتحت ایک عرب حکمران کو حکم دیا کہ وہ آپ ﷺ کو گرفتار کر کے ایران پہنچائے۔ جب آپ ﷺ کو اپنے خط کے بارے میں ایران کے حکمران کی طرف سے روا رکھے گئے گستاخانہ رویّے کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''کہ اس نے میرا خط پارہ پارہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔''

پیغمبرِ حق و صداقت کی بدعا کیسے قبول نہ ہوتی۔ آخر کار چشم عالم نے دیکھا اس دور کی سُپر پاور ایران کی سلطنت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کے ہاتھوں حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں نہ صرف مفتوح ہوئی بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اسی طرح جب شہنشاہ کے حکم کے مطابق ماتحت گورنر کے آدمی آپ کو گرفتار یا قتل کرنے مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ نے انہیں

رات بھر ٹھہرایا اور مہمان نوازی کی اور جب وہ صبح سامنے آئے تو فرمایا کہ:

''آج رات تمہارا شہنشاہ قتل ہو گیا ہے''

اس پر وہ لوگ حیران ہوئے۔ واپس پہنچے تو ان کو پتہ چلا کہ ایران کا باجبروت شہنشاہ کسریٰ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہرقل شہنشاہ روم نے آپ کے خط کا احترام کیا اور علاقے میں آئے ہوئے عرب تجارتی قافلے کے ارکان کو بلا کر آپ ﷺ کے متعلق کچھ سوالات کیے قافلہ سالار ابوسفیان جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے، جوابات دیئے۔ ہرقل نے ہر جواب پر آپ ﷺ کی تصدیق کی اور ایلچی کو تحفے دے کر روانہ کیا۔ مصر کے مقوقس نے بھی احترام کا اظہار کیا اور آپ کو مختلف تحفے بھیجنے کے علاوہ دو کنیزیں بھیجیں جن میں حضرت ماریہ قبطیہ بھی شامل تھیں۔ جنہیں آپ ﷺ نے اپنے حرم مبارک میں شامل کر لیا۔

حضور پُر نور ﷺ کے یہ مکتوبات آج بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد بھی حکمرانوں کے خطوط ملتے ہیں۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے گورنروں کو خطوط لکھے۔ بہرحال خطوط نویسی کا طویل سلسلہ عرصۂ دراز سے چلا آرہا ہے۔ بلکہ ہمارے بعض بزرگانِ دین اپنے مریدین اور معتقدین کو بسلسلۂ رُشد و ہدایت بالعموم خطوط ہی سے کام لیتے ہیں۔ ان خطوط میں اہم دینی و مذہبی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ جن سے آج تک خلقِ خدا رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ اس ضمن میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے خطوط بہت مشہور ہیں جو انہوں نے اپنے مریدوں کو لکھے اور ان میں مختلف دینی اور روحانی اشکال و مسائل کے حل پیش کیے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کے نادر مکتوبات ہیں جنہیں مولانا نسیم احمد فریدی نے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ ان مکتوبات کی تعداد 152 کے قریب ہے۔ یہ خطوط مختلف شخصیات اور

شاگردوں کے نام ہیں جن میں مختلف دنیاوی اور دینی مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔

غرض کہ علم وادب کی تاریخ میں مکتوب نگاری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عہدِ حاضر میں ''غالب کے خطوط'' بڑی اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں۔ جو ''عود ہندی'' اور ''اُردوئے معلیٰ'' کے عنوانات کے تحت پہلی بار علی الترتیب 1868ء اور 1869ء میں شائع ہوئے اور اب تک شائع ہو رہے ہیں۔ یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہے کہ تقریباً قابلِ ذکر تمام ادبی شخصیات نے خطوط لکھے جو چھپ چکے ہیں اور ''حوالہ'' (ریفرنس) کا کام دے رہے ہیں۔ دور حاضر میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے تاریخی خطوط ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ جن سے نظریہ پاکستان کی وضاحت ہوتی ہے۔

گویا مکتوب نگاری کو اب ایک اہم اور مفید صنف سخن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ انگریزی ادب میں بھی اس کا رواج موجود ہے بلکہ ہر زبان میں خطوط نویسی کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

زیرنظر کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' ملک مقبول احمد کی کاوش ہے۔ اس کتاب میں 96 کے قریب خطوط شامل ہیں۔ جو بڑے بڑے ادیبوں، عالموں، شاعروں اور قلمکاروں نے مختلف اوقات میں ملک مقبول احمد کو لکھے جو اپنے عہد کے مقبول ومشہور ناشر تھے اور ہیں۔ ان خطوط سے جہاں اہل قلم کی طرف سے کتابوں کی طباعت واشاعت کے بارے میں حسن طلب کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں قلمکار کی بعض خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ مزید برآں قلمکار اور ناشر کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ خطوط نہ صرف معلومات افزاء ہیں بلکہ دلچسپی کے حامل بھی ہیں۔ بعض خطوط نگاروں نے ملک صاحب سے گلے شکوے کیے ہیں اور ان مکتوبات سے ملک مقبول احمد صاحب کی شخصیت کے متعدد خطوط اُجاگر ہوتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ وہ اچھے اور کامیاب ناشر ہی

نہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ جن میں ادا جعفری، انیس ناگی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، رئیس احمد جعفری، اے حمید، پرتو روحیلہ، جوگندر پال، حاجرہ مسرور، حفیظ تائب، ضمیر جعفری، سید قاسم محمود، شفیق الرحمٰن، عبدالعزیز خالد، علی سفیان آفاقی، محشر بدایونی اور مشفق خواجہ جیسے نامور اور ممتاز اہل قلم شامل ہیں۔

بعض مکتوبات نہایت مختصر ہیں اور بعض طویل، ہر خط اور قلمکار کا انداز اور اسلوب دوسروں سے مختلف او جداگانہ ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی کتاب کے ٹائٹل کے بارے میں پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ بعض ادیبوں نے صاف صاف الفاظ میں سرورق کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور اپنے جمالیاتی حسن کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ادا جعفری اور اختر جمال بہت حساس ہیں۔ افتخار امام صدیقی نے اپنے خط میں شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے لیکن اپنے رسالہ 'شاعر'' میں اشتہار کی اشاعت پر دو ہزار روپے معاوضہ بھی طلب کرنے سے گریز نہیں کیا۔

بہرکیف ایسے خطوط بہت دلچسپ اور اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں کسی قسم کے لین دین کی بات نہیں کی گئی بلکہ محض علمی یا ادبی بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں سید ضمیر جعفری اور محشر بدایونی کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے ذاتی سطح سے بلند ہو کر بات کی ہے اور ناشر کی تعریف کی ہے، بلکہ مشفق خواجہ نے تو اپنے خط میں اعتراف کیا ہے کہ:

> ''آپ اُردو زبان کی جو خدمت کر رہے ہیں اس کے لئے وہ تمام لوگ آپ کے شکر گزار ہیں جنہیں اُردو زبان و ادب سے دلچسپی ہے''۔

بلا شبہ مختلف موضوعات پر ہزاروں کتب شائع کر کے ملک مقبول احمد نے اُردو زبان کے فروغ و اشاعت کے سلسلہ میں بہت اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ حقیقت ہے کہ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جس پر ملک صاحب داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

محمد آصف بھلی کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ ملک صاحب کتابوں کی تقسیم کے بارے میں ''بخیل'' نہیں۔ انہوں نے آصف بھلی صاحب آف سیالکوٹ کو ایک ہی وقت میں دواڑھائی سو کتابوں کا تحفہ بھیجا۔ حقیقتاً بہت بڑی بات ہے اور فراخدلی کی علامت ہے۔ دور کیوں جایئے۔ ملک صاحب پہلی بار غریب خانہ پر رونق افروز ہوئے تو آٹھ دس کتابوں کا بنڈل چھوڑ گئے اور اب تک کسی کتاب کا اشارہ کروں تو وہ اگلے دن گھر پہنچ جاتی ہے۔

؎ یہ انہی کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

آصف بھلی لکھتے ہیں:

''ایک ناشر ان گنت کتابوں کا تحفہ بھیج دے اور بھیجنے سے پہلے اس انداز سے اپنی عنایات کا تذکرہ کرے کہ جیسے وہ کوئی تحفہ بھیج کر احسان نہیں کر رہا بلکہ یہ تو اس کی مہربانی ہے جو تحفہ وصول کر رہا ہے۔ بڑے آدمی یقیناً احسان ہی کرتے ہیں کہ جس آدمی سے مہربانی اور بھلائی کا عمل کیا جا رہا ہو۔ اُسے احساس نہ ہونے دیا جائے۔ کہ کتنا بڑا احسن سلوک اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔

''ملک صاحب شاید اس دور کے انسان ہی نہیں۔ ایسی روایات اور قدریں اب دم توڑ چکی ہیں جن کے آپ امین ہیں۔'' پروفیسر ڈاکٹر اختر شمار لکھتے ہیں۔

''آپ نے صحت وتندرستی کے حوالے سے کتاب بھی عنایت کی ہے ممنون ہوں۔ مجھے اس کتاب سے آپ کی زندگی کے ان مراحل نے خاصا لطف دیا جب آپ عملی زندگی کا آغاز کر رہے تھے۔ اس سے عام قاری کو محنت، ریاضت اور مستقل مزاجی کا درس ملتا ہے۔

یوں تو آپ کی خودنوشت خاصے کی چیز ہے اور اس میں آپ کی زندگی کے شب وروز کے علاوہ اشاعتی مسائل، اہل قلم کے عادات وخصائل اور دیگر شعبوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آپ نے اچھا کیا اپنی یادداشتوں کو قلمبند کر کے اسے

کتاب بنا دیا اور اسے خوبصورت گیٹ اپ میں شائع کیا۔ کتنے پبلشر ہیں جو واقعتاً صاحب کتاب بھی ہیں؟ کتاب پڑھ کر محسوس ہوا کہ تجربہ کے ساتھ آپ گہرا مشاہدہ بھی رکھتے ہیں۔ آپ کی تجویز میں ناچیز بھی ہے۔ آپ کو مزید لکھنا چاہئے۔"

مشہور معروف ادیب سینئر صحافی اور شاعر امین راحت چغتائی رقمطراز ہیں کہ:

"آپ کی بھیجی ہوئی کتاب "سفر جاری ہے" اور بام و در جن سے روشن ہوئے، نیز چار "کتابچے"، "صلو علیہ وآلہ"، "حج و عمرہ" اور "القرآن نظر" نواز ہوئے۔ چاروں کتابچے جن پاکیزہ احساس سے معروض طباعت میں آئے ان کے پیش نظر کے درجات کی بلندی کے لئے دُعا کی۔ تمام کتابیں آپ کی نفاست طبع اور حسن تدبیر کی آئینہ دار ہیں۔ جب کتابوں کا پارسل ملا تو میں اپنی کرسی پر نیم دراز دھوپ سینک رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ؎

در موسم زمستاں، جاناں در چیز باید
یا روئے آفتابے یا رو بہ آفتابے

اتفاق ہے کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں لہٰذا اتفاق کریں گے کہ شعر کے مصرع ثانی کے جزو ثانی پر اکتفا ہی مناسب ہے۔ "سفر جاری ہے" میں آپ کی تصویر دیکھی۔ بھلمنساہٹ کی غماز لیکن تصویر میں آنکھیں بہت اہم لگیں جو ایک باضابطہ اور پارکھ مزاج کی نشاندہی کرتی ہیں اور سپیدۂ خط کی تازگی کا تو آپ خود اعتراف کر چکے ہیں۔ جب بھی جرم ضعیفی کا اقبال ہو جائے، بھلا ہے"

پروفیسر ایم نذیر تشنہ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس قبل میں آپ کو ایک چابکدست پبلشر اور ماہر فن ہی خیال کرتا تھا لیکن آپ کی آپ بیتی "سفر جاری ہے" نے میرے پہلے تاثر کو مزید مضبوط کر دیا اور ایک

دوسرے تاثر کو اُبھارا کہ آپ ایک صاف گو مصنف بھی ہیں۔ کتاب کے مطالعہ
سے یہ بات سامنے آئی کہ آپ نے منشی فاضل کیا، معلمی کی اور پھر ادارت کے
شعبہ میں اپنا لوہا منوایا۔ بے شک اس دور میں عالم یا فاضل کی اسناد ہی طرّہ امتیاز
اور پڑھے لکھے کی شناخت ہوتی تھیں۔''

''اللہ تعالیٰ یہ سفر جاری رکھیں اور آپ کا سایہ ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ (آمین)

''کتاب کا ہر لفظ مصنف کے خلوص، سادگی، نفاست اور ژرف نگاہی کی منہ بولتی
تصویر ہے۔ موضوعات مصنف کے تبحرِ علمی اور تجربے کی چغلی کھاتے ہیں۔
جنہوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے۔ اور آپ کی آپ بیتی پڑھی ہے، وہ کہہ
اُٹھتے ہیں کہ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔''

'میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کاوش ''آپ بیتی'' پر حوالہ جاتی کتاب ہوگی
جسے تادیر اُردو ادب میں یاد رکھا جائے گا۔''

عباس خان (جو 2001ء تک جج رہے لیکن سپریم کورٹ سے بعد ازاں انہیں جج
قرار نہ دیا کیونکہ جنرل مشرف نے اصل سپریم کورٹ کے ججز کو معزول (غیر قانونی) کر کے
نئے ججز مقرر کیے تھے)۔ لکھتے ہیں:

''آپ کی مرتب کی ہوئی کتاب ''پذیرائی'' آپ کی بے پایاں عنایت سے مل گئی ہے۔''

اتنے صاحبانِ علم و دانش کے ساتھ اپنا نام، اپنی تحریر، اپنی تصویر اور اپنے بارے
میں تحریر دیکھ کر اس مسرت سے سرشار ہوں۔ جسے زوال نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید،
ڈاکٹر وحید قریشی، مجیب الرحمٰن شامی، اے حمید، ثریا خورشید، طارق اسمٰعیل ساگر جیسی بڑی
بڑی ہستیوں کی صف میں جگہ ملنا میرے فن کی دنیا میں ایک انقلاب آخر میں واقعہ ہے۔ یہ
انعام آپ کی اعلیٰ ظرفی کی دین ہے۔ اللہ پاک سے دُعا ہے کہ آپ کا اقبال اور بلند فرمائے۔

''کتاب کی ترتیب و تزئین آپ کی کاوش، ذوق اور بصیرت کا ایک شاہکار

ہے۔میں نے اس کو اپنی اپنی میز پر اپنی باقی ماندہ زندگی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔
تا کہ لوگوں کی طرف سے جب غم ملے تو اس کو دیکھ کر اس کو زائل کر سکوں''۔

اس طرح علامہ عبدالستار عاصم جو ممتاز سوشل ورکر بھی ہیں۔اپنے مکتوب میں رقمطراز ہیں۔

''راقم خوش نصیب ہے کہ''پذیرائی''میں آپ نے راقم کا ذکر بڑے اچھے اور خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔خلوص اور حوصلہ افزائی کے اس اقدام پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

''میرے دوستوں نے آپ کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔وہ آپ کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔آپ نے اہل فکر ونظر کو اعمال صالحہ کی ترغیب دے کر نیکی کے عمل کو جاری رکھنے کا فرض تفاخر کن ادا کیا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی اولاد کو آپ جیسا باہمت بنائے اور آپ کو زندگی اور صحت سے نوازے کہ آپ اسی طرح ادب کی خدمت کرتے رہیں اور اچھی تحریریں ہم تک پہنچتی رہیں۔''

غرض کہ''پذیرائی''میں شامل ہر خط میں ملک مقبول احمد صاحب کے اطوار وکردار اور اعمال وخصائل کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔کسی نے بھی آپ کے ایسے عمل کا ذکر نہیں کیا۔جو منفی ہو۔یہ آپ کی عظمت اور کردار پر دلیل ہے۔بہر حال''اہل قلم کے خطوط''شائع کر کے آپ نے ایک دستاویز محفوظ کر دی ہے۔یہ کتاب یقیناً حوالہ کے طور پر مفید رہے گی۔ ادیبوں کو چاہیے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں اس کتاب کا مطالعہ کریں اور محظوظ ہوں۔

☆☆☆

آصف بھلّی

9- علامہ اقبال روڈ سیالکوٹ کینٹ

ایک بڑا انسان، ایک بڑا ناشر

پچھلے دنوں ملک مقبول احمد کے مرتب کی ہوئی کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' میرے زیر مطالعہ رہی۔ پاکستان اور انڈیا کے نامور ادیبوں اور شعراء کے یہ خطوط ملک مقبول احمد ہی کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ ملک صاحب نے اپنے نام لکھے گئے ان خطوط کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اب اپنے ادارے مقبول اکیڈمی کے زیر اہتمام حسن طباعت کی اپنی تمام تر روایات کو برقرار رکھتے ہوئے کتابی صورت میں شائع بھی کر دیئے ہیں۔ یہ خطوط چونکہ ملک صاحب کے اشاعتی ادارے کے حوالے سے ہیں اس لیے زیادہ تر خطوط میں مصنفین نے اپنی کتب کی اشاعت کے موضوع پر ہی تحریری اظہار کیا ہے۔ ملک مقبول احمد نے کسی بھی ادیب کے کسی خط کو سنسر نہیں کیا۔ ان خطوط میں کچھ مصنفین اپنی کتابوں کی اشاعت میں ہونے والی تاخیر کا شکوہ کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ کچھ شعرا کی طرف سے یہ شکایت کی گئی ہے کہ ان کی کتابوں کی اشاعت کے بعد تشہیر کا مناسب اہتمام نہیں کیا گیا۔ ان معمولی نوعیت کے شکوہ و شکایت کو چھوڑ کر جملہ ادیبوں نے ملک مقبول احمد کی شخصیت کے کسی نہ کسی خوبصورت پہلو کی تعریف ہی کی ہے۔ اہل قلم کے ان خطوط سے ملک مقبول احمد کی جو تصویر ابھرتی ہے اُس کے خدوخال کچھ یوں ہے۔

ملک مقبول احمد ایک ایماندار ناشر ہیں۔ ادیبوں کو ان کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ کسی ناشر کے لیے یہ شہرت بہت بڑا اثاثہ ہے کہ ادیب اُس کی کاروباری دیانت کو

شک وشبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ مَیں نے بیسیوں اہل قلم کے خطوط پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ کسی بھی ادیب یا شاعر نے ملک مقبول احمد پر بے اعتمادی کا اظہار نہیں کیا۔ ہر ادیب نے یہی تحریر کیا ہے کہ ملک صاحب معاملات کے کھرے ہیں اور جو حق کسی مصنف کا بنتا تھا ملک صاحب نے کتاب مکمل ہونے سے پہلے وہ ادا کیا۔ پھر جب بھی کسی مصنف نے اپنی شائع شدہ کتب کی طے شدہ اعزازی کاپیاں حاصل کرنے کے باوجود بھی اپنی کسی کتاب کا تقاضا کیا تو ملک صاحب نے بڑی خندہ پیشانی اور وُسعتِ قلبی سے مصنف کو طلب کی گئی تعداد سے بھی زیادہ کتابیں عطاء کر دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک مقبول احمد صرف کاروباری معاملات میں ہی دیانت دار نہیں بلکہ مصنفین کے حق میں اُن کا ایک ہمدرد، شفیق اور مخلص انسان ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنے ادارے کے ادیبوں اور ذاتی دوستوں کے ساتھ ایسا ایسا حسن سلوک کرتے ہیں کہ کچھ اہل قلم نے تو ان الفاظ میں گواہی دی ہے کہ ملک مقبول احمد کی محبت، عنایات اور کرم فرمایاں کچھ ایسی سادگی، انکساری اور بے ساختگی کا رنگ لیے ہوتی ہیں کہ خوشی سے ایک انسان کے آنسو نکل آتے ہیں اور ملک صاحب کے لیے دل سے دعائیں جاری ہو جاتی ہیں۔ شاید ادیبوں اور شاعروں کی یہ دعائیں ہی ہیں جن کے باعث خداوند کریم نے ملک مقبول احمد اور ان کے اشاعتی ادارے کو بے پناہ برکتوں، رحمتوں اور ترقی سے نواز رکھا ہے۔

ملک مقبول احمد کا بطور ناشر ایک اور پہلو بھی ایسا ہے کہ جس کی تقریباً تمام ادیبوں نے اپنے خطوط میں بے حد تعریف کی ہے۔ ملک مقبول احمد کتاب شائع کرتے وقت اس کی خوبصورتی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اُن کا نظریہ اور عقیدہ کتاب کے حسن اشاعت کے حوالے سے یہ ہے کہ کتاب کا مواد معیاری ہونا جس طرح بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اسی طرح کتاب بھی اتنی دیدہ زیب ہونی چاہیے کہ اس کو دیکھنے والے کی

جمالیاتی حسن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا مطلب ہے وہ کتاب کی سیرت اور صورت دونوں کا بطورِ خاص خیال رکھتے ہیں۔ میری اس بات کی تصدیق ''اہل قلم کے خطوط'' میں شامل ایک خط سے بھی ہوتی ہے اور یہ خط بھی کسی عام شخصیت کا نہیں بلکہ انڈیا کے شہر ممبئی سے شائع ہونے والے ایک معتبر ادبی رسالہ ''شاعر'' کے ایڈیٹر افتخار امام صدیقی کا ہے۔ صدیقی صاحب اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعر علامہ سیماب اکبر آبادی کے پوتے ہیں۔ افتخار امام صدیقی لکھتے ہیں۔ ''اچھی اور منفرد جمالیاتی سطح پر سجی، سنوری کتاب میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اندرونی صفحات کی خوشبو مجھے مسحور کر دیتی ہے اور میں گھنٹوں اسے نیارتا رہتا ہوں۔ میرے احساسات معطر ہو جاتے ہیں۔ اور جذباتی طور پر میں دوسروں کو بھی اس سے متعارف کرواتا ہوں۔ اور اس عمل میں انتہا پسند ہو جاتا ہوں کہ میرے ذریعے سے میری پسند خوشبو ہو جائے اور دنیا میں پھیل جائے۔''

افتخار امام صدیقی نے ملک مقبول احمد کے نام درج بالا خط اُس وقت تحریر کیا تھا جب انہیں ملک صاحب کی پہلی کتاب ''سفر جاری ہے'' موصول ہوئی تھی۔ صدیقی صاحب کے خط سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ''سفر جاری ہے'' کے ظاہر و باطن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ نہ صرف اس کتاب کی خوشبو کو دنیا بھر میں پھیلانے کے آرزومند نظر آئے بلکہ اُنہوں نے اپنے خط میں اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ جب وہ اپنے شعری مجموعہ کا پاکستانی ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کریں گے تو وہ یہ کام پاکستان میں مقبول اکیڈمی ہی کے سپرد کریں گے۔

پاکستان کے چوٹی کے شاعر اور ممتاز مزاح نویس سید ضمیر جعفری بھی مقبول اکیڈمی کی خوبصورت کتابوں کے مداح تھے۔ انہوں نے بڑے اچھوتے انداز میں ملک صاحب کے نام اپنے خط میں مقبول اکیڈمی کی کتابوں کی توصیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آپ کی

کتابوں پر بعض اوقات جی للچاتا رہا۔ اگر آپ میرے کسی مسودے کی اشاعت میں دلچسپی رکھتے ہوں تو میں دلچسپی سے بات کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔"

انڈیا سے ڈاکٹر کیول دھیر بھی ملک مقبول احمد کی اس ہنرمندی کے معترف نظر آتے ہیں کہ مقبول اکیڈمی کی کتابیں بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے خط کے ذریعے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اُن کی کہانیوں کی جو کتاب مقبول اکیڈمی شائع کر رہی ہے وہ بھی "سفر جاری ہے" (ملک مقبول احمد کی خودنوشت) جیسی ہی خوبصورت اور دیدہ زیب ہوگی۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے پاکستان کے ایک نامور شاعر محشر بدایونی مرحوم نے اپنے خط میں ممتاز شاعرہ محترمہ ادا جعفری کے حوالے سے یہ تحریر کیا ہے کہ ان کے شعری مجموعے مقبول اکیڈمی نے بہت خوبصورت اور اعلیٰ معیار کے شائع کیے ہیں۔ محشر بدایونی نے ادا جعفری کی کتابوں کا حوالہ دے کر خود بھی اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اُن کا مجموعہ بھی ہر اعتبار سے دلکش و جاذبِ نظر ہوگا۔ اُوپر کی سطور میں مختلف ادیبوں کے خطوط کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حقیقت صرف کسی ایک ادیب کی رائے تک محدود نہیں بلکہ انڈیا اور پاکستان کے بہت سارے ادیب مقبول اکیڈمی کی کتابوں کو طباعت اور گیٹ اَپ کے اعتبار سے مثالی تسلیم کرتے ہوئے ایسے ہی پسندیدہ اور دل آویز انداز میں اپنی کتابوں کی اشاعت کے بھی خواہش مند ہیں۔

پاکستان کے ایک اور نامور مصنف میرزا ادیب کا اپنی کتابوں کے حوالے سے مختلف ناشرین سے واسطہ رہا لیکن جب وہ ان ناشرین کے ظالمانہ سلوک (یہ الفاظ خود میرزا ادیب کے ہیں) سے تنگ آ گئے تو اُن کا رابطہ مقبول اکیڈمی سے ہوا۔ یہاں انہیں بالکل مختلف تجربہ ہوا اور وہ ملک مقبول احمد کے اخلاق، کاروباری اصولوں اور کتاب کی

اشاعت کے معیار سے اتنا متاثر ہوئے کہ آئندہ کے لیے انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ ان کی تمام کتابیں مقبول اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ہی شائع ہوں گی۔ میرزا ادیب نے اپنے ایک خط میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے کہ ''میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے ایک ایسے شخص سے ملا دیا ہے جو ناشر کم اور انسان زیادہ ہے۔'' میرزا ادیب نے ایک اور خط میں ملک مقبول احمد کو مخاطب کرتے ہوئے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ ''آپ ناشر جیسے بھی ہوں لیکن انسان بہت بڑے ہیں۔''

کسی کا بڑا انسان ہونا اور دوسروں کا کسی شخص کو بڑا انسان تسلیم کرنا ہی ایک شخص کی عظمت اور کامیابی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ لیکن ملک مقبول احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف بطور انسان دوسروں کے دلوں میں اپنی محبتوں اور عظمتوں کے گہرے نقوش مرتب کیے بلکہ بطور ناشر بھی اپنی مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ وہ کتابوں کی اشاعت پر بڑی دریا دلی سے سرمایہ صرف کرتے ہیں۔ جب کتابت اچھی ہوگی، کاغذ عمدہ اور مہنگا استعمال کیا جائے گا، طباعت پر زرِ کثیر صرف کیا جائے گا، مضبوط جلد کا اہتمام کیا جائے گا اور سرورق بنوانے کے لیے اچھے مصور کا انتخاب کیا جائے گا تو پھر جو کتاب چھپے گی وہ ضرور ایک شاہکار ہوگی اور ایسے کارناموں کا دوست دشمن سب ہی اعتراف کریں گے۔

''اہل قلم کے خطوط'' پڑھ کر مجھے جس بات پر سب سے زیادہ حیرت اور خوشی ہوئی۔ آخر میں مَیں اُس کا اظہار ناگزیر سمجھتا ہوں۔ میری مختلف موضوعات پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس لیے ناشرین کے حوالے سے میرے بھی کچھ تجربات ہیں۔ جن میں ناخوشگوار زیادہ اور خوشگوار کم ہیں۔ ناشرین کے ساتھ ادیبوں اور شاعروں کی رنجش اور اختلاف کے کئی پہلو نکل آتے ہیں۔ ان حالات کے پس منظر میں جب میں

نے ''اہل قلم کے خطوط'' کا مطالعہ کیا تو مجھے ملک مقبول احمد کی شخصیت میں بہت سارے باعثِ حیرت اور قابل رشک پہلو نظر آئے۔ معمولی شکوہ و شکایت تو کسی نہ کسی مرحلے پر ایک فرشتہ سیرت انسان سے بھی آپ کو ہو سکتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی ادیب مجھے اپنے خطوط کے آئینے میں ملک مقبول احمد سے ناخوش یا غیر مطمئن نظر نہیں آیا۔ شاید ملک صاحب نے یہ خطوط شائع بھی اس لیے کر دیئے ہیں کہ ان کے دامن پر کسی ادیب کی بددعاؤں کا داغ نہیں ہے۔ اگر ملک مقبول احمد نے دوسرے ناشرین کی طرح اپنے مصنفین کو ناقابل بیان ذہنی صعوبتوں میں مبتلا کیا ہوتا تو شاید یہ خطوط بھی ناقابلِ اشاعت ہی رہتے۔ جس طرح آج تک کسی اور ناشر نے اپنے نامور ادیبوں کے خطوط شائع کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

☆......☆......☆

پروفیسر غلام نبی اعوان

''اہل قلم کے خطوط''۔ ایک جائزہ، ایک تاثر

ساس اور بہو کا جھگڑا ایک ایسا تنازعہ ہے جو ازل سے چلا آرہا ہے اور آج تک اِس کا کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ہاں وہاں آکر بہو کا سماجی پلڑہ کچھ بھاری ہو جاتا ہے جب کہہ دیا جاتا ہے کہ ساس اپنی بیٹی کے لئے دنیا کے سارے سکھ سمیٹ لینے کی خواہش کرتی ہے لیکن جب کسی اور کی بیٹی کو بیاہ کر گھر لاتی ہے تو بہو کو سکھ کا سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دیتی خوبصورت کماؤ مگر بیوی کا غلام داماد، اکیلا گھر، نہ ساس، نند اور نہ جیٹھ دیور اور آنے جانے کی آزادی، یہ ہے اِک ساس کا خواب اپنی بیٹی کیلئے، لیکن بہو ہو تو اللہ تعالیٰ کی گائے، ساس اور نندوں کی خدمت گزار۔ ایسا ہی ایک جھگڑا علمی و ادبی محاذ پر بھی سدا سے چلا آرہا ہے مصنف اور پبلشر کا جھگڑا کتنے ہی الزامات ہیں جو کسی متاثرہ شاعر، ادیب اور دانشور کی طرف سے اپنے اُس ناشر اور پبلشر پر لگائے جاتے ہیں جس نے اس کی کتاب شائع کی ہو۔ کتاب کے صوتی و معنوی نقائص سے لیکر اشاعت میں ناقابلِ برداشت تاخیر، تعدادِ اشاعت میں ڈنڈی، رائیلٹی میں کمی بیشی، کتابوں کی مقررہ فراہمی میں بددیانتی اور پبلشر کی خصلت و کنجوسی ایسے موضوعات ہیں جن پر ''مظلوم'' ادیب گھنٹوں کے حساب سے بول سکتا ہے اور کاغذوں کے تختے سیاہ کر سکتا ہے۔ نجی محفل ہو یا کوئی ادبی پلیٹ فارم، متاثرہ ادیب کی گریہ وزاری دِل شگاف ہوتی ہے۔ (اس گریہ وزاری کا اک عرصے تک

میں بھی مریض رہا ہوں۔ جب کوئٹہ کے ایک ناشر نے میری پانچ سو پچاس صفحے کی کتاب کو تین کتابیں بنا کر شائع کر دیا۔ جب میں نے فریاد کی تو انہوں نے کہا کہ مصنف صاحب آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ آپ ایک کتاب کے مصنف بننا چاہتے تھے اور میں نے آپ کو تین کتابوں کا مصنف بنا دیا۔ پتہ چلا کہ اُنہوں نے اپنے تعلقات کی بناء پر بلوچستان کی یونیورسٹی اور تمام تعلیمی اداروں اور سرکاری شعبوں کو وہ کتابیں بیچ کر بڑا مال کمایا اور مصنف کو مبلغ ساٹھ کتابوں کا اِک بنڈل لیکن ہم لوگ انصاف نہیں کرتے۔ تصویر کا ایک ہی رخ ہمارے سامنے رہتا ہے اور اسی وجہ سے ''مظلوم'' مصنف رائے عامہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج تک کسی ناشر یا پبلشر کی طرف الزامات کا جواب مبسوط طرح سے سامنے نہیں آیا جس میں الزامات کی نفی کر کے اصلی صورتِ حال کا شافی احاطہ کیا گیا ہو۔ پبلشر اور ناشر کی حالت ہماری زبان بند فوج جیسی ہے۔ فوج پر کیسے کیسے الزامات لگتے ہیں۔ سیاستدان، دانشور اور اہل رائے حضرات دلائل و براہان کی ننگی تلواریں لے کر گونگی فوج پر پل پڑتے ہیں۔ مگر باسٹھ تریسٹھ سال میں تعلقاتِ عامہ کا شعبہ رکھنے کے باوجود فوج نے اپنی صفائی میں کبھی قدم نہیں اُٹھایا۔ پبلشرز اور ناشرز کے گنگ رہنے کی دو تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اولاً لکھنے پڑھنے اور اظہار و ابلاغ سے یہ حضرات دُور بھاگتے ہیں۔ جواب دینے پر اپنے خلاف ادبی محاذ کھلنے سے گھبراتے ہیں۔ ثانیاً ''متاثرین'' کی باتیں حق اور سچ ہوتی ہیں اور حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اور ثالثاً وہ دانشوروں کی آہ و فغاں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں علم ہوتا ہے کہ اِس نوحہ خواں نے اِک دن پھر اُن کے پاس آنا ہے...... ملک مقبول احمد بڑے ذہین و فطین ناشر اور صاحبِ دماغ، صاحب قلم ہیں۔ اُنہوں نے ناشر اور ادیب کے اِس ازلی جھگڑے کی بڑی دانشورانہ وضاحت کی ہے اور غیر محسوس انداز میں تصویر کے دوسرے رُخ کی چند جھلکیاں

بھی پیش کی ہیں۔

''اہلِ قلم کے خطوط'' تقریباً ایک سو پینتیس مشاہیر اَدب کے خطوط پر مشتمل پانچ سو ستاسٹھ صفحات کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں انتہائی نامور اور جانے پہچانے اہلِ قلم میں تو بے نام اور گمنام لوگ بھی ہیں۔ ملک مقبول صاحب کی یہ کتاب شور مچاتی اور واویلا کرتی ادیبوں کی آوازوں کو ایک مسکت جواب بھی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو اِس قدر مہذب انداز میں آج تک کوئی ناشر انجام نہیں دے سکا۔ ملک صاحب نے اُس روائتی جھگڑے کی مستند اور مدلل تاریخ کو اِک نیا چہرہ دے دیا ہے جو ادیب اور ناشر کے درمیان اِک مدت سے چلا آرہا ہے۔ پیش لفظ کی چند سطروں کے سوا ملک صاحب اتنی ضخیم کتاب میں ذاتی رائے کا جھنڈا اُٹھائے کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ مجھے سعادت حسن منٹو کا وہ بیان یاد آرہا ہے جو انہوں نے اپنے خلاف قائم فحش نگاری کے کسی مقدمے میں عدالت میں دیا تھا جس کا مفہوم کچھ ایسا تھا کہ ''میری مثال اُس خاکروب کی سی ہے جو لوگوں کی اپنی گندگی اُٹھا کر اُن کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ میں اِسی معاشرے کی تصویریں من وعن جب لوگوں کو دکھاتا ہوں تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔'' تھوڑی سی قطع و برید اور جمع تفریق کے ساتھ ملک مقبول صاحب بھی خود کچھ نہیں بولے۔ مشاہیر اَدب اپنے ذاتی رویّوں میں جو کچھ ہیں، انہی کی تحریروں سے اپنے قاری کے سامنے اُن کو لا کھڑا کیا ہے اور اِس طرح گویا ملک صاحب نے شور مچاتے لوگوں کے سامنے یہ شعر پڑھ دیا ہے۔ ؎

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

ملک مقبول صاحب نے دیباچے میں ادیبوں کے روّیوں کو ''فطری شان'' قرار دیا ہے۔

آیئے اِس فطری شان کے حوالے سے ماضی میں چلتے ہیں۔ مرزا غالب اُردو ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ خوشہ چینوں اور تجزیہ کاروں نے غالبؔ کو دوہری شخصیت کا دانشور قرار دیا ہے۔ ایک وہ غالبؔ جو ایک شاندار پنڈال میں کھڑا ایک بڑے مجمعے کے سامنے زرق برق لباس زیب تن کئے اپنے شعر سُنا رہا ہے۔ شوکتِ لفظی روایت شکنی، مشکل تراکیب کا خوبصورت استعمال اور نازک خیال آرائی۔ اِردگرد کے حالات سے بے خبر نواب نوشہ نیرو جیسی بنسری بجاتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں غمِ ذات اور فلسفہءِ حیات و ممات کے مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ مگر یہی غالبؔ جب مکتوبات پر اُترتا ہے تو اُس کا قلم خون کے آنسو بہاتا ہوا ملتا ہے۔ اُس نے اپنے اردگرد خون میں ڈوبی ہوئی کائنات کے جزئیات کا نوحہ لکھا ہے۔ خطوط میں اِک اور ہی غالبؔ ہے جو بین کرتا ہے اور لُٹی پٹی دلّی کی دردناک تصویر کشی کرتا ہے اور دراصل یہی غالبؔ کی ''فطری شان'' ہے۔ میرا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اگر غالب کو یہ علم ہوتا کہ اُس کے مکتوبات ایک دن ایک بڑا ادبی سرمایہ بن جائیں گے تو شائد اُس کے ہاں وہ بے تکلف اور بیساختہ ماحول نہ بن سکتا جو آج ان مکتوبات کو اِک ممتاز مقام دے رہا ہے۔ غالبؔ ایک اونچے پلیٹ فارم سے مکتوب الیہ سے مخاطب ہوتا۔ ہر فقرے میں بنت کی اک شعوری کوشش نظر آتی اور غالبؔ پھر وہی مشکل پسند، انائیت پرست اور محبوب کے دامن کو حریفانہ کھینچنے کا دعویٰ دار بن بیٹھتا۔ تشکیک و بے اعتباری کے سارے اسلوب خطوط میں ملتے۔ ملک صاحب نے چپکے چپکے اور چوری چوری معروف اہل قلم دانشوروں کو ڈِسکوَر (DISCOVER) کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان فاضل حضرات نے ملک مقبول صاحب کو خط لکھتے وقت یہ تصور میں بھی نہیں سوچا ہوگا، کہ یہ خط ایک دن اشاعتِ عام سے آراستہ ہو کر ادبی تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ جیسے مجھے اپنے دو انتہائی ذاتی قسم کے مکتوب دیکھ کر اچنبا ہوا اور ''رنگے ہاتھوں پکڑے جانے'' کا شرمندہ سا احساس ہوا۔ بڑے ناموں

میں تو اپنے اِن مکتوبات کو دیکھ کر کھلبلی سی مچ گئی ہوگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ سنگ زنی کی بارش سے بچنے کیلئے ملک صاحب نے مستعد انتظامات بھی کر رکھے ہونگے۔

عمومی طور پر ناشر ایک انتہائی مصروف شخص ہوتا ہے۔ اُس کی دکان مسوّدوں، کچی تحریروں، کمپوز شدہ (کتابت شدہ) مسوّدوں وغیرہ سے اس طرح اٹی پڑی ہوتی ہے کہ اگر ناشر کو اُن کاغذوں میں سے کچھ ڈھونڈنا پڑے تو اِک عام ناظر پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح سے مطلوبہ چیز نکال پائے گا۔ پھر پبلشر اِک کاروباری شخص ہوتا ہے۔ ایک طرف اُس نے اپنی روزی روٹی کی فراخی کیلئے کوشش کرنی ہوتی ہے تو دوسری طرف اُسے اپنے ہمعصر کاروباری اداروں سے مسابقت کا مرحلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ پبلشروں کے ہاں تو کئی دفعہ مسکین اور نو آموز لکھاریوں کے پورے پورے مسوّدے گم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ناشر اُس متاثرہ ادیب کو مسوّدے کی دوسری کاپی لانے کی فرمائش کر دیتا ہے۔ او ادیب اتنا ہی کہہ پاتا ہے۔ ؎

کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر

ملک مقبول احمد ایک نیک نام، ایماندار اور انتہائی اصول پرست آدمی ہیں۔ ہر لکھاری کیلئے مقبول اکیڈمی سے اپنی کتاب چھپوانا اِک سہانا سپنا ہے۔ پروپرائیٹر کی حیثیت سے ملک صاحب کو سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی ہوگی مگر حیرت سی حیرت ہے کہ عدیم الفرصتی کے باوجود انہوں نے نہ جانے کب سے لوگوں کے خطوط کو اتنی توجہ سے سنیت سنیت کر رکھا ہوا تھا۔ چونکہ خطوط کی ترتیب مکتوب نگاروں کے تہجی ناموں کے ساتھ منسلک کی گئی ہے، اِس لئے سن کے اعتبار سے خطوط کی قدامت کا اندازہ تو نہیں ہوسکتا لیکن خطوط کی تاریخوں پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اپنا تعین تو ہو جاتا ہے کہ کم از کم بیس، بائیس سال سے ملک صاحب نے خطوط کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا۔ یہ کتنا مشکل کام ہے۔

اِن خطوط میں اکثر معروف ادیبوں کی زبان بڑی خشک اور کاروباری سی لگتی ہے۔اُن کے وہ میٹھے بول، انسانیت پرستی کے شبنمی اعلامئے، نفئی، ذات کے دعوے اور زبان و بیان کی مدھر چاشنی کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔''اہل قلم کے خطوط'' پڑھنے کے بعد ایماندارانہ رائے ہے کہ مجھے پبلشر حضرات سے ہمدردی سی ہوگئی ہے۔

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

سہ ماہی ادبِ معلیٰ

☆......☆......☆

عبدالقیوم

مکان نمبر R-856 محلہ عیدگاہ

نزد وقاص/وقار جنرل سٹور اٹک شہر

محترم ملک مقبول احمد

السلام علیکم!

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔آپ کی ضخیم کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' بمع نصف درجن دینی کتابچے (بالخصوص ''پیغمبر اسلام'' میں حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کے بارے میں تلخیص شدہ، لیکن مخصوص اہم ترین واقعات کو جس خوبصورتی سے سمیٹا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے۔آمین) رجسٹرڈ پوسٹ سے ارسال فرمائے، اس کے لئے میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں۔

کتاب 12 اکتوبر 2009ء سہ پہر ملنے کے بعد مطالعہ شروع کیا اور وقفے وقفے سے رنگا رنگ مواد کے حامل خطوط پڑھ کر 15 اکتوبر بعد سہ پہر ختم کر ڈالی۔ان خطوط میں شاید سب سے پرانا خط پچاس سال پہلے کا ہے یعنی قمر نقوی صاحب کا صفحہ 379 پر، تاریخ وسن 3 دسمبر 1959ء درج ہے۔سبحان اللہ! یہ بلاشبہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے نصف صدی پرانا خط بھی سنبھال کر رکھا۔یہ آپ نے اچھا کیا کہ ''اہل قلم کے خطوط'' میں اپنی سوانح حیات کے حوالے سے متعلقہ خطوط کے علاوہ دیگر پرانے خطوط بھی اس مجموعے میں شامل کر لیے۔

ویسے تو خطوط لکھنے والے کے جذبات، خیالات و احساسات کا عکس ہوتے ہیں۔لیکن ان میں مخاطب شخصیت کے بارے میں صاحبِ مکتوب کے دل و دماغ میں

منفی ومثبت خود ساختہ دلائل وآراء کی وجہ سے اظہارِ خیال اسے دوطرفہ معاملہ بنا دیتا ہے جس میں دونوں کے کردار کی جھلکیاں اور شخصیت کے زیر و بم پڑھنے والوں کو حیران و پریشان بھی کرتے ہیں، خوشی کے جذبات واحساسات سے بھی نوازتے ہیں، غصے اور ناپسندیدگی کی لہروں کے بہاؤ میں بھی دھکیلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اگر ہم ''اہل قلم کے خطوط'' میں سے انسانی فکر وعمل، جذبات، احساسات و خیالات کو سمیٹنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جناب ملک مقبول احمد نے مختلف طبائع کے حامل افراد سے نمٹنے میں کامیاب رہے۔ حالانکہ ان کے جواباً خطوط مجموعے میں شامل نہیں، لیکن ان کی مصروفیات وقت اور حالات کی کسوٹی پر پورا اترنے کی وجہ سے وہ کامیابی کی منازل طے کرتے گئے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہر قسم کے اہل قلم اور دوستوں اور مخالفوں سے معاملات کو الجھانے کی بجائے سلجھانے میں سرخرو ٹھہرے۔ ورنہ مشمولا خطوط میں جذبات کا اُبال، تشکر کے احساسات، غصے کی حامل طعن آمیز سطور، تعریف سے لبریز نرم وسُبک لفظوں کی مالا، شکایت آمیز تیز وتند جذبات وخیالات کی پرتپش لُو کے جھونکے، احسان مندی کی مٹھاس سے مملو شیریں الفاظ، توقع پر پورا نہ اترنے پر کہیں آپے سے باہر ہوتے ہوتے، ضبط کا دامن تھامنے کی واضح جھلکیاں ہیں، اشاعت میں تاخیر پر ہلکے پھلکے تنقیدی جذبات کا اظہار اور حسبِ منشاء کتاب کی اشاعت میں تاخیر کی تلافی کی استدعا اور اُمید...... غرض ان خطوط میں انسانی فطرت کے اتنے ان گنت، مختلف النوع اور رنگا رنگ پہلو آشکار ملتے ہیں کہ اگر کسی ذہنی اور جذباتی طور پر غیر متوازن شخصیت (اور وہ بھی ایک ناشر!) کو ایسے خطوط سے نوازا جاتا تو وہ انہیں پھاڑ کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتا۔ لیکن حوصلہ دیکھیئے جناب ملک مقبول احمد کا کہ انہوں نے ہر قسم کے توصیفی اور تنقیدی اور طعن وتشنیع سے لبریز خطوط کو

جوں کا توں کتاب میں شامل کر کے بالواسطہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ صبر و استقامت، بلند حوصلگی، دیانتداری، دوسروں کے نقطہ نظر کو برداشت کرنا اور خود کو حتی المقدور اپنے پیشے کی صالح اور صحیح اقدار کے مطابق ڈھال کر صراط مستقیم پر چلتے چلے جانا، بالآخر عزت افزائی کا سبب بنتا ہے۔ یوں سرخرو ہونے کیلئے قوتِ برداشت، تحمل و بردباری، انصاف پسندی، شکایات کا مداوا احسن طریقے سے کرنے کے بعد ہی کوئی شخص ''ملک مقبول احمد'' بن سکتا ہے، ورنہ بد دیانتی، حقوق غصب کرنا اور دوسروں کو دھوکا دینے والا اس ''عزت وتوقیر'' کا حقدار نہیں ٹھہرتا، جس کے حقدار ملک صاحب اشاعت کی دنیا میں سمجھے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں شاید یہ تجویز بے جا نہ ہو کہ ڈھیروں خطوط پر تاریخ و سن موجود نہ ہونے کی وجہ سے ذہن کو جھٹکے سے لگتے ہیں۔ گزارش ہے کہ کوئی ایسا خط جس پر تاریخ و سن موجود نہ ہو یا صرف تاریخ درج ہو، جیسا کہ زیادہ تر خطوط پر ہے۔ تو اس صورت میں خط کے آخر میں کہیں کونے پر ادارہ یا خود ملک صاحب تاریخ و سن لکھ دیا کریں۔ مثلاً کسی خط پر تاریخ و سن نہیں تو آخر میں موصولہ تاریخ و سن یوں لکھ دیں۔

(10 دسمبر 2003ء کو وصول پایا)

میں ایک بار پھر گراں قدر مجموعہ ''اہل قلم کے خطوط'' ارسال کرنے کی عزت افزائی پر آپ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ دعا گو ہوں کہ باری تعالیٰ مقبول اکیڈمی کو سدا قائم رکھے تاکہ علم و ادب کی رِدّا تار تار کرنے والے ناشروں کو کچھ تو شرم آئے!!

مخلص

عبدالقیوم

اہل قلم کے خطوط

ملک مقبول احمد کو اس سے پہلے ایک کامیاب اور باصلاحیت ناشر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا لیکن ان کی پہلی تصنیف ''سفر جاری ہے'' کی اشاعت کے بعد وہ ایک بالکل نئے سفر پر گامزن ہو چکے ہیں۔ پہلے کتابیں شائع کرتے تھے۔اب کتابیں تصنیف کرتے ہیں اور اس شعبے میں بھی اتنے ہی کامیاب ہیں جتنے کہ بطور ناشر مشہور اور کامیاب تھے۔اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' انہوں نے اپنے خاندان کی اگلی نسل کے بچوں کے لیے لکھی تھی مگر وہ ایک انمول اور کامیاب ادبی تصنیف ثابت ہوئی۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کے دیباچے میں لکھا تھا اور آج بھی ان کا یہی کہنا ہے کہ وہ ادیب نہیں ہیں۔ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتے ہیں۔لیکن یہ ان کی طبعی منکسر مزاجی کا ایک اظہار ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی پہلی تصنیف کی تحریر میں جو سادگی، پرکاری، تاثر اور گہرائی تھی اور انہوں نے اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر پیشہ وارانہ جدوجہد کو برمحل اشعار سے سجا کر جس انداز میں بیان کیا ہے وہ کسی بھی اہل قلم کے لیے توصیف اور تعریف کی مستحق ہے۔اس آپ بیتی کے ذریعے اردو ادب کو ایک نیا لکھنے والا دستیاب ہوا ہے نہ صرف ملک مقبول احمد نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا ہے بلکہ قارئین نے بھی اک صاحب قلم کو تلاش کر لیا ہے۔

زیر نظر کتاب ان خطوط پر مشتمل ہے۔ جو ذاتی طور پر مختلف شعبہ ہائے زندگی کے افراد نے انہیں وقتاً فوقتاً کسی پیشہ وارانہ ضرورت یا محض جذبات کے اظہار کے لیے تحریر کیے

ہیں۔ معروف اور مستند ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور اہل قلم حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد کے خطوط اس کتاب میں اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے معروف اور نامور اصحاب و خواتین کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا حرف اوّل معروف نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے اور حرف آخر کہنہ مشق ادیب شاعر اور نقاد ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیا ہے۔ گویا کتاب اوّل سے آخر تک ڈاکٹروں کے زیر معائنہ رہی ہے۔ 567ء صفحات کی اس خوبصورت کتاب کا سرورق ایس یعقوب نے موضوع کے مطابق خوبصورتی سے بنایا ہے۔ کتابت و طباعت اور پیشکش کے بارے میں کچھ لکھنا بے معنی ہوگا کیونکہ اس ادارے نے اس سلسلے میں پہلے ہی اپنا لوہا منوالیا ہے۔ یہ کتاب باذوق قارئین کے لیے ایک تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے مطالعے سے نہ صرف مختلف افراد کی آراء اور خیالات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ خود ملک مقبول احمد کی شخصیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔

ہفت روزہ ''فیملی'' لاہور

8۔ اگست 2010ء

☆☆☆

شفیع ہمدم
گلی نمبر 1 مکان نمبر 17
نیو مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

اہل قلم کے خطوط۔ایک مطالعہ

ملک مقبول احمد مُلک کے ممتاز ناشروں کی پہلی صف میں نمایاں مقام پر کھڑے ہیں انہیں اتنی بڑی کامیابی دو چار برسوں میں نہیں نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے میں حاصل ہوئی ہے۔اس مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں بھاگتے لمحوں کے چلتے آروں کے راستوں سے گزرنا پڑا۔ بار بار ناکامیوں کا سامنا کرنے کے وہ اس درجہ عادی ہو گئے تھے کہ ''رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج'' والی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ بالآخر کامیابی کی دیوی انہیں اپنے درشن دینے پر مجبور ہوگئی۔ وہ جواں ہمت بھی ہیں اور مدبر بھی۔ نامساعد حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو اپنے حکمت عملی کے ناخنوں سے سلجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نامور پبلشر تو پہلے ہی تھے۔آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' لکھ کر ادیبوں کی صف میں بھی اپنے لیے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ان کی زندگی کے نشیب وفراز جاننے کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ یہ آپ بیتی اتنی آسان اور رواں زبان میں تحریر کی گئی ہے کہ اَدب کا ایک عام سا قاری بھی اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

پچھلے سال ''سفر جاری ہے'' میری پیشانی خیال پر افشاں بکھیر رہی تھی امسال ''اہل قلم کے خطوط'' میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں ایک سو چونتیس خطوط

ہیں۔ یہ تمام خطوط ملک صاحب کو ایک ناشر کی حیثیت سے ارسال کیے گئے ہیں۔ ان کا دورانیہ 1959ء سے 2009ء تک ہے۔ اتنے پرانے خطوط کو سنبھال کر رکھنا ان کی احتیاط پسندی اور دور اندیشی کی دلیل ہے۔ شاید ان کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ خطوط طباعت کے مراحل سے گزر کر قارئین کے زیر مطالعہ آئیں گے۔ اہل قلم کے خطوط میں جہاں اختر جمال، ادا جعفری، مشفق خواجہ، انیس ناگی، مرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا ڈاکٹر انور سدید، عبدالعزیز خالد، پروفیسر جمیل آذر، اے حمید، اظہر جاوید، پرتو روہیلہ، جوگندر پال، حاجرہ مسرور، حفیظ تائب، رضیہ فصیح احمد، شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر وحید قریشی، محشر بدایونی، غلام الثقلین نقوی، ڈاکٹر سلیم اختر، عذرا اصغر اور غلام جیلانی برق جیسے نامور قلم کار شامل ہیں وہاں مجھ جیسا گمنام ادیب بھی موجود ہے۔ اس کتاب میں اہل قلم کے خطوط نام کی حروف تہجی ترتیب سے پیش کیے ہیں۔ چنانچہ محمود ایاز، بندہ اور بندہ نواز ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ خطوط کا یہ پہلا گلدستہ ہے جو اہل قلم نے ایک ناشر کو پیش کیا ہے۔ ادیب اور ناشر کے درمیان خالص کاروباری نوعیت کا تعلق ہوتا ہے مگر ملک صاحب ایک ایسے پبلشر ہیں جن سے قلم کار کاروباری امور کے علاوہ اپنے دل کی بات بھی بلا تامل کہہ دیتے ہیں چنانچہ ان خطوط کے دریچوں سے ان کے بطون میں جھانکنے اور ان کی نفسیات کو سمجھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ یہ خطوط ان کی دوست داری، ملنساری، خوش اخلاقی، کرم فرمائی، بامروتی اور وضع داری کے مختلف گوشے ہائی لائٹ کرتے ہیں جو انہیں دوسرے پبلشروں سے منفک اور ممیز کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبا انہیں پبلشر سے زیادہ دوست اور بھائی سمجھتے ہیں۔ ان کے حسن اخلاق، وضع داری اور بامروتی کے بارے میں لکھے گئے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے چنانچہ ان سب کا حوالہ دینا ممکن نہیں تاہم چند خطوط کے اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں جن کی

روشنی میں ملک صاحب کی ثابت قدمی نیک نیتی، جوہر شناسی اور علم دوستی جیسے اوصاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک سچے کھرے اور محنتی انسان ہیں۔ مقبول اکیڈمی کو اس مقام پر لانے کے لیے انہوں نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے۔ وہ مصائب و آلام کے تپتے ہوئے صحرا سے گزر کر اس سرسبز و شاداب وادی میں پہنچے ہیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صحرا کی تپش سے گھبرا کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کو ترجیح دیتا یا پھر پاؤں توڑ کر کسی درخت کے نیچے بیٹھ رہتا۔ ان اقتباسات کو دیکھئے جن کو پڑھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک پبلشر کو تحریر کیے گئے ہیں۔ ماہنامہ تخلیق کا مدیر اور نامور شاعر اور ادیب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

اظہر جاوید: ''ایک چیز ہوتی ہے دوستی۔ ایک کرم فرمائی۔ آپ مسلسل دوسرا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دوستی بھی برحق ہے لیکن آپ احسان بھی کرتے ہیں۔

تاج سعید: ''کراچی میں حمید کاشمیری سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی آپ کی بے حد تعریف کی ایسے دوستوں کے کہنے پر ہم مزید کیا اضافہ کر سکتے ہیں۔''

ضیا شبنمی: ''ابھی ابھی ٹیلی فون پر برادرم انور سدید سے وصل صوتی ہوا۔ انہوں نے آپ کی اس قدر تعریف کی کہ میں یہ سطور لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ تشنۂ اَدب و محبت آدمی ہوں شعر و ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔''

ظفر تاج: ''محترم یہ سب کچھ آپ کی نیک نیتی، ثابت قدمی، عفو و درگزر، ایمان قلبی، طہارت بدنی، قوت ایمانی اور فیض روحانی کے طفیل ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی وجوہات کی بنا پر اپنے خاص بندوں کو نوازتا ہے۔''

عنبرین تبسم شاکر: ''آپ ایک سچے کھرے اور محنتی انسان ہیں۔ آپ کی سوانح پڑھ کر میں نے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی اور زندگی نام ہے جہدِ مسلسل اور عمل پیہم کا۔''

کنول عاصم: آپ بیک وقت پبلشر، ادیب، صوفی، جوہر شناس اور علم دوست ہیں۔''

بعض خطوط میں خوگر توصیف کی طرف سے کتاب کے جلد شائع نہ ہونے پر ہلکی پھلکی شکایات بھی موجود ہیں مگر ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔

ملک صاحب اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے صحت کی طرف کم توجہ دینے کی بنا پر مختلف قسم کی بیماریوں کے نرغے میں گھر گئے تو ان کی جسمانی توانائی گھٹنے اور وزن بڑھنے لگا۔ قابل ڈاکٹروں کے علاج کے باوجود جب کوئی خاطر خواہ آفاقہ نہ ہوا تو ان کے بیٹے ڈاکٹر ظفر نے سٹیم باتھ کا مشورہ دیا تو انہوں نے ''نیا علم شفا بخشی'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتاب کے مطابق اپنا علاج شروع کر دیا۔ ہپ باتھ اور سٹیم باتھ کے ذریعے جسم سے فاسد مادوں کا اخراج ہونے لگا تو ان کا بڑھتا ہوا وزن کم ہونے لگا اور جسمانی توانائی میں اضافے کا عمل شروع ہو گیا۔ پانی کے علاج سے وہ حیرت انگیز طور پر سِلم اور سمارٹ ہو گئے۔ وہ اس علاج کا مشورہ اپنے دوستوں کو بھی دینے لگے اور اپنی سوانح میں اس علاج کے فوائد کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ لوگوں کی توجہ اس علاج کی طرف مبذول ہوئی اور بہت سے ادیبوں نے اس سے استفادہ کیا۔ صرف دو خطوط کے پیراگراف درج کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''آپ نے جو طریقِ علاج لکھا ہے میں نے اس پر عمل کیا تو حیرت ہوئی کہ میرا معدہ بہت کام کرنے لگا۔ بھوک تیز ہو گئی۔ پہلے اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی۔

اب میں کسی سہارے کے بغیر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ پہلے دس قدم چل کر سانس پھول جاتا تھا اب میں دو فرلانگ آسانی سے چل لیتا ہوں۔''

انیس یعقوب:

''نیا علم شافی کا جب مکمل طور پر قائل ہو گیا تو میرے اندر کا مبلغ بیدار رہا۔ میں نے پورے جوش اور ولولے سے دوست ، احباب اور عزیزوں کو اپنے ''نو دریافت شدہ'' علاج کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔''

اہل قلم کے خطوط میں سب سے زیادہ خطوط ملک صاحب کی آپ بیتی کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں ان میں سے چند اہم خطوط کے اقتباسات پیش خدمت ہیں

احمد زین الدین:

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' ارسال کی جو موصول ہو گئی ہے۔ بے حد خوبصورت اور پر از معلومات کتاب ہے۔ جس میں آپ کی عملی زندگی کی ''کٹھنائیوں اور سفر حجاج اقدس کا موثر احوال پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں اس پر ضرور لکھوں گا۔''

اے حمید:

''سفر جاری ہے اس اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ آج تک بڑے بڑے ناشروں نے دوسروں کی کتابیں چھاپی ہیں لیکن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اپنی کتاب لکھ کر کسی نے نہیں چھاپی۔ یہ کام آپ نے کر دکھایا ہے۔''

بانو قدسیہ:

''آپ کی کتاب سفر جاری ہے مجھ تک پہنچی۔ ابھی آنکھیں خراب اور صحت ٹھیک نہیں پذیرائی کا فلیپ ضرور لکھوں گی لیکن اس کا مسودہ نہیں پہنچا۔''

جان کاشمیری:

''سفر جاری ہے موصول ہوئی جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ آپ بیتی ایک ایسے انسان کی ہے جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔ اس کو منزل کی طرف نشان خود لگانا پڑا ہے۔ شاید اس کو ہی ''سیلف میڈ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔''

جوگندر پال:

''خوش رہیے! آپ کا خط ملا ہے اور خود نوشت بھی شکریہ۔ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ آپ نے واقعی بہت عمدہ آپ بیتی لکھی ہے۔ تبصرہ حاضر کر رہا ہوں۔ مطلع کر سکیں تو میرا اطمینان ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر وزیر آغا:

''آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی کتاب سفر جاری ہے کا ایک نسخہ عطا کیا ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بھجوا رہا ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت رہیں۔''

ایک پبلشر کو لکھی گئی تحریریں عام طور پر عام فہم، کومل اور سبک اندام نہیں ہوتیں۔ وہ سراپا کاروباری لین دین جیسے خشک معاملات پر مبنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کے مطالعہ سے نہ دل کو فرحت ملتی ہے نہ ذہن کو بالیدگی اور نظر کو کشادگی حاصل ہوتی ہے اس کے برعکس اہل قلم کے خطوط میں ایسی بھی بہت سی تحریریں موجود ہیں جو تخلیقی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ اس لیے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

اظہر جاوید:

''بڑھاپے کے ساتھ ساتھ بے ترتیبی بڑھتی جا رہی ہے۔ وقت گرفت ہی میں نہیں آتا۔ پھر جب آپ ہوتے ہیں تو میں نہیں پہنچ پاتا۔ جب میں پہنچ سکتا ہوں آپ

نہیں ہوتے۔ دعاؤں اور وفاؤں کا سلسلہ قائم ہے۔ رب کریم آپ کو بے حد و حساب برکتیں دیں آمین۔''

امین راحت چغتائی:

در موسم زمستاں ، جاناں در چیز باید
یا روئے آفتابے یا روبہ آفتابے

اتفاق ہے کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔ لہٰذا آپ اتفاق کریں گے کہ مصرع ثانی کے جزو ثانی پر اکتفاہی مناسب ہے۔''

افتخار امام صدیقی:

اچھی اور منفرد جمالیاتی سطح پر بھی سنوری کتاب میری سب سے بڑی کمزوری ہے اندرونی صفحات کی خوشبو مجھے مسحور کر دیتی ہے اور میں گھنٹوں اسے نتارتا رہتا ہوں۔''

ریحانہ قمر:

آپ پبلشر سے رائٹر بھی بن گئے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے۔ رائٹروں کی کتابیں چھاپتے چھاپتے آپ کے اندر کا ادیب کامیاب رہا۔ جس کا بہت دیر کے بعد پتہ چلا۔''

ملک صاحب رائٹرز کو اپنے قبیلے کے افراد سمجھتے ہیں۔ ان سے محبت کرتے ہیں چنانچہ تخلیق کار بھی ان سے محبت کرتے ہیں اور اپنی پریشانیوں میں انہیں شریک کر کے اپنے دل کا بوجھ اتار کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر پبلشر پس پردہ چلا جاتا ہے۔ دوست اور بھائی سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن:

''میں پچھلے دنوں ایک بڑے حادثے سے گزرا اور ایک مستقل خلا اور احساس

محرومی کے ساتھ کراچی سے واپس آیا۔آپ سے دعاؤں کا طالب ہوں۔"

رفیع اللہ شہاب:

"امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں بھی اگرچہ خیریت سے ہوں اور لکھنے پڑھنے کا کام معمول کے مطابق کر رہا ہوں لیکن اعصابی بیماری کی وجہ سے چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔اس لیے کافی عرصہ سے حاضر خدمت نہیں ہوسکا۔"

رئیس الدین رئیس:

"سیدھے ہاتھ میں فریکچر آ گیا ہے۔تکلیف زیادہ ہے۔خط بھی بہت مشکل سے لکھ رہا ہوں۔"

اہل قلم کے خطوط میں جہاں اپنی پریشانیوں اور بیماریوں کا ذکر ہے وہاں ملک صاحب کی غمی خوشی میں شرکت کے خطوط بھی موجود ہیں۔ڈاکے اور دیگر پریشانیوں کے خطوط کے علاوہ ان کی خوشیوں میں شمولیت کے نامے بھی کتاب میں موجود ہیں۔ عید مبارک، ملک صاحب کے بیٹے کی شادی اور پوتے کی ولادت پر لکھے گئے چند خطوط کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ محشر بدایونی عید کی آمد پر لکھتے ہیں۔

"عید کی آمد آمد ہے۔عید کے موقع پر اپنوں کی یاد کچھ زیادہ ہی آتی ہے۔بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں اور عید کی "مبارک باد" کا ہدیہ پیش کروں۔ عید کے سعید موقع پر میرا ہدیہ تبرک قبول ہو۔"

سید واجد رضوی ملک صاحب کی طرف سے شادی کا دعوت نامہ موصول ہونے پر مبارک باد کا خط لکھتے ہوئے متعدد الجھنوں کے باعث شادی میں شرکت نہ کرنے پر معذرت کا اظہار کرتے ہیں۔دولہا اور دلہن کو دعائیں بھی دیتے ہیں۔

برخوردار ڈاکٹر ظفر مقبول کی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا بہت

بہت شکریہ۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

''یہاں متعدد الجھنوں کے باعث میں حاضر نہیں ہوسکوں گا لیکن میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دولہا اور دلہن کو ہمیشہ خوش اور آباد رکھے اور آپ کا سایہ ان کے سر پر تادیر قائم رہے۔ انشاءاللہ پھر کبھی آکر بالمشافہ بھی مبارک باد پیش کروں گا۔''

ان کے پوتے کی پیدائش کے پرمسرت موقع پر مرزا ادیب اپنے جذبات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کے باغ میں ایک نہایت خوبصورت پھول مسکراہٹیں بکھیرنے لگا ہے۔ اللہ کرے یہ پھول سینکڑوں سال مسکراتا رہے۔ ظفر بیٹے نے سعادت مندی کا ثبوت دے کر باپ بننے پر مٹھائی کھلائی ہے۔ آخر اپنے مقبول کا بیٹا ہے۔ سعادت مندی اور مروت تو اس کے ریشے ریشے میں ہوگی۔''

مندرجہ بالا اقتباسات جو اس مضمون میں درج کیے گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ خطوط ایک پبلشر کو تحریر کیے گئے ہیں۔ کاروباری امور کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے یہ نجی قسم کے خطوط معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں اہل قلم نے اپنی ناکامیوں اور کامرانیوں، پریشانیوں اور خوشیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ بیرونی ممالک کے حالات اور واقعات سے بھی آگاہ کیا ہے اور وہاں کے موسموں کی جانکاری بھی دی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے روزمرہ واقعات کو بھی خطوط کے ذریعے ان تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قمر نقوی صاحب فورٹ ورتھ، ڈنشن اور ڈلس سے مشاعرے پڑھ کر تین روز کے بعد لوٹے تو انہوں نے ملک صاحب کو اس بارے میں مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

قمر نقوی:

''میں آج ڈلس سے تین روز بعد مشاعروں میں شرکت کر کے واپس آیا۔ فورٹ ورتھ ڈنشن اور ڈلس میں تین روز متواتر مشاعرے ہوئے۔ جن میں ہزار ڈیڑھ ہزار سامعین کے مجمعے تو ہو ہی گئے۔ میں الحمد اللہ سر فہرست رہتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ گھر میں بچوں کو سلام و دعا۔''

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے۔ خطوط کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں اہل قلم نے کاروباری امور سے ہٹ کر بھی خطوط تحریر کیے ہیں۔ اس سے پہلے اردو ادب میں خطوط کی اس قسم کی کتاب موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے ملک صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنے پرانے خطوط نہ صرف سنبھال کر رکھے بلکہ انہیں دیدہ زیب کاغذی پیرہن بھی پہنایا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ نئے لکھنے والے ادیبوں کی نا شرکو خطوط لکھنے میں رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے گا اور انہیں اہل قلم کے حالات سے بھی آگاہ کرے گا۔

شفیع ہمدم

محیط اسماعیل

'اہلِ قلم کے خطوط' یا دستاویزی ثبوت!

[محیطیہ املا میں]

کتاب در کتاب کی مثال یں اُردو ادب کی تاریخ میں شمار بہ انگشت سے زاید نھیں، حال ھی میں ایک نادر و تازہ مثال سامنے آی ھے: مقبول اکادمی (لاھور) کے ملک مقبول احمد (صاحبِ سعادتِ حج) نے اپنی ناشرانہ سرگزشت 'سفر جاری ھے' پیش کی جس میں کم عمری سے بال سفیدی تک کے جہاں دیدہ وحمیدہ واقعاتِ چیدہ چیدہ نیز اپنے تجربات و مشاھدات میں پیش آمدہ نشیب و فراز کے بیاں سے کتاب کو سرفراز کیا ھے اس میں شامل دو تین تبصرے اور چند نامے اس بات کے ضامن تھے کہ "بس اب اور کتاب نھیں آے گی" دیکھتے ھی دیکھتے ایک وسیع حلقۂ احباب نے 'سفر جاری ھے' کو اس قدر پسند کیا کہ قریباً سو (۱۰۰) لکھاری وں کے قلم حرکت میں آگیے اور اس درجہ پزیرای ھوی کہ "مواد" کسی عنوان ایک اور کتاب کے معرضِ وجود میں لاے جانے کا متقاضی ھوا، موصوف آپ ناشر تو تھے ھی، توقع سے بیش حوصلہ افزای پاکر دوسری کتاب بہ عنوان 'پزیرای' چھاپ دی: اس کتاب کی انفرادیت یھ ھے کہ ملک صاحب نے ہر تحریر سے قبل اُس ادیب کا تعارف (مع رنگیں تصویر) صفحے بھر کا التزام رکھا جو بہ ذاتِ خود ایک دستاویزی تصنیف و تالیف کی حیثیت اختیار کر گیی..

اس کتاب کو بھی ھات وں ھات لیا گیا، اب ملک صاحب کو نیی شرارت سوجھی! کہ کیوں نہ اہلِ قلم کے خطوط کو کتابی صورت دی جاے! ھمارے معاشرے میں شعرا اُدبا کو

(بہ وجوہ) اہمیت نہیں دی جاتی، اس کے الرغم ملک مقبول صاحب کے دل میں اہلِ قلم برادری کے لیے بڑی جگھ تھی چناں چہ آغازِ کاربارھی سے شاعر ادیب وں کے خطوط اپنے دولت کدے پر غالباً کسی آہنی تجوری میں سنبھال رکھے تھے، دفتر سے گھر تک ڈاک منتقلی کا حفاظتی انداز کچھ ایسا رہا ہوگا کہ وارداتی وں کو شبہ ہوا اور ایک روز ڈاکا پڑ گیا...... بڑی تجوری سے نقدی چھوٹی تجوری سے ردی برآمد ہوی یعنی 'اہلِ قلم کے خطوط' ڈاکو محقق تو تھے نہیں کہ خطوط کی قیمت کا اندازہ کرتے، فقط نقدی وزیورات لے گیے۔ اللہ کا شکر کہ افرادِ خانہ محفوظ رہے تاہم فطری امر تھا کہ سب کو برس وں کی کمای لٹ جانے کا افسوس ہوا، لیکن ملک صاحب 'اہلِ قلم کے خطوط' کے بچ رہنے پر شاد و مطمین تھے، حضرات! قرارِ واقعی اس پس منظر میں کتاب زیرِ تبصرہ کو ملاحظہ فرمایں تو یقیناً آپ کے نزدیک اس کی قدر و منزلت بڑھ جاے گی اور یوں ہر خط کا ایک ایک لفظ موتی سے کم نہ معلوم ہوگا۔

درآمد شدہ کاغذ پر ۵٦٧ صفحات کی اس اعلا جلد بند معیاری کتاب میں ۱۱۳۵ اہلِ قلم کے خطوط (بعض کے پانچ پانچ چھے چھے دس دس کسی کے اٹھارہ تک) شامل ہیں سرورق موضوع سے نزدیک تر، عینک، تحریری کاغذ، دوات اور پر.. تحریری کاغذ کے پسِ گوشہ ملک صاحب کا نصف چہرا دکھاتی ایک انچ تصویر جناب کی حقیقی عکاس ہے کہ ہم سرگزشت میں مصنف اور متذکرہ ادیب وں کا پورا چہرا نہیں دیکھ پاتے کیوں کہ موصوف نے اپنے قلم کی روشنای میں لحاظ و مروت کی آمیزش سے روشنی ڈالی ہے، اس کے برعکس 'اہلِ قلم کے خطوط' میں ایسے خط بھی شامل ہوگیے ہیں جو شایع نہ ہوتے تو بعض مکتوب نگاراں کا بھرم رہ جاتا، مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ معاشی مجبوری اور انسانی کم زوری سے شاعر ادیب بھی مستثنا نہیں، نیز ان کے خوشامدانہ حربے آشکار کرتے ہیں کہ اپنے مفاد کے لیے ناشر کو شکار کیسے کیا جاتا ہے! سچ ہے: سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں، حتا کہ انتساب کا سودا ہوتا ہے، مطلوبہ وصولی اشاعت سے قبل نہ ہونے پر دوسرے سے معاملہ کر کے اُس کا نام دے دیا جاتا

ھے، درست کہاوت ھے: نام بڑے درشن چھوٹے! ایسے میں ناشروں کا رویہ ''جیسے کو تیسا''
ھو تو کیا تعجب! لیکن ملک مقبول صاحب نے کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پھُنچای، جبھی تو سیکڑوں
کتب کا ایک کام یاب ادارہ چلا رھے ھیں (واضح ھو ھماری کوی کتاب اس ادارے سے
شایع ھوی نہ آیندہ امید) ھمارا ایمان وایقان ھے انسان وں کی طرح روزِ محشر کتاب یں بھی
پیش ھوں گی: داد وفریاد کا یہ نظارہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھے گا...... پیش بندی کے طور پر ملک
صاحب نے اپنی کتاب 'اہلِ قلم کے خطوط' عہد حاضر کے ادبی منکر نکیر کے درمیاں رکھ دی
ھے.. منکر کی تحریر کا عنوان ھے: حرفِ اوّل، نکیر کا مضمون: حرفِ آخر، منکر نے سات سمندر
سات صفحات میں سمیٹ دیے ھیں، نکیر نے (بہ مقابلہ منکر) ۲۱ توپ وں کی سلامی دی ھے..
مذکورہ منکر نکیر اپنے اپنے گروہ کے نمایندہ رھے ھیں اور آپس میں خوب ''قلم کشی'' کی.. رسا
کشی کو یوں خاطر میں نہ لاے کہ اس میں لچک پای جاتی ھے مشہور ھے کہ ایک میان میں دو
تلواریں نھیں رہ سکتیں، ملک صاحب نے اس مقولے کو بدل ڈالا: اپنی کتاب کو دو تلواروں کے
درمیاں رکھ کے پسِ سرورق میں حرفِ اوّل اور حرفِ آخر کے اقتباس کو دو کالمی انداز میں دکھا
کے ثابت کر دیا کہ دو تلواریں ایک میان میں سما سکتی ھیں (بہ شرط کہ میان کا ظرف ملک مقبول
صاحب کے قلب کی طرح ھو) ماشاء اللہ ھمارے منکر ڈاکٹر سلیم اختر اور نکیر ڈاکٹر انور سدید دونو
کی اُردو ایسی ڈھلی ڈھلای ھے کہ نام ادل بدل بھی ھو جاتے تو پڑھنے والوں کو کچھ فرق نہ پڑتا..

ایسے میں کیا حرفِ اوّل کیا حرفِ آخر! یہ معجزہ ملک صاحب ھی کا حصہ ھے کہ دونو نے
ازرہِ کفایت شعاری ایک دوسرے کو ایک ایک حرف بھیجا، ورنہ اس سے قبل (دورانِ قلم کشی)
ایک دوسرے پر دو دو حرف بھیجتے رھے ھیں، اب کسی فارغ البال محقق کو چاھیے کہ معلوم کرے
حرفِ اوّل پر کیا گزری اور حرفِ آخر پر کیا نہ گزری!

کتاب زیر تبصرہ میں نیے ناشرین کے لیے عبرت کا عنصر بھی موجود ھے بہ شرط کہ حاصل
کرنا چاھیں! ملک صاحب نے مذکورہ کتب سے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ بعض لکھاری اگر
ناشر بن سکتے ھیں تو ناشر لکھاری کیوں نھیں بن سکتا؟

مشمولہ ایک خط کے مطابق ملک صاحب نے اپنی زمین وں کی سالانہ آمدن گاں وکی مسجد کے لیے وقف کر رکھی ھے، کاش ھمارے دیگر صاحبِ حیث یت ناشرین بھی اپنی فاضل رقم سے کسی گاں ویں زمیں خریدیں اور وھیں کسی مسجد کے نام کردیں جس میں بچوں کو دو ایک پہر مذہبی تعلیم اور دیگر سہولت یں دی جاسکیں!

ماہنامہ چشمۂ بیدار لاہور

اعتبار ساجد

ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لاہور

اہل قلم کے خطوط

کتابوں کی دنیا عجیب دنیا ہے۔ قارئین کہتے ہیں اچھی کتاب نہیں ملتی۔ مصنف کہتا ہے اچھی کتاب کوئی چھاپنے پر تیار نہیں ہوتا۔ پبلشر کا یہ کہنا ہے کہ مارکیٹ کو استحکام نہیں۔ جتنی کتاب پر لاگت آتی ہے وہ ٹکڑوں میں بٹ کر بھی واپس نہیں ملتی۔ دوسری طرف ہم جس بک شاپ کا رخ کریں وہاں الماریاں کتابوں سے کھچا کھچ بھری ملتی ہیں۔ کوئی گوشہ کوئی بک شیلف ایسا نہیں ملتا جہاں رنگ برنگے ٹائیٹلز پر مشتمل کتابوں کا انبوہِ کثیر نظر نہ آتا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب پبلشروں کے بقول مارکیٹ میں شدید قسم کا سلمپ آیا ہوا ہے تو کتابیں، اور اتنی زیادہ تعداد میں کتابیں کیسے چھپ رہی ہیں۔ اگر طلب نہیں تو رسد میں اتنی تیزی، شدت اور تواتر کیوں ہے؟ یہ سوال غالباً کئی ذہنوں میں آتا ہوگا۔

یہ سوال اپنی جگہ لیکن پبلشروں کا ایک بہت محدود، بہت مختصر سا طبقہ ایسا بھی ہے جو کاغذ کی گرانی، مارکیٹ کی زبوں حالی اور اشاعتی اخراجات کی فراوانی کے باوجود علم وادب کی شمعیں روشن کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب کی اشاعت کو بزنس نہیں، فروغِ علم کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہی چند لوگوں سے تھوڑا بہت اَدب کا ذوق اور احترام باقی ہے۔ ان محدود سے چند لوگوں میں مقبول اکیڈمی کے ملک مقبول احمد خاصی

نمایاں اور روشن مثال ہیں۔ ملک صاحب نے اپنے اشاعتی ادارے سے خالصتاً ان ادیبوں کی کتابیں شائع کیں جو ہمارے اَدب کا سرمایہ ہیں۔ انہوں نے ایسے نادر اور کارآمد موضوعات پر کتابیں لکھوائیں اور شائع کیں جو ایم اے، پی ایچ ڈی کی حوالہ جاتی کتب میں خاص اہمیت کی حامل ہیں اور اتنی کمیاب ہیں بلکہ نایاب ہیں کہ سوائے ملک صاحب کے ادارے کے اور کہیں سے مل نہیں پاتیں۔ ملک صاحب صرف پبلشر ہی نہیں بہت منجھے ہوئے راست گو ادیب بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' لکھ کر جہاں ملک اور بیرون ملک کے سینکڑوں دانشوروں سے داد پائی ہے وہاں نہایت نیک دِلی سے ان ادیبوں اور دانشوروں کے خیالات و جذبات کو ایک خوبصورت کتاب کی شکل بھی دے دی ہے جس کا نام ہے ''اہل قلم کے خطوط'' ان خطوط کو ان کے چاہنے والوں کی فقط تحسین ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان خطوط کے ذریعے ہمیں ادیبوں کے نفسیاتی مطالعہ کی سہولت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ لائق توجہ امر یہ ہے کہ ادیبوں کے اصلی خطوط کی نقول بھی شامل اشاعت کی گئی ہیں اور کسی لفظ کسی سطر کو قلم زد نہیں کیا گیا۔ ادیب و دانشور نے جو کچھ بھی لکھا، جیسا لکھا ملک مقبول احمد صاحب نے کمال دیانتداری سے اسے اسی طرح شائع کر دیا۔ ظاہر ہے ہر ادیب اور دانشور محض تعریف و توصیف ہی نہیں کرتا۔ وہ کتاب کے متن اور ادب کے قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ کتاب کا حرفِ اوّل ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے اور حرفِ آخر ڈاکٹر انور سدید نے۔ دونوں ہی معروف سکالر ہیں اور ادب کے اہم ترین نام ہیں۔ پھر یہ کہ ڈاکٹر ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ کتاب ہو یا انسان، ان کا معائنہ ڈاکٹروں سے بہتر کون کر سکتا ہے؟

حرف اول میں ڈاکٹر سلیم اختر وانی نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کچھ یوں آغاز کیا ہے:

''دروغ بر گردن راوی۔ تین دوست تھے۔ ایک بنا ادیب، دوسرا بک سیلر اور

تیسرا ناشر۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ادیب کے گھر سے غیر مطبوعہ مسودات کی منوں کے حساب سے ردّی نکلی، بک سیلر ایک شاندار کوٹھی چھوڑ گیا، جبکہ ناشر نے دو کوٹھیاں اور تین بیویاں چھوڑیں۔ آپ تین بیویوں کو اگر بر بنائے مبالغہ منفی بھی کر دیں تو کوٹھیوں والی بات پھر بھی غلط نہ ہوگی۔

مگر......ملک مقبول احمد ان خوش نصیبوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے پیچھے دو شاندار کوٹھیاں چھوڑ جائیں۔ ہاں ایسے لوگ اپنے نیک باطن کی خوشبو اپنے اخلاص کا عطر اور اس کتاب میں بے شمار نامور ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے خطوط شامل ہیں۔ ان کے ایڈریس اور فون نمبرز بھی درج ہیں۔ ایک طرح سے یہ ادب کے طالب علم کے لئے حصولِ علم کے حوالے سے رابطے کا ذریعہ بھی ہے اور ایک کو دوسرے سے ملانے کی سعی نیک بھی۔ بڑی جماعتوں کے طالب علم یا نوارد بساطِ ادب شعراء و ادباء لامحالہ مناسب رہنمائی اور اصلاح کے طالب ہوتے ہیں۔ انہیں رابطے میں اگر اس طرح سہولت مل جاتی ہے اور وہ ذہنی تشفی حاصل کرنے میں خاصی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں تو لامحالہ یہ نیکی ملک صاحب کے حصے میں جاتی ہے۔ اور ایسی نیکیاں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ یہ ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو سینہ در سینہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یہ کتاب طویل ضخامت کی حامل ہے۔ لیکن گٹ اپ ایسا خوبصورت اور دیدہ زیب ہے کہ 567 صفحات کی اس کتاب کو قارئین مسلسل اور بار بار پڑھنا چاہیں گے۔ ان خطوط کے حوالے سے حرفِ آخر میں ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ:

خط لکھنا انسان کی معاشرتی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں محنت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ سماجی کاروبار اور معاشرتی خبر رسانی میں

جب مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں جب تعلق داری کا عنصر اور اپنائیت پیدا ہوتی چلی جائے تو ایک عام خط بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ بلاشبہ خط لکھنے کے لئے صرف قلم اور کاغذ ہی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن زیادہ اہمیت مکتوب نگار کے ارادے کو ہے اور یہ ارادہ ہی واقعات کی بازیافت میں معاونت کرتا ہے۔''

......ڈاکٹر انور سدید کے ارشادات کی اہمیت سے کسے انکار ہے یا ہوسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''اہل قلم کے خطوط'' کی یکجائی کے تشنگانِ ادب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ اب یہ ادب پڑھنے، سمجھنے اور سیکھنے والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس گرانمایہ سہولتِ علم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جبکہ انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز کی بھرمار نے قاری کو کتاب سے دُور کر دیا ہے ایسی کتابیں آہستہ آہستہ انہیں اپنی طرف بلاتی ہیں۔ نہایت پیار بھرے میٹھے لہجے میں۔ ممکن ہے وہ دور لوٹ آئے جب لائبریریاں حصولِ علم کے متوالوں سے بھری رہتی تھیں اور بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اگر ایسی کتابیں، ایسے انمول ستارے تواتر سے جگمگاتے رہیں تو یقیناً وہ دن دور نہیں جب ہماری علمی درسگاہوں کی رونق لوٹ آئے گی اور ہمیں اقوامِ عالم کے درمیان اپنی شرحِ خواندگی کے اضافے پر فخر محسوس ہوگا......!

اعتبار ساجد

(''ریڈیو پاکستان'' لاہور کے نیشنل پروگرام ''ادب سرائے'' میں براڈکاسٹ ہوا)

ڈاکٹر صابر آفاقی
پوسٹ بکس نمبر 9، مظفر آباد کشمیر

اہل قلم کے خطوط۔۔۔ادب کی متاع گراں بہاء

ملک مقبول احمد لاہور کے کامیاب ناشر کتب ہی نہیں بلکہ ایک زیرک ادیب بھی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ان کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس سوانح پر جو تبصرے شائع ہوئے وہ ''پذیرائی'' کے نام پر آپ نے چھاپ دیئے ہیں۔ حال ہی میں ملک مقبول احمد نے اپنے نام آنے والے مشاہیر ادب کے خطوط ''اہل قلم کے خطوط'' کے نام شائع کیے ہیں۔ یہ خطوط بقول ملک صاحب ادب کی متاع گراں مایہ ہیں۔

ان خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اچھے ادب کا نمونہ ہیں۔ زیر نظر مجموعہ خطوط میں جو خطوط کاروباری سلسلے میں لکھے گئے۔ ان میں بھی ادب کی چاشنی موجود ہے۔ ان خطوط میں ایسا ادبی مواد موجود ہے جس سے ہمارے تعلیمی اداروں کے طلبہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب میں جن ادیبوں کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ادیب ایک مسلمہ ادیب ہے۔ جن کی تحریریں ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔

چند ایک اہل قلم کے نام یہاں دیے جاتے ہیں جو اس کتاب کی اہمیت اور وقار کو دوبالا کرتے ہیں۔ ادا جعفری، اظہر جاوید، انیس ناگی، اے حمید، پرتو روہیلہ، جوگندر پال، ہاجرہ مسرور، حفیظ تائب، رشید امجد، رضیہ فصیح احمد، رئیس احمد جعفری، سید ضمیر جعفری، سید قاسم محمود، شفیق الرحمان، انور سدید، تاج سعید، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر سلیم اختر،

غلام جیلانی برق، محشر بدایونی، مشفق خواجہ، مرزا ادیب، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک مقبول احمد صاحب نے ادیبوں کے یہ خطوط شائع کر کے ادب کے طالب علموں کے لیے ایک عمدہ مواد پیش کر دیا ہے اس لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆......☆......☆

اختر شمار
جامعہ عین شمس قاہرہ۔ مصر

گرامی قدر ملک صاحب

تسلیمات!

آپ نے ''اہل قلم کے خطوط'' عنایت فرمائی، بے حد شکریہ...... سرسری ورق گردانی ہی سے کتاب کے مندرجات نے متاثر کیا، حیرت ہوئی کہ آپ نے کیسے کیسے مشاہیر کے خطوط سنبھال رکھے تھے۔ ان خطوط کو یکجا کر کے اور نہایت خوبصورت گیٹ اپ میں کتابی صورت دے کر آپ نے واقعتاً کمال کیا ہے...... مصنفین کی طرف سے کسی ناشر کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل، شاید یہ پہلی باقاعدہ دستاویز ہے جس میں پبلشر اور مصنف کے تعلقات پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔

ان خطوط کے آئینے میں آپ کی ذات کے کئی گوشے نمایاں ہوئے ہیں...... ہمارے ہاں عموماً لکھنے والے اپنے پبلشر سے نالاں رہتے ہیں لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے، آپ کے اپنے مصنفین سے تعلقات خاصے خوشگوار نظر آتے ہیں آپ چونکہ اپنے تمام معاملات میں کھرے ہیں اسی لئے سبھی نے آپ کے حسن سلوک کی تعریف کی ہے......

خطوط، مشاہیر کے ہوں یا عام لوگوں کے، ان میں لوگوں کی باطنی کیفیات، رجحانات اور ذاتی احساسات و مسائل پر روشنی پڑتی ہے...... زیر نظر تصنیف میں شامل خطوط میں بھی ادیبوں کی کتابوں کے حوالے سے بعض اہم تاریخی اور دلچسپ معلومات

قاری کو متاثر کرتی ہیں...... ان خطوط میں مصنفین کے علاوہ آپ کے ذوقِ جمال، شفاف کاروباری لین دین اور کئی دیگر اوصاف نمایاں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ کتاب میں جہاں نئے لکھنے والوں کے خطوط شامل ہیں وہاں نامور مصنفین کی کہکشاں بھی دیکھی جا سکتی ہے، میرزا ادیب، ضمیر جعفری، ڈاکٹر وزیر آغا، بانو قدسیہ، جوگندر پال، ڈاکٹر وحید قریشی، عشرت رحمانی، شفیق الرحمان، عبد العزیز خالد، مولانا حامد علی خان، رفیع اللہ شہاب، حاجرہ مسرور، رئیس احمد جعفری، ادا جعفری، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر انور سدید جیسے کتنے ہی ممتاز اہل قلم کے خطوط، آپ نے یکجا کر دیئے ہیں۔ میں تو سوچتا تھا کہ فقط میں ہی آپ کی عنایات، محبتوں اور کرم فرمائیوں کا مقروض ہوں لیکن یہاں تو سبھی آپ کی محبت کے اسیر نکلے...... اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح شاد و آباد رکھے اور آپ یوں ہی لکھاریوں کے ماتھے کا جھومر بنے رہیں۔

پہلے دن سے آج تک آپ نے جس شفقت سے نوازا اس کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں......

دعاؤں میں یاد رکھیے......

والسلام...... خیر اندیش

اختر شمار

گلشن ادب

گمشدہ افسانے

ارمغان غزل

فہرست

گلشن ادب

گمشدہ افسانے

ارمغان غزل

پروفیسر جمیل آذر

گلشنِ ادب

ارمغانِ غزل کے بعد ملک مقبول احمد صاحب کی دوسری کتاب "گلشنِ ادب" بھی منصہ شہود پر آ گئی۔ یہ دونوں کتابیں دو ہزار دس عیسوی کے آخری مہینوں میں مطلع ادب پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک مقبول احمد نے اپنی سوانح عمری کا "سفر جاری ہے" نام رکھ کر ثابت کر دیا کہ ان کا سفر واقعی جاری ہے۔ ارمغان غزل اور گلشنِ ادب اس سفر کی منزلیں ہیں اور فی الحقیقت ان کی سوانح عمری کا بالواسطہ حصہ ہیں جو برنگ دیگر جلوہ گر ہوئی ہیں۔

گلشنِ ادب میں وہی ادبی تنقیدی مضامین شامل ہیں جو ان کے پندرہ روزہ ادبی میگزین "چودھویں صدی" کے بچے کھچے چند رسالوں میں محفوظ تھے۔ انہوں نے "چودھویں صدی" 1956ء میں لاہور سے جاری کیا تھا اور اس ادبی میگزین کا ادارتِ عظمےٰ حضرت احسان دانش کے سپرد کی ہوئی تھی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ تنقیدی مضامین اگرچہ پاکستان کی تخلیق کے آٹھ سال بعد اس رسالہ میں شائع ہوئے لیکن ان کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ یہ تنقیدی مضامین اردو تنقید کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گلشنِ ادب کو شائع کر کے ملک مقبول احمد نے اردو ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے۔ اس کتاب کو یقیناً ہر لائبریری، ہر یونیورسٹی اور کالج میں ہونا چاہیے تا کہ اردو سکالر جان سکیں کہ اردو تنقید کے ابتدائی نقوش

کیا تھے اور کیسے کیسے نابغہ لوگ اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان میں سے اب شاید ہی کوئی نقاد بقید حیات ہو۔ ان اہلِ قلم میں جو لوگ شامل ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:
احسان دانش، پروفیسر سجاد حارث، محمد یوسف زاہد، عثمان صدیقی ایم اے، اعجاز الرحمٰن ایم اے، رشید الدین صدیقی، اعجاز احسانی، پروفیسر رفیع انور، محمد یسٰین، میر عزیز الحق اور مرزا یگانہ لکھنوی، دو نقاد یا ادیب ایسے ہیں جنہوں نے اپنا نام نہیں لکھا۔ بس ''نقاد'' اور ''ظریف'' لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ ایک خاص بات جو اس زمانے میں اہلِ قلم میں بڑی عام تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ کوالیفیکیشن لکھنے کے بڑے شوقین تھے۔ مثلاً شبلی بی۔ کام، کرشن چندر ایم اے، عثمان صدیقی ایم اے وغیرہ۔ جیسا کہ آج کل پروفیسر اور ڈاکٹر لکھا جاتا ہے۔ اب آہستہ آہستہ پروفیسر لکھنا ختم ہو رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر خاص طور پر لکھا جاتا ہے۔ جب میں ارمغانِ غزل پر تبصرہ کر رہا تھا، تو میں نے اپنے ایک کالج کے کولیگ کو صرف اس لیے پہچان لیا کہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نیاز عرفان ایم اے لکھا ہوا تھا وہ چونکہ بقید حیات بھی ہیں جب میں نے انہیں ارمغان غزل اور چودھویں صدی کے حوالے سے ان کی غزل کے بارے میں بتایا تو وہ بے حد خوش ہوا کیونکہ اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو شاعر کے حوالے سے اپنی پہچان نہیں کروائی تھی۔ بس وہ تو صرف فلسفے کے پروفیسر تھے اور یہی ان کی پہچان تھی۔ مندرجہ بالا ادیبوں کی فہرست میں، میں بھی احسان دانش صاحب کے علاوہ کسی اور کو نہیں پہچانتا ان حضرات کے تحریر کردہ مضامین بعض بہت عمدہ اور گراں قدر ہیں اور بعض کمزور لیکن ان کی مخلصانہ کاوش کو ہم کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

گلشنِ ادب میں ابتدائی تین مضامین، احسان دانش صاحب کے ہیں۔ ان کا پہلا مضمون ''تاریخ کے تنقیدی تقاضے'' ہیں۔ انہوں نے ان مصنفین کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جو

فن تاریخ نویسی سے ناواقف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تاریخ اس لیے لکھتے ہیں جس سے
انہیں مالی اور دنیاوی مفاد حاصل ہوں۔ یہ بادشاہوں کے جاہ وجلال،شہزادوں کے طمطراق،
سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی تقریبات،تفریحات،وزراءوسفراء کی سازشوں اور عیاریوں
کے قصیدوں کے تیرانداز ہیں۔ لالچی اور خودغرض ہیں۔تاریخ لکھنا مشکل فن ہے۔اس میں
خلوص وصداقت ہونا چاہیے اور معروضی انداز اسلوب اختیار کرنا چاہئے۔ بقول احسان دانش
''تاریخ کی تحریروں کے مطابق کبھی واقعات پیش نہیں آتے بلکہ واقعات کے وجود میں کچھ
چیزیں ہوتی ہیں۔جن سے واقعات نتائج کے طور پر جنم لیتے ہیں'' آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ
ہر واقعہ تاریخ بننے کے قابل نہیں ہوتا۔صرف وہی واقعہ تاریخ میں جگہ پانے کا مستحق ہے.جس
کے بطن سے نتائج جنم لیتے ہیں۔ وہ ان تمام مورخین کی مذمت کرتے ہیں جو تاریخ کو افسانہ بنا
ڈالتے ہیں۔ان کی حیثیت تیسرے درجہ کے افسانہ نگار سے زیادہ نہیں۔ ہمارا آج کا مورخ تو
کھڑکی سے سر نکال کر یہ بھی نہیں دیکھتا کہ وہ جولکھ رہا ہے کیا وہ تاریخ کے زبانی ومکانی تقاضوں
کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔احسان دانش صاحب واضح طور پر کہتے ہیں کہ''موجودہ تاریخ سے
بدرجہا بہتر تو ہمارا ادب ہے،اس میں ہمیں معلومہ زمانے کے تمدن ومعاشرت کے خدوخال
صحیح طور پر ملتے ہیں'' مجھے یہاں سرفلپ سڈنیSir Philip Sidney یاد آرہے ہیں۔
جنہوں نے شاعری کو تاریخ پر فوقیت دی ہے انہوں نے اپنی کتاب "Apology For
Poetry" جو 1595ء میں شائع ہوئی تھی۔شاعری کی اخلاقیات،خلوص،صداقت اور
سنجیدگی کے حوالہ سے سائنس،تاریخ اور فلسفہ پر فوقیت دے کر شاعری کا بھرپور دفاع کیا تھا۔
احسان دانش کا اگلا مضمون ''دوست اور کتاب'' کے عنوان سے ہے۔جس میں انہوں نے
نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک ''تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔میں یہاں ڈاکٹر انور سدید صاحب سے
اتفاق کرتا ہوں کہ اس مضمون میں انشائی خدوخال نظر آتے ہیں۔اس مضمون کی ابتدا ہی

انشائی جملے سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''میری نظر میں کتاب اور عورت ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ جب میں رات کے دو یا تین بجے کتاب تکیے کے نیچے سے نکال کر سینہ پر رکھ کر پڑھنے لگتا ہوں تو وہ اپنی بساط کے مطابق لطف اندوز کرنے میں بخل نہیں کرتی۔ اس وقت وہ عورت سے کہیں زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔ جس طرح انہوں نے کتاب کے بارے میں انشائی (تخلیقی) انداز اختیار کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے دوست کے بارے میں بھی یہی اسلوب برتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''جیسے پیغمبروں پر آسمانی یا الہامی کتب نازل ہوتی ہیں بالکل اسی طرح خدا نیک اور صالح لوگوں کو نیک سیرت اور بلند کردار دوست عطا فرماتا ہے۔

تاہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی کہ احسان دانش میں انشائیہ نگار کے طور پر ابھرنے کے تمام جوہر موجود تھے لیکن چونکہ اس وقت انشائیہ نگای کی تحریک کا اس طرح آغاز نہیں ہوا تھا۔ جس طرح دس سال بعد ساٹھ کی دہائی میں شروع ہوا تھا۔ یہ مضمون دلچسپ بھی ہے اور معنی آفرین بھی۔

احسان دانش صاحب کا تیسرا مضمون ''محاورہ کا مسئلہ'' ہے۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد محبوب الرحمان وامق کو طویل خط لکھا یہ طویل خط مقالہ کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ مقالہ محاورہ اور روزمرہ کے باریک فرق کو سمجھنے میں نہایت کارآمد ہے۔ انہوں نے محاورہ اور روزمرہ کو شاعری اور کہانیوں کے توسط سے بڑی عمدگی سے ذہن نشین کر دیا ہے اور ادب کے طالب علم کے لیے یہ مضمون نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

پروفیسر سجاد حارث کے دو مضامین قدیم اردو شاعری سیاسی آئینہ خانہ میں اور سماج کی تعمیر میں ادیب کا حصہ فکر انگیز ہیں۔ محمد یوسف زاہد نے اپنے ایک مضمون

''مسجد قرطبہ'' کا بھرپور فنی جائزہ پیش کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کی یہ نظم فلسفہ زمان و مکاں کیحوالے سے اور عشق کی کرشمہ سازی کے معجزہ کے پس منظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ عشق، خلوص، محنت اور لگن ایسے عناصر ہیں جو تخلیق کو دوام بخشتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

محمد یوسف زاہد کا اگلا مضمون، ادب کی نئی اور پرانی قدریں بھی ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ وہی ادب پائیدار ہوتا ہے جو وقتی اور عارضی عصری تقاضوں سے بلند ہوتا ہے۔ تاہم محمد یوسف زاہد کی اس بات میں بڑا وزن ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت شعر و ادب کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں جن کا صحیح مطالعہ ''ہر دور کی معاشرتی، اقتصادی، سماجی، سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔''

عثمان صدیقی ایم۔اے نے اپنے مضمون ''تنقید اور اس کا مقام'' میں ادب میں تنقید کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ادب کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ''اعلیٰ ادب وہی ہے کہ جو انسان کے علم میں اضافہ کرے۔ اس کے لیے باعث تسکین و خوشی دل و دماغ میں ایک استرازی کیفیت پیدا کر دے اور انسان کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرائے'' وہ تنقید کو ادب کے لیے تعمیری کردار کے حق میں ہیں۔ ''اصولی طور پر تنقید کا کام تعمیری ہے تخریبی نہیں۔ ہمدردانہ ہے معاندانہ نہیں، نقاد کا منصب یہ نہیں کہ وہ مصنف کی حرف عیب جوئی اور نکتہ چینی کرے۔ دراصل اس کا کام مصنف کو ہمدردانہ طریقہ سے اس کی تخلیق کے مصائب سے آشنا کرنا ہے تاکہ وہ ان خامیوں کو دور کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے محاسن کو بھی اجاگر کرنا ہے تاکہ مصنف کی ہمت افزائی ہو اور اسے مسرت حاصل ہو۔'' عثمان صدیقی صاحب کا دوسرا مضمون ''اقبال کی غزل'' کے عنوان سے ہے۔ ابتداء میں اقبال داغ کی غزل کے رنگ میں

شعر کہتے تھے لیکن بعد میں اقبال کی غزل کا اپنا علیحدہ تشخص ابھرا۔ جس نے غزل کیفرسودہ عشقیہ شاعری کی کایا پلٹ دی۔ اقبال کی غزل میں اب جام حسن و عشق کے برعکس کائنات، انسانی اور کائنات میں انسان کے کردار کا فلسفیانہ اور مفکرانہ طور پر اجاگر ہونے لگا۔ عقل و عشق کا فلسفہ غزل میں بھرپور انداز میں جلوہ گر ہوا:

بے خطر کود پڑا، آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اعجاز الرحمٰن ایم۔ اے کے اس کتاب میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ یوں انہوں نے ''چودھویں صدی'' میں سب سے زیادہ مضامین پیش کیے۔ ان مضامین میں ''اردو قصیدہ......ایک مطالعہ''، ''بہادر شاہ ظفر کی طبیعت کے چند رنگ''، ''پطرس کی مزاح نگاری پر ایک نظر'' اور ''میر حسن کا فنی شعور''، ''عبدالماجد دریابادی اور فلسفیانہ نثر'' ۔ یہ تمام مضامین فکر انگیز اور دلچسپ ہیں لیکن افسوس اعجاز الرحمٰن سے بہت کم ادیب واقف ہیں۔ یہ تمام کریڈٹ ملک مقبول احمد کو جاتا ہے۔ انہیں ''چودھویں صدی'' کے تاریک گوشوں سے نکال کر کتاب کے منور اوراق میں لے آئے۔

رشید الدین صدیقی نے ''کنہیا لال کپور کی شخصیت کو طنز و مزاح کے حوالہ سے برتا ہے۔ یہ مضمون بھی بہت عمدہ ہے۔ دیگر فاضل مقالہ نگاروں میں اعجاز احسان نے ''قابل کی غزل'' پر محمد یوسف زاہد نے ''اقبال کی منظریہ شاعری''، پروفیسر رفیع انور نے ''ابوالکلام اور اردو ادب پر'' محمد یسٰین نے ''انگریزی ڈرامے کا ارتقاء'' پر اپنے فرضی نام ''نقاد'' نے مقدمہ شعر و شاعری اور محمد احسن فاروقی '' پر اسی طرح ایک اور صاحب نے اپنے فرضی نام ظریف سے ''امن عامہ کی تعمیر میں گالی کا حصہ'' میر عزیز الحق نے ''علی اختر حیدر آبادی پر اور مرزا یگانہ لکھنوی نے '' آیاتِ وجدانی پر بڑی عرق ریزی،، خلوص اور یگانگت

کے ساتھ بڑے خیال انگیز اور دلچسپ مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔ ان مضامین کی افادیت آ جبھی برقرار ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے بالکل درست فرمایا ہے کہ انہوں نے ان ادباء کو ''حیات نو'' عطا کر دی ہے۔ ادبی دنیا کو یقیناً ملک مقبول احمد صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اس کتاب کا ''خیر مقدم'' کھلے بازوؤں اور کشادہ جبیں سے کرنا چاہئے۔

☆☆☆

سعید بدر

''گلشنِ ادب'' کا جائزہ

''گلشن ادب'' میں ایم اے ملک نے ادبی مضامین کو یکجا کر کے خوبصورت کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ جو آج سے 55 سال قبل پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' میں طبع ہوئے تھے۔ ''چودھویں صدی'' کا پہلا پرچہ یکم جنوری 1956ء کو زیر طباعت سے آراستہ ہوا اور منصۂ شہود پر آیا۔ جس پر ایڈیٹر کا نام ایم اے ملک چھپا۔ یہ دراصل مقبول احمد ملک کے اصل نام کا مخفف تھا جبکہ اس کے ادبی نگران، ملک کے نامور ادیب اور ممتاز شاعر جناب احسان دانش تھے۔ احسان دانش کے ادبی اور تنقیدی مضامین نے اسے چار چاند لگا دیئے۔ مزیں براں ان کی وجہ سے نامور ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کا تعاون بھی حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ ان بلند پایہ حضرات میں رئیس احمد جعفری، قمر نقوی، اے حمید اور محمد احسان الحق سلیمانی شامل تھے۔ چند ہی اشاعتوں کے بعد ''چودھویں صدی'' کو ملک کے معروف ادبی پرچوں میں بلند مقام حاصل ہو گیا۔ اس کے مضامین نظم و نثر ملک کے دوسرے وقیع ادبی رسالوں میں حوالہ دیئے بغیر چھپنے لگے۔ چار سال تک یہ پرچہ باقاعدگی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ لیکن ملک صاحب کی کوششوں کے باوجود یہ مالی طور پر خود کفیل اور مسلسل خسارے سے دوچار رہا۔ مقبول احمد ملک لکھتے ہیں کہ پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' کی بندش پر قلمی معاونین نے سخت احتجاج کیا اور اسے جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ مگر اس کے خریداروں کی تعداد روز افزوں تھی۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' بڑے شہروں کے بک اسٹالوں پر کثرت سے فروخت ہوتا تھا لیکن بدقسمتی سے ایجنٹ حضرات نے ادبی رسالے کو ادائیگی کرنے کی روایت کو فروغ نہ دیا اور یہ صورت حال اب بھی قائم ہے۔ ادبی رسالے میں لکھنے

والے ہی اس کے قارئین ہوتے ہیں۔ ایڈیٹر کا شوق ادبی رسالے کی اشاعت کا ضامن ہے۔ یہاں یہ لکھنا مناسب ہے کہ ایڈیٹر کے نام مضمون نگاروں کے تعریفی توصیفی خطوط اس کی ''انا'' کو تسکین فراہم کرتے ہیں اور ادب شناسی حکومتوں کی غفلت اور عدم تعاون کے باوجود ''ادب کا چراغ'' جلتا رہتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ جب مالی خسارہ برداشت سے تجاوز کرنے لگا تو رسالہ شائع کرنے کا میرا ذوق وشوق ماند پڑ گیا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ میں نے ''چودھویں صدی'' سے ذاتی شہرت حاصل کرنے کی خواہش وابستہ نہ کی تھی بلکہ میں نے تو ایم اے ملک کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ یہ میرا ہی نام ہے''۔ اس کے باوجود مسلسل مالی خسارہ کی وجہ سے چار سال بعد ملک پبلشر و ایڈیٹر مقبول احمد صاحب کو یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔

زیرِ نظر کتاب ''گلشنِ ادب'' میں شامل مضامین ''چودھویں صدی'' کے صرف ایک سال کے رسائل میں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے باقی جلدیں ملک صاحب کو دستیاب نہیں ہو سکیں جو دسترس زمانہ سے ناپید ہو گئیں۔

گلشنِ ادب میں احسان دانش کے تین اہم ادبی مضامین شامل ہیں جن کے عنوانات، ''تاریخ کے تنقیدی تقاضے''، ''دوست اور کتاب'' اور ''محاورہ کا مسئلہ'' شامل ہیں، ان کے بعد پروفیسر سجاد حارث کے دو مضامین ہیں جن میں ایک ''قدیم اُردو شاعری سیاسی آئینہ خانہ'' کے عنوان سے ہے جبکہ دوسرا ''سماج کی تعمیر میں ادب کا حصہ'' ہے۔ کنہیا لال کپور نامور ادیب تھے۔ جو مذہباً ہندو تھے۔ ان کے بارے میں رشید الدین صدیقی کی گراں قدر تحریر موجود ہے۔ اس میں دیکھتے ہیں کہ کتاب کے مقابلہ نگاروں میں جناب احسان دانش اور پروفیسر سجاد حارث تو اُردو ادب کی نامور شخصیات میں شامل ہیں لیکن ان کے مقابلے میں جناب عثمان صدیقی، میاں اعجاز الرحمٰن، محمد یوسف زاہد، رشید الدین صدیقی، میر عزیز الحق، اعجاز احسانی اور محمد یٰسین نئے لکھاری ہیں۔ جو صرف پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' میں نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین خیال انگیز اور فکر افروز ہیں لیکن زمانہ حال یا ماضی قریب کے

معروف ادبی رسائل میں وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ البتہ اگر رسالہ ''چودھویں صدی'' علم و ادب کے آسمان پر درخشندہ وتاباں رہتا تو اُفق ادب پر نئے نئے ادیبوں اور نئے شعراء کی رنگارنگ کہکشاں ضرور نمودار ہوتی لیکن بدقسمتی ہے کہ پرچہ بند ہونے سے ''یہ کہکشانِ ادب'' نہ وسعت حاصل کر سکی اور نہ دوام ہی پا سکی۔

پروفیسر جمیل آذر اور ڈاکٹر انور سدید کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے کہ جن کے ایماء و ترغیب پر ملک مقبول احمد صاحب نے ادباء کے مضامین کی اشاعت کا اہتمام کر کے ان کی ''تجدید نو'' کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ ان کو ''گوشۂ گمنامی'' سے نکال کر پھر سے زندہ وتابندہ کر دیا ہے۔ توقع ہے کہ ملک صاحب کی اس کاوش کا بھی پہلے کی طرح ادبی حلقوں اور قارئین کی طرف سے پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ زیر نظر کتاب میں شامل مضامین اس قدر اہمیت وافادیت کے حامل ہیں کہ ان کے مطالعہ ہی سے ان کی قدر وقیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پچاس کی دہائی میں اُدیبوں اور مضامین نگاروں کے خیالات، اور رجحانات کیا تھے۔ ان کی فکر کے زاویے کیا تھے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پچاس سال گزر جانے کے بعد اس سوچ اور انداز فکر میں کیا تبدیلی آئی ہے۔

بہرکیف ہم ملک مقبول احمد صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے پچاس برس پرانے ادبی مضامین سے قارئین کو روشناس کرایا ہے اور گراں قدر مضامین کو فائلوں سے نکال کر کتابی صورت میں اہل ذوق وشوق کے مطالعہ کے لئے پیش کر دیا ہے۔

المعروف بہ سعید بدر

''البدر'' 965۔ نظام بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

042-35414590,0321-4872700

☆☆☆

علی سفیان آفاقی

گلشنِ اَدب

اس مجموعے کے مرتب ملک مقبول احمد بھی ایک منفرد شخصیت ہیں۔ لوگ انہیں ناشر سمجھتے تھے لیکن وہ چھپے رستم نکلے۔ انہوں نے 2007ء میں اپنی خودنوشت شائع کی اور اس میں جو ماجرا بیان کیا اس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی اس کی سچائی اور صاف گوئی ہے۔ ایک گاؤں سے چل کر ایک نوعمر لڑکا جس نے چند جماعتوں سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، جب لاہور آیا تو اس نے کئی کاروبار کیے۔ چھوٹے موٹے کام کیے۔ بڑی مشکلات برداشت کیں اور بالآخر کتب کا ناشر بننے کا فیصلہ کیا اور ملک کے ممتاز ترین ادارے کا مالک بن گیا مگر کس طرح؟ یہ داستان ان کی خودنوشت میں تفصیل سے درج ہے۔

ملک صاحب ایک منکسر المزاج اور عاجزانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ خوش اخلاقی اور وضع داری بھی ایسی آجکل خال خال ہی نظر آتی ہے۔ جس سے جس نوعیت کے مراسم استوار کر لیے۔ زندگی بھر نبھائے۔ ان کی خودنوشت دلچسپ اور معلومات افزاء ہونے کے علاوہ تحریر کا بھی ایک ایسا نمونہ پیش کیا۔ جس کی توقع کسی بہت تجربہ کار اور کہنہ مشق لکھنے والے سے ہی کی جا سکتی ہے۔ نہ جانے وہ اپنی یہ خوبی کہاں چھپائے بیٹھے تھے۔ تحریر کی روانی، اسلوب کی ندامت اور سادگی، موقعہ بہ موقعہ برمحل اشعار کا استعمال اور زبان ایسی کہ اہل زبان بھی دانتوں میں زبان دبا کر بیٹھ گئے۔ ملک صاحب کی زندگی ایک جہد مسلسل، وارفتگی اور شوق کی فراوانی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے یہ خودنوشت شائع کر کے اہل ادب کو چونکا دیا۔

یہ سب کچھ ان کی کاروباری سوجھ بوجھ، گہرے مطالعے، شدید مشقت اور صاحب علم حضرات سے ملاقاتوں کا نتیجہ ہے، اوراس بات کا عملی ثبوت ہے کہ

محنت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

اس کتاب کی پذیرائی نے ایسا چسکا لگایا کہ اب تک ملک مقبول احمد آٹھ کے قریب مطبوعات پیش کر چکے ہیں اور مزید کے لیے کمر بستہ ہیں۔ اللہ انہیں لمبی عمر، صحت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بہت سے لوگوں کو زیر نظر کتاب کے ذریعے علم ہوا کہ ملک صاحب 1956ء میں ایک معیاری ادبی جریدہ ''چودھویں صدی'' نکال چکے ہیں۔ جس کے مدیر احسان دانش تھے۔ مدیر کے نام سے جریدے کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس جریدے کے لیے انہوں نے ملک کے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کیا اور معیاری نظم ونثر حاصل کیے۔ یہ ادبی جریدہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکا لیکن اس میں شائع ہونے والی تحریریں آج بھی زندہ ہیں۔ انہوں نے اب اس جریدے میں شائع ہونے والے مضامین کا انتخاب شائع کرنے کا آغاز کیا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں احسان دانش، رشید الدین صدیقی، میاں اعجاز الرحمٰن، پروفیسر رفیع انور، مرزا یگانہ چنگیزی اور دیگر معروف شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ کیجیے۔ تاریخ کے تنقیدی تقاضے، محاورے کا مسئلہ، مسجد قرطبہ، ادب کی نئی اور پرانی قدریں، اردو قصیدہ، کنہیا لال کپور شخصیت کے آئینے میں، ابوالکلام اور اردو ادب، آیات وجدانی، عبدالماجد دریا آبادی اور فلسفیانہ نثر، انگریزی ڈرامے کا ارتقاء، و دیگر مضامین سے اس مجموعے کے مندرجات اوران کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جریدہ ''چودھویں صدی'' تو بند ہو چکا ہے مگر ملک مقبول احمد اس قسم کے مجموعوں کے ذریعے انہیں ازسرنو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سرورق دلکش اور معنی خیز ہے۔

ہفت روزہ ''فیملی'' 26 دسمبر 2010 تا 01 جنوری 2011

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد
گوشۂ محققین ننکانہ صاحب

گلشن ادب

ملک مقبول احمد صاحب نے بحوالہ ''سفر جاری ہے'' (خودنوشت سوانح ملک مقبول احمد)
میں مقبول اکیڈمی کی بنیاد رکھی تو ان کے گرد آہستہ آہستہ اہل علم اور اہل قلم جمع ہوتے گئے۔ اجتماع روز بروز ''تبلیغی اجتماع'' کی طرح بڑھتا گیا۔ یہ سب مخلص تھے یہ سب ہنر مند تھے۔ یہ سب دوست تھے۔ یہ سب اپنے اپنے سے تھے۔ یہ سب معزز تھے۔ یہ سب مکرم تھے۔ یہ سب محترم تھے۔ مخلصانِ انیس ومحبانِ جلیس کا مجمع آج بھی ملک صاحب کے اردگرد قائم ہے۔ کیا یہ ایسے ہی وقوع پذیر ہو گیا؟ ہرگز نہیں! اس میں ملک مقبول احمد صاحب کی مقناطیسی شخصیت اور طاقتور نورانی (روحانی) ہالہ (Aura) کے حامل ذات کا بڑا عمل دخل ہے۔

کہاں پہ بھلا اس کا امکان ہے؟
محبت بنا حُبّ کا امکان ہے!
جواب محبت، محبت ہے ہوتا!
محبت تعلقات کی جان ہے

ملک مقبول احمد صاحب خود سراپا محبت ہیں۔ مجسّم اُلفت ہیں سرتاپا اُنس ہی اُنس ہیں۔ صبح ومَسا گداز ہی گداز ہیں۔ مسکراہٹ ہی مسکراہٹ ہیں، چاہت ہی چاہت ہیں۔ ملک صاحب کو اس پر افسوس ہے کہ ان کی مجھ سے محبت دس سال قبل کیوں نہ ہوئی۔ مجھے اس

پرحسرت ہے کہ میری آپ سے قربت دس سال پہلے کیوں نہ ہوئی۔ مگر میں اب بھی ملک صاحب سے محبتیں، شفقتیں، مسکراہٹیں، چاہتیں زیادہ سے زیادہ سمیٹ رہا ہوں کہ آپ ان وافر عنایات الٰہیہ اور عطایات کریمہ کے خزینہ دار ہیں اور بزبان حال پکار رہے ہیں۔

دنیا والو! مل کے ہم سے دل ہمارا دیکھنا
ہم سمندر ہیں کنارے سے ہمیں کیا دیکھنا

ملک مقبول احمد سے پہلی ملاقات بہت مختصر ہوئی صرف چائے کی ایک پیالی پر، پھر سفر جاری ہے۔ آپ سے مجھے متعارف کروایا پھر پذیرائی نے آپ کا مجھ سے تعارف کروایا پھر اہل قلم کے خطوط نے آپ کے کردار کی پرتیں ایک ایک کر کے کھولیں۔ پھر پیغمبر عالم ﷺ نے آپ کا باکمال اہل قلم ہونا متعارف کروایا پھر پانی سے علاج (Hydrotheropy) نے آپ کا حاذق طبیب ہونا ثابت کیا۔ پھر ارمغانِ غزل نے آپ کا ماہر مرتب و مؤلف و جامع ہونا ثابت کیا۔ پھر اب میرے مطالعہ کی میز پر موجود ہے۔ ”گلشن ادب“۔ یہ بھی آپ کی مہارت اور ذوق جمالیات کا منہ بولتا ثبوت ہے شکر ہے کہ مجھے ملک صاحب سے یہ کہنا پڑا:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذرِ مستی ایک دن

میں شکستہ قلم اور ژولیدہ فکر مکرمی ملک مقبول صاحب کی ہر تصنیف و تالیف پر ایک مبسوط تبصرہ لکھ کر حاضر ہوتا ہوں پہلے چند تبصروں کی حد تک تو ملک صاحب مجھے باقاعدہ ٹیلیفونک داد دیتے رہے۔ اب وہ فرماتے ہیں میں جانتا ہوں کہ آپ نے صرف تبصرہ نہیں کیا ہوگا بلکہ کتاب کا پوسٹ مارٹم کیا ہوگا اور تبصرہ لے کر دراز بامراد میں رکھ لیتے ہیں بلکہ آپ امید سے ہوتے ہیں۔ (غلط نہ سمجھئے گا) کہ شاہ صاحب آئیں گے تو پوسٹ مارٹمی تبصرہ ضرور لائیں گے۔ گویا ”میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں“

کی تصویر ہوتے ہیں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ملک صاحب میرے بارے میں ہمیشہ خوش گمانی کی امید سے رہیں اور میں ان کی نیک خواہشات کے مطابق ثابت ہوتا رہوں۔

هُوَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَان عَلَى اللّٰه مَا تَصِفُوْن۔

ملک صاحب کی نئی تالیف ''گلشن ادب'' کے نام سے کہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ تین چار سال کے دوران جاری رہنے والے ایک ادبی رسالے ''چودھویں صدی'' کی ایک بازیاب فائل (1957ء کے بارہ شماروں) کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہوگا۔ نہ یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے اندر نامور تخلیق کار اور جہان دانش کے خالق احسان دانش ہوں گے۔ یہ تو اندازہ گلشن ادب کے سرورق سے ہرگز بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ ارمغانِ غزل کی طرح گلشن ادب کا انتساب بھی محترمی ڈاکٹر انور سدید کے نام ہوگا۔ آپ تعارف وتبصرہ کتب کے نامور محقق، نثری وشعری کتاب کے مزاج کے ماہر پارکھ اور اپنی متھصانہ دُہر کے آدمی ہیں۔ جس طرح ملک مقبول احمد صاحب بھی اپنے مزاج کے آدمی ہیں۔ مگر حیرانی اور خوشی ہے کہ ملک صاحب ڈاکٹر صاحب کے محب اور ڈاکٹر صاحب ملک صاحب کے عقیدت مند ہیں۔ گویا (اگر اچھا نہ لگے تو معافی چاہتا ہوں)۔

من ترا ملا بگویم تو مرا حا جی بگو

اگر یہ کلام برے زاویہ فکر کو ظاہر کرتا ہو تو اچھے زاویہ فکر کو اس سے ظاہر کردیتا ہوں۔

Love Begets Love

اگر اس کلام میں بھی کوئی عیب نظر آتا ہو تو یہ رومانوی شعر شائد میرے معروض کے حسب حال ہو:

تُو مُجھ سے کرے جو محبت، میں تجھ کو ہر دم چاہوں
تُو آئے طرف جو میری، میں سمت تیری کو آؤں!

ملک صاحب! اب بھی اگر دل پران انداز ہائے کلام سے کچھ بوجھ یا تکدر آئے تو رب کریم کا یہ فرمان میرے خیال کی تائید کو کافی ہے:

فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا)

بہر حال! قصہ مختصر، ڈاکٹر انور سدید صاحب میرے نزدیک لائق صد احترام ہیں اور ملک صاحب نے ایک قصر بحر کے شعر میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اپنی عقیدت و چاہت کا کلائمکس شو کر دیا ہے۔

بانٹتے ہیں جو پیار لوگوں کو
مثلِ انور سدید ہوتے ہیں

''گلشن ادب'' کے تیئس مقالات میں سے پہلا مقالہ تاریخ کے تنقیدی تقاضے از قلم احسان دانش ہے اور آخری یعنی تیسواں مقالہ آیات وجدانی از قلم مرزا یگانہ لکھنوی ہے۔ 306 صفحات کی ضخامت کی اس کتاب میں سب سے زیادہ یعنی تین مقالے ہیں۔ جناب احسان دانش کے، دو دو مقالے ہیں پروفیسر سجاد حارث، محمد یوسف زاہد، عثمان صدیقی۔ اعجاز الرحمٰن ایم اے، میاں اعجاز الرحمٰن، اس کے بعد ایک ایک مقالہ ہے رشید الدین صدیقی کا، اعجاز احسانی کا۔ اعجاز الرحمٰن کا (نا معلوم درج بالا دو مقالے بھی انہی کے ہیں یا وہ کوئی اور اعجاز الرحمٰن ہیں) محمد یوسف زاہد (غالب گمان ہے کہ درج بالا دو دو مقالات کی فہرست میں مقالہ نگار محمد یوسف زاہد یہی ہیں) پروفیسر محمد رفیع انور، محمد یٰسین، نقاد (یہ اصل نام نہیں ہے) ظریف میسر عزیز الحق اور مرزا یگانہ لکھنوی وغیرا ہم۔

مقالات میں علامہ اقبال، بہادر شاہ ظفر، احمد شاہ پطرس بخاری، میر حسن، کنہیا لال کپور قابل، عبدالماجد دریا بادی، ابوالکلام آزاد، محمد احسن فاروقی، علی اختر حیدر آبادی کی شخصیات اور فن اور کارہائے ادب پر کلام کیا گیا ہے۔ تاریخ کے تنقیدی تقاضے،

محاورہ کا مسئلہ، سماج کی تعمیر میں ادیب کا حصّہ، ادب کی نئی اور پرانی قدریں، اردو قصیدہ، انگریزی ڈرامے کا ارتقاء، امن عامہ کی تعمیر میں گالی کا حصہ میں تنقید و اثرات ادبی حوالہ جات اور رشحاتِ زعماء کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ دوست اور کتاب اور آیات وجدانی میں کتابوں کو ہدفِ کلام، جمال آرام بنایا گیا ہے۔ گویا مکمل کتاب ادبی (Literary) معنوں میں ہی ادبی نہیں ہے بلکہ انداز بیاں، نقطہ ہائے نظر (Point Of View) اور نقد و نظر بھی ادب و حفظ کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔

''عرض سدید'' گلش ادب کی چہرہ نمائی ہے۔ جسے پڑھ کر پوری گلشن ادب کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ گرامی ڈاکٹر انور سدید صاحب نے تنقید و تجزیہ اور پرکھ پرچول کی چھلنی سے گلش ادب کی تمام تحریروں کو چھان کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے:

☆ ''تاریخ کے تنقیدی تقاضے میں'' تاریخ کو افسانہ بنا ڈالنے والے نام نہاد مورخین کے کام کی شدّت سے مخالفت کی ہے اور یہی مقالہ نگار جناب احسان دانش کا نقطہ نظر ہے۔

☆ مقالہ ''دوست اور کتاب'' کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اس مضمون میں احسان دانش اپنی بزرگی کے احساس سے پند و نصائح بکھیرنے لگتے ہیں تو انشائیہ کے مدار سے نکل جاتے ہیں۔ تاہم اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ انہوں نے اس خیال افروز مضمون میں نکتہ آرائی خوب کی ہے۔'' (صفحہ 10)

☆ ''محاورہ کا مسئلہ'' ایک مکتوب نما مقالہ ہے۔ جس کو احسان دانش نے اپنی یادوں اور محاوروں کی پس پردہ کہانیوں سے مرصع بنا دیا ہے۔ ''چودھویں صدی'' میں اس مضمون کی اشاعت کے وقت پوری ادبی دنیا میں سنی جانے والی بازگشت کی افادیت آج بھی قائم ہے۔

☆ پروفیسر سجاد حارث نے اپنے مقالہ ''قدیم اردو شاعری'' سیاسی آئینہ خانہ میں کو کنایتِ لفظی سے خوب نکھارا ہے۔ ''سماج کی تعمیر میں ادیب کا حصہ'' میں پروفیسر سجاد حارث نے عظیم ادب، سیاست اور مذہب کی حد بندیوں میں (ادیب کو) مقید نہیں کیا۔ پروفیسر سجاد حارث کے دونوں مقالوں سے ایک خاص نکتہ خیال کے حامل ہونے کے سبب قاری اپنے زاویہ نظر سے اختلاف بھی کر سکتا ہے۔

☆ جناب محمد یوسف زاہد نے علامہ اقبال کے حوالے سے دونوں مقالوں (مسجد قرطبہ، اقبال کی منظریہ شاعری) کے ذریعے قاری کے سامنے نئے نکات ظاہر کیے ہیں۔ ''ادب کی نئی اور پرانی قدریں'' میں فاضل مقالہ نگار نے زمانے کو بہت اہمیت دی ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا کہ ''صادق قدریں ادب میں اپنی نمو کو برقرار رکھتی ہیں اور انہی سے عظیم ادب پورا ہوتا ہے۔''

☆ جناب عثمان صدیقی کے مقالہ ''تنقید اور اس کا مقام'' میں لکھا ہے کہ تنقید اس احتساب کے مترادف ہے جو ادب میں بے راہ روی کو روکتا ہے۔ مقالہ ''اقبال کی غزل'' میں مقالہ نگار نے اقبال کے اس اجتہاد کو پیش کیا ہے۔ جس نے غزل کی عشقیہ شاعری کی کایا پلٹ دی اور حیات و کائنات کے مسائل کو غزل کا جزو بنا دیا تھا۔''

☆ جناب اعجاز الرحمٰن سے ڈاکٹر انور سدید صاحب مل کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

''انہوں نے رسالہ ''چودھویں صدی'' میں سب سے زیادہ مضامین لکھے اور ان کا تنوع، مضامین کے عنوانات...... اردو قصیدہ، ایک مطالعہ...... بہادر شاہ ظفر کی طبیعت کے چند رنگ...... میر حسن کا فنی شعور...... عبدالماجد دریابادی اور فلسفیانہ نثر...... پطرس بخاری کی مزاح نگاری پر ایک نظر سے ظاہر ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید صاحب کے اس قطعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اعجاز الرحمٰن ایم اے ہو یا میاں اعجاز الرحمٰن ہو یا تنہا (سابقے لاحقے کے بغیر صرف) اعجاز الرحمٰن ہو، یہ ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ لہٰذا گلشن ادب میں شامل مضامین و مقالہ جات کی تعداد کے حساب سے آپ تمام مقالہ نگاروں پر بازی لے گئے۔

ہم تو سمجھے تھے یہ بندے تین ہیں
تینوں ہو کر ''ایک'' بازی لے گئے
ایک میں تین، تین میں ایک، ایک ہی تو ہے
خوب تثلیث، چھپے رستم ہو گئے

☆ جناب رشید الدین صدیقی کے مقالہ ''کنہیا لال کپور' شخصیت کے آئینے میں'' کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی مدبرانہ اور بالغانہ رائے کو اس طرح کنسائز (Concise) کیا ہے۔ ''صدیقی صاحب نے ان (کنہیا لال کپور) کی طنز نگاری کو ان کی شخصیت سے بازیافت کیا ہے اور بالغ نظری سے اس طنز کو قبول کیا ہے جو کپور کی شخصیت سے از خود بر آمد ہو جاتی تھی۔

☆ علی اختر حیدر آباد اور قابل کی غزل میں فاضل ناقدین میر عزیز الحق اور اعجاز احسانی نے ادب کے تناظر میں اول الذکر ان دو شعراء کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

☆ ''ابوالکلام اور اردو ادب'' نثر کی روانی ظاہر کرتی ہے کہ جس کسی نے بھی یہ مقالہ لکھا ہے اس نے گلشن ادب کی پوری سیاحت کر رکھی ہے۔'' (صفحہ 12)

☆ ''انگریزی ڈرامے کا ارتقاء'' میں جناب محمد یٰسین نے اپنی تحریر کو ایک ایسا بامعنی سروے (Survey) بنا دیا ہے۔ جس میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

☆ ''امن عامہ کی تعمیر سے گالی کا حصہ'' موضوعی لحاظ سے انشائیہ ہے مگر فاضل قلمکار نے افسانے کے اسلوب اور کرداروں کی آمیزش سے اس کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔ڈاکٹر انور سدید صاحب نے لکھا ہے کہ ''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نصف صدی کے بعد بھی ان مضامین میں پڑھے جانے اور متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور یہ مضامین اثبات واختلاف کے نکتے ابھارتے ہیں۔(صفحہ 13)

ڈاکٹر صاحب نے ''گلشن ادب'' کو ادبی تحریروں سے سجانے والے ان مقالہ نگاروں کو نامور شخصیات قرار دیا ہے۔جناب احسان دانش، پروفیسر سجاد حارث اور ان شخصیات کو ''چودھویں صدی'' میں پردہ سکرین پر نمودار ہونے والی شخصیات قرار دیا ہے۔جناب عثمان صدیقی، میاں اعجاز الرحمٰن، محمد یوسف زاہد، رشید الدین صدیقی، میر عزیز الحق، اعجاز احسانی اور محمد یسٰین۔ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ''ان (حضرات) کے خیال انگیز مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وسیع طبقے میں پڑھے گئے ہوں گے لیکن زمانہ حال یا ماضی قریب کے معروف ادبی رسائل میں مجھے ان کے مضامین نظر نہیں آئے۔

اپنی ''عرض سدید'' کی آخری دو تین سطور میں فاضل قلمکار نے ملک صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''گلشن ادب'' میں ان (تمام ادباء) کی تحریروں کی اشاعت کو ان (تحریروں) کے لیے ''حیات نو'' قرار دیا ہے۔اور ملک مقبول احمد مدظلہ کا اس ادبی تدوین و اشاعت پر شکریہ ادا کیا ہے۔

گذشتہ کتابوں پر تبصرہ کی روایت کے برعکس اس دفعہ میں نے ''عرض سدید'' کی روشنی میں ''گلشن ادب'' کے مضامین اور تحریروں کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔جو کہ گلشن ادب کے تعارف کو کافی وشافی و وافی ہے۔اس کے باوجود گلشن ادب کے نمایاں خصائص کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے۔

(الف) فاضل مرتب نے گلشن ادب کے مواد کی جمع و تدوین میں بلاشبہ خصوصی جدو جہد کی ہے۔

(ب) فاضل مؤلف نے گلشن ادب میں شامل مضامین کو اِدھر سے اُدھر (چودھویں صدی کے مختلف شمارے) سے اکٹھا کر کے گویا ایک علمی ادبی سلک کی شکل میں اپنے قارئین کے مطالعہ کے لیے پیش کر دیا ہے۔

(ج) گرامی ملک مقبول احمد صاحب نے کس چاہت اور تعلق سے ''چودھویں صدی'' کی فائلوں کو سنبھالا اوران سے اخذ واستفادہ کر کے ان کی تحریروں کو مقبول احمد صاحب نے حیاتِ ثانیہ دی۔ گلشن ادب ان کے جذبہ علم پروری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(د) اگر چہ ملک مقبول احمد صاحب کو ''چودھویں صدی'' کی فائل میں دفن علمی، ادبی تحریریں کتابی شکل میں مدون کر کے شائع کرنے کا محرک کچھ دوسرے احباب بالخصوص پروفیسر جمیل آذر صاحب آف راولپنڈی بنے ہیں۔ جو ملک صاحب مخلص محبین میں سے ایک ہیں لیکن چودھویں صدی کے فائل سے منتشر تحریروں کو گلشن ادب کی شکل میں لانے کے لیے ملک مقبول احمد صاحب کو کس کاوش و کاہ سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا حقیقی اندازہ کم از کم مجھ جیسا کم علم اور کم حوصلہ شخص نہیں کر سکتا۔ ہاں! محققین و مدققین اس کا درست اندازہ کر سکتے ہیں یا ملک صاحب خود، جیسا کہ پنجابی کا محاورہ ہے:

''یا راہ پیا جانے یا واہ پیا جانے''

ملک صاحب اگر چاہتے تو ''چودھویں صدی'' کی فائل میں اس دور کے بھی اور آج کے دور کے بھی گم نام اور غیر معروف ادباء کے بارے میں تحریروں کو شامل کتاب نہ کرتے مثلاً ''قابل کی غزل'' جو سات صفحوں پر مشتمل تحریر ہے۔

(190 تا 197) اسی طرح علی اختر حیدر آبادی جو دس صفحات پر مشتمل ہے (257 تا 266) مگر ملک صاحب نے ''چودھویں صدی'' کی تحریروں کے Merit پر پسند و ناپسند کو غالب نہ ہونے دیا اور جب ادبی تحریریں جمع کرنے پر آئے تو ایک سال کی فائل میں موجود تمام تحریریں جمع کر دیں۔

(و) کتاب گلشن ادب میں کچھ ایسے مقالات بھی آ گئے ہیں جو ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے حوالہ سے وقیع معلومات کے حامل بھی ہیں۔ان میں:

☆	سماج کی تعمیر میں ادیب کا حصہ	پروفیسر سجاد حارث
☆	دوست اور کتاب	احسان دانش
☆	محاورہ کا مسئلہ	احسان دانش
☆	عبد الماجد دریابادی اور فلسفیانہ نثر	اعجاز الرحمٰن
☆	امن عامہ کی تعمیر میں گالی کا حصہ	ظریف

ان تحریروں کے پڑھنے سے واقعتاً میرے علم اور لسانی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔

(i) جناب محمد یٰسین کے مقالہ ''انگریزی ڈرامے کا ارتقاء'' کا ''گلشن ادب'' میں ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک صاحب کے ''چودھویں صدی'' میں صرف اردو ادب سے متعلق ہی تحریریں نہ چھپتی تھیں بلکہ انگریزی ادب سے متعلق بھی تحریریں چھپتی تھیں۔اگر دوسری زبانوں مثلاً سندھی، ہندی، عربی، فارسی زبانوں کے بارے میں بھی تحریریں ''چودھویں صدی'' کی زینت ہوتیں تو لازماً گلشن ادب کا سرمایہ بھی ہوتیں۔اس سلسلے میں ملک صاحب نے اردو ادب اور دوسری زبانوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ان تمام کاوشوں اور خصوصیات کی ''چودھویں صدی'' اور ''گلشن ادب'' میں موجودگی پر ملک صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

گم شدہ افسانے

اردو کے ادبی رسائل میں جواب رسائل اشاعت سے محروم اور نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں مختلف اصناف ادب کے نوادر کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ ان سے بے شمار کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں اور ان قیمتی نوادرات کو بازیافت کہا جا سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس طرف توجہ لاہور کے ایک معروف ناشر ادب ملک مقبول احمد نے دی جو کسی زمانے میں رسالہ ''چودھویں صدی'' شائع کیا کرتے تھے۔ اس اہم ادبی پرچے کی ایک فائل جو 1957ء کی اشاعتوں پر مشتمل ہے۔ ملک مقبول احمد کو دستیاب ہوگئی اور انہوں نے اس سے تین کتابیں مرتب کر ڈالیں۔ زیر نظر رسالہ:

''چودھویں صدی'' کے افسانوں کا انتخاب ہے۔

اس کتاب کا عنوان ''گمشدہ افسانے'' موسوم کیا گیا ہے اور اس میں ریاض بٹالوی، الطاف فاطمہ، رام لعل کے افسانے اور ریاض بٹالوی کا ناولٹ ''انتظار کے بعد'' شامل ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے اس کتاب پر اشاعت سے پہلے نظر ڈالی ہے اور میری رائے میں اگر پاک و ہند کے 1957ء کے افسانوں کا ایک کڑا انتخاب کیا جاتا تو یہ پانچ تخلیقات اس میں ضرور شامل ہوتیں۔ تاہم اب یہ مجموعہ منظر عام پر آ رہا ہے تو یہ تخلیقات پرانی نہیں ہوئیں بلکہ ان میں آج کے حالات کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے اور ان کی تازگی و توانائی برقرار نظر آتی ہے۔ الطاف فاطمہ کا افسانہ ''بیچلرز ہوم'' ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے چار نوجوانوں کے جذبات زیر و بم کی دلآویز کہانی ہے۔ افسانہ

''روشنی اور اندھیرے'' میں ریاض بٹالوی نے ایک جانکاہ مرض (ٹی بی) میں مبتلا مریضوں کی نفسیات پیش کی ہے۔ رام لعل کا افسانہ سکھ کلچر کے مشاہدات کا افسانہ ہے لیکن اس میں رام لعل کی رجائیت نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ ریاض بٹالوی کا ناولٹ ایک ہسپتال کے بیمار ماحول سے زندگی کی رمق پیدا کرتا ہے اور دردناک رومانوی انجام ختم ہوتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ''گمشدہ افسانے'' بازیافت کر کے اور انہیں زیور طباعت سے آراستہ کر کے ملک مقبول احمد نے ہمیں ایک قیمتی تحفہ دیا ہے جو آپ کے ذوق کو بھی آسودہ کرے گا۔

روزنامہ ''نوائے وقت''

9 جنوری 2011

☆☆☆

پروفیسر جمیل آذر

گم شدہ افسانے

اسلامی تقویم کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک مقبول احمد نے شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے یکم جنوری 1956ء کو اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ایک ادبی میگزین ''چودھویں صدی'' کا اجراء کیا۔ اس ادبی پرچے کی ادبی نگرانی کے لیے انہوں نے ملک کے نامور شاعر اور ادیب جناب احسان دانش کی سرپرستی حاصل کی۔ ادبی تخلیقات کے حصول کے لیے احسان دانش کا نام ہی کافی تھا۔ یہ رسالہ تقریباً چار سال تک نہایت کامیابی سے جاری رہا اور پھر اس کا انجام بھی وہی ہوا جو عموماً اکثر ادبی رسالوں کا ہوتا ہے۔ اس کے انجام کے بارے میں ملک صاحب فرماتے ہیں۔ ''میری شبانہ روز محنت کے باوجود رسالہ ''چودھویں صدی'' اقتصادی طور پر خودکفیل نہ بن سکا بلکہ ہر پرچہ کی اشاعت پر مجھے جو خسارہ برداشت کرنا پڑا اس کے منفی اثرات کتابوں کی اشاعت پر بھی پڑنے لگے اور جب میرے لیے اس کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تو میں نے چار سال کے کامیاب تجربے کے بعد بادل نخواستہ اسے بند کر دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مفت پرچے مانگنے والوں کی تعداد میں اضافہ اور پرچے کے بک سٹالوں پر کثرت سے بکنے کے باوجود ایجنٹ حضرات کا رقم کی ادائیگی کا رویہ بھی نہایت حوصلہ شکن تھا۔ اب بقول ملک صاحب کے ایڈیٹر کے نام مضمون نگاروں کے تعریفی خطوط انا کو تسکین تو فراہم کر سکتے ہیں مگر مالی حالت کو تو درست نہیں کر سکتے۔'' ''چودھویں صدی'' تو قصۂ پارینہ بن گیا لیکن اس پرچے کی پرانی دو جلدوں کو جب میں نے دیکھا تو میں ملک

صاحب کو یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ آپ ان دو یادگاری پرچوں سے شعری اور نثری تخلیقات کو الگ الگ کر کے کتابی شکل میں شائع فرمادیں۔ملک صاحب نہایت متحرک (Dynamic) فعال (Active) اور آگے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت رکھنے (Initative) والے شخص ہیں۔میری طرح یہی مشورہ انہیں جناب اظہر جاوید، ڈاکٹر طارق عزیز اور ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ جناب محمد آصف بھلی اور ناصر نقوی صاحب نے بھی دیا۔اللہ کے فضل سے خیر کثیر کی صلاحیت تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔لہٰذا انہوں نے ان قدیم دو جلدوں میں سے تین کتابیں ''ارمغانِ غزل''، ''گلشنِ ادب'' اور ''گم شدہ افسانے'' کے نام سے قارئینِ ادب کی خدمت میں شائع کر دیں۔اپنا ادبی سفر جو انہوں نے اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' سے شروع کیا تھا اسی سفر کی یہ منتخب کتابیں گویا تین سنگِ میل ہیں۔

''گم شدہ افسانے'' کے مجموعہ میں کل پانچ تخلیقات ہیں جن میں ریاض بٹالوی کا ایک ناولٹ ''انتظار کے بعد'' اور دو افسانے ''بڑا گھر'' اور ''روشنی اور اندھیرے''، الطاف فاطمہ کا ایک افسانہ ''بیچلرز ہوم، اور رام لعل کا ایک افسانہ ''لفنگا'' شامل ہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب کرشن چندر، بیدی اور منٹو کا دنیائے افسانہ میں طوطی بول رہا تھا۔تاہم یہ تخلیقات بھی کسی لحاظ سے ان بڑے افسانہ نگاروں سے کم نہیں ہیں۔ریاض بٹالوی کا ''انتظار کے بعد'' اور ''روشنی اور اندھیرے'' ساملی سینی ٹوریم کے صحت افزاء پہاڑی ماحول کے منظر نامہ میں لکھی ہوئی تخلیقات ہیں۔جہاں غم اور خوشی، موت اور زندگی، محبت اور ناکامی ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ لیے نظر آتی ہیں۔اگر باہر کے ماحول میں بارش کی رم جھم ہے تو مریضوں کے اندر غم کے آنسوؤں کی برکھا ہے۔

ریاض بٹالوی کے ناولٹ ''انتظار کے بعد'' میں ٹی۔بی کے مریضوں کے لیے جہاں قدرت کے فطری مناظر امید کے چراغ روشن کرتے ہیں وہاں اسپتال کی نرسیں، ان

کی شفقت بھری تیمارداری اور نسوانی حسن انہیں مسرت کے چند لمحات عطا کرتی ہیں۔ نسوانی کرداروں میں زلیخا جو یہاں پر نرس ہے اور اپنے فرائض نہایت ذمہ داری اور لطف و پیار سے ادا کرتی ہے۔ تمام مریضوں میں نہایت مقبول ہے۔ ماضی میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے کی وجہ سے وہ نرسنگ کے پیشہ میں آ گئی۔ مریضوں میں ایک نسوانی کردار زینت کا ہے جو اپنی خوبصورتی میں نہایت پُرکشش ہے زلیخا پیار سے اسے مونا لیزا کے نام سے پکارتی ہے۔ مرکزی مردانہ کردار ایک ڈاکٹر کا ہے جس پر زلیخا سو جان سے فریفتہ ہے۔ اسپتال کی تمام نرسیں اسے پسند کرتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ اس سے دل ہی دل میں محبت کرتی ہیں اور پیار سے اسے رومیو کے نام سے پکارتی ہیں۔

اس کی کالی کالی آنکھیں اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھتی ہیں۔ زلیخا جب اسے دوسری نرسوں سے بات کرتا دیکھتی ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے وہ رومانوی طور پر خود کو اس کی جولیٹ تصور کرتی ہے۔

اسی پس منظر میں زینت جو مریضہ کے طور پر اسپتال میں آتی ہے اپنے حسن میں لاجواب ہے۔ زلیخا اس کے حسن سے اتنا متاثر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس کا تعارف ان الفاظ میں کراتی ہے۔

"۔۔۔۔۔ ہائے ڈاکٹر! اتنی خوبصورت ہے اتنی پیاری کہ اُسے دیکھ کر عبادت کرنے کو جو چاہتا ہے اس کی مسکراہٹ میں تو جادو ہے کل آ ؤ گے تو دکھلاؤں گی۔ سجدے میں نہ جھک گئے تو مجھے کہنا۔ نام تو اس کا زینت ہے لیکن میں پیار سے اُسے مونا لیزا کہتی ہوں۔"

اس ناولٹ کے تمام مرکزی کردار ماضی کی ناتکمیل محبت کے مارے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جو یہاں نرسوں میں نہایت پسندیدہ اور محبوب ہے ماضی میں ایک راہبہ انجلینا کی محبت کا مارا ہوا ہے۔ کچھ یہی حال زینت اور زلیخا کا ہے۔ ان سب کے ماضی غموں سے بھرے

ہوئے ہیں۔ جب زینت اٹھارہ سال کی تھی تو ایک قوم پرست ایرانی نے اس کے والد اور والدہ کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اس کا والد ہندوستانی تھا اور ماں ایرانی۔ سینی ٹوریم ان محبت گزیدہ کرداروں کے لیے از سرِ نو بحال کرنے (Rehabilitation) کا کام کرتا ہے۔ یہ ناولٹ تلمیحی انداز میں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ زلیخا ایک خواب دیکھتی ہے جس میں وہ زینت کے حق میں دستبردار ہو جاتی ہے۔ وہ ڈاکٹر کو اپنے خواب کا اس طرح ذکر کرتی ہے:

''میرے یوسف! میں نے ایک خواب میں چمکدار ستارے کو اپنی جھولی میں گرتے دیکھا تھا۔ میں جھولی پھیلائے آسمان کے نیچے کھڑی تھی۔ تم ستارہ بن کر چمکے اور خواب بن کر ٹوٹ گئے۔ میری جھولی پیچھے ہی رہ گئی۔ میری جھولی خالی ہی رہ گئی۔ ڈاکٹر مجھے یاد نہ کرنا اپنے گھر کے صحن میں بیٹھ کر میری باتیں نہ کرنا۔ میں راہ بھول جاؤں گی۔ شہزادے مجھے بھولے بسرے خواب یاد آ جائیں گے۔ اب تو میں جھولی بھی نہیں پھیلا سکوں گی۔ اب تو میں آنسو بھی نہیں بہا سکوں گی۔ زینت کا خیال رکھنا اسے میرا اسلام کہنا۔ کبھی تمہاری یادوں کے کنعان میں میرا ذکر آ جائے تو یہ سوچ کر مسکرا دینا ایک پاگل لڑکی خالی ہاتھ تمہاری خریدار بن کر آئی تھی اور اپنے بھرے خالی ہاتھ واپس چلی گئی ہے۔'' زلیخا زینت کے حق میں دستبردار ہو کر اپنی پُر خلوص محبت کا ثبوت دیتی ہے اور سچی محبت قربانی مانگتی ہے۔ یہ رومانوی ناولٹ، قربانی، حسن اور اُمید و رجا کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

ریاض بٹالوی کا افسانہ ''روشنی اور اندھیرے'' بھی سینی ٹوریم کے صحت افزاء ماحول کے پس منظر میں لکھا ہوا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ٹی۔ بی کے مریضوں کے لیے زندگی اور موت، خوشی اور غم، مسرت کے چند لمحات اور اداسی کی کیفیات ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے کہ ''یہ افسانہ بڑی دردمندی سے لکھا اور معصومیت کی فضا سے زندگی کی لگن کو جنم دیا ہے۔'' ڈاکٹر انور سدید کے بقول ''اس افسانے

کا موضوع نیا نہیں۔ اس سے پہلے اختر اورینوی ''کلیاں اور کانٹے'' کے عنوان سے اور اشفاق احمد ''شب خون'' کے عنوان سے ٹی۔ بی سینی ٹوریم کی فضا پر بڑے خوبصورت افسانے لکھ چکے ہیں۔ ان تینوں افسانوں کا ٹریٹمنٹ قریباً ایک جیسا ہے۔ اختتام پر تاثر بھی ایک جیسا ہی پیدا ہوتا ہے لیکن ہر افسانہ اس کے مصنف کی آئینہ دار ہے۔''

اس افسانے کا مرکزی کردار قربان طاہر ہے جو اپنے دوست افتخار کی بہن شوکت آراء پر سو جان سے فریفتہ ہے۔ قربان طاہر میو ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر سالمی سینی ٹوریم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اتفاق سے سینی ٹوریم ہی میں شوکت آراء بھی بطور نرس تعینات ہو کر آ جاتی ہے۔ شوکت آراء کا یہاں پر آ جانا قربان طاہر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ شوکت آراء کے علاوہ یہاں ایک اور نرس روشن آراء بھی ہے۔ جو شوکت آراء ہی کی طرح حسین و جمیل ہے۔ ٹی۔ بی کے مریضوں کے لیے یہ خوبصورت نرس ان کے احساسِ جمالی کے لیے باعث تسکین بھی ہیں اور ایک طرح سے انہیں حیاتِ نو کی نوید بھی دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نرسیں ہیں جو یہاں اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ یہ بیمار لوگ وقت کو خوشگوار انداز میں گزارنے کے لیے ان خوبصورت لڑکیوں کی باتیں کرتے یا خوبصورت موسم پر بحث کرتے۔ شادی بیاہ کی باتیں کرتے اور جدید ادب پر گفتگو کرتے۔ قربان طاہر بیمار ہونے کے باوجود بہت زندہ دل ہے اور سالمی سینی ٹوریم کی بیمار فضا کو نت نئے پروگراموں سے گرمائے رکھتا ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ ''لڑکیاں صحت کے لیے بے حد ضروری ہیں۔'' قربان طاہر نے ایک مرتبہ ہسپتال کی فضا کو گرمانے کے لیے ڈرامہ سٹیج کرنے کا پروگرام بنا ڈالا جس میں وہ خود کو ہیرو کا کردار ادا کرنے کا خواہش مند ہوا۔ میوزک ترتیب دینے کے لیے اس نے روشن آراء کو منتخب کیا اور ہیروئن کا رول کرنے کے لیے شوکت آراء کو پسند کیا۔ اسی طرح پھر اس نے ایک یونین بنا ڈالی۔ اس یونین کا سیکرٹری

سالمی تھیٹرز خود بنا۔ مظفر ملک سیکرٹری سالمی لائبریری، راشد اشرف سیکرٹری بزم علم وادب، اور مسٹر امین بیرا سیکرٹری ٹو سیکرٹریز بنے۔ انہوں نے یونین کی جگہ کا نام سیکرٹریٹ رکھا اور یہاں سے قلمی ماہنامہ کا اجراء بھی کر دیا جس کا نام کشمکش رکھا اور لڑکیوں سے مضامین لے کر شائع کرنے لگے۔

ان سرگرمیوں کے علاوہ جو سب سے بڑی خوشی، مسرت کی بات ان مریضوں کے لیے تھی وہ وہاں کی نرسیں تھیں جن کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے قربان طاہر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ قربان طاہر جب شوکت آراء کو دیکھتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پھولی ہوئی ٹالیوں کے سایوں میں بیٹھا بچپن کے بھولے ہوئے خواب دیکھ رہا ہو۔ ''شوکت آراء کے مقابلے میں روشن آراء کا اپنا ایک حسن ہے۔ جو مریضوں کے لیے راحتِ جان ہے، روشن آزاء مریضوں سے محبت کرتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ان کے لیے ایسا پیار ایسی ہمدردی ہے۔ جیسے یہ کھلونے اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے ہوں۔ اس کی تیمارداری میں کہیں نوخیز لڑکی کا پیار ہے۔ جو گڑیوں سے کھیلتی ہے، کہیں ماں کی مامتا ہے جو اپنے بچوں سے پیار کرتی ہے اور ان کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی۔ وہ تمام مریضوں میں نہایت پسندیدہ اور محبوب ہے۔ جب کچھ مریض اس کی تیمارداری میں اپنی محبت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ تو وہ انہیں شفقت اور ہمدردی سے مہربان ماں کی طرح سمجھاتی ہے اور اُن کے عشق کی گرمی کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ تاہم بنیادی طور پر یہ ساری کہانی قربان طاہر اور شوکت آراء کے ہی گرد گھومتی ہے۔ قربان طاہر کا عاشقانہ رویہ کام کی لگن، ہر کام میں سرگرم مستعد رہنے کی وجہ سے وہ تمام نرسوں میں ''کریک اعظم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز شوکت آراء کا دم بھرتا تھا۔ اس سے عشق کرتا تھا کیونکہ اس کا فلسفۂ حیات ہی یہی تھا کہ ''زندہ رہنا ہے تو

عشق کرو ورنہ زہر پھانک لو۔ بالآخر قربان طاہر، یہ کریک اعظم، محبت کا پجاری ایک شب مکروہ کھانسی کے طویل دورہ کے دوران خون اُگلتا اپنی زبان پر شوکت کا ورد کرتا دم توڑ دیتا ہے۔ کریک اعظم چلا گیا۔ سینی ٹوریم میں یہ خبر پھیل گئی اور شوکت آراء یہ خبر سن کر چپ ہو جاتی ہے اور پھر مسکرا کر کہتی ہے۔ ''ہائے اللہ وہ تو واقعی پاگل نکلا'' لیکن دوسرے لمحے اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس کہانی کا انجام بڑا دردناک اور غم انگیز ہے۔ یہ رومانوی افسانہ اپنے اندر عشق کی گرمی اور محبت کا غم لیے ہوئے ہے اور زندگی کی حقیقت کا ادراک عطا کرتا ہے۔

ریاض بٹالوی کا افسانہ ''بڑا گھر'' نہایت خوبصورت ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے غلام عباس کا اوور کوٹ (Over Coat) اور اپنا انشائیہ نما طنزیہ مزاحیہ افسانہ ''برساتی'' جو ہفت روزہ لیل ونہار میں مارچ 1959ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ بے ساختہ یاد آ گئے۔ ''بڑا گھر'' ہو یا ''اوور کوٹ'' یا ''برساتی'' ان تینوں تخلیقات میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہم تیسری دنیا یا پس ماندہ ملک کے لوگ اپنی غربت وافلاس کو چھپانے کے لیے ظاہری لباس، ظاہری چمک دمک اور جھوٹے وقار اور وضعداری کا سہارا لیتے تھے۔ بالخصوص وہ لوگ جو شہروں میں رہتے تھے۔ لیکن دیہات کے لوگ اس ظاہر داری سے بے نیاز تھے ان کی سادگی اور اپنی ثقافت میں حسن تھا اور رہن سہن میں رعنائی تھی۔ ''بڑے گھر'' کے مرکزی کردار کے پاس پہننے کے لیے صرف ایک ہی جوڑا ہوتا ہے۔ جسے وہ ہر تیسرے دن دھلوا کر پہنتا ہے۔ چھٹی کے دن اس نے اپنی ایک دوست فرنگن عورت مس براؤن کو ملنے جانا تھا۔ اب جو وہ قمیض پہننے لگا تو اس کا ایک بازو ہی غائب تھا۔ دھوبی نے استری کرتے وقت پھاڑ دیا تھا اور رات کو اس کی ماں کو دے کر چلا گیا تھا۔ بہر کیف قہر درویش بر جان درویش وہ اس ایک بازو والی قمیض کو پہن لیتا ہے اور اسے چھپانے کے لیے کوٹ

پہن لیتا ہے۔ادھر مس براؤن فرنگن عورت بھی کچھ اس قسم کا کردار ہوتی ہے۔ وہ بڑی ڈینگیں مارتی ہے کہ اس کے ہاں بادشاہوں کے نوادرات ہیں۔اس کی ماں سکاٹ لینڈ میں لیڈی ہے۔ وہ لباس بھی عمدہ پہنتی ہے اور اسے ریشم سی لگتی ہے۔اگر چہ اس کے خدوخال کوئی خاص نہیں تھے۔تاہم گوری تو تھی۔ وہ ایک پرانی کار بھی رکھتی ہے اور ایک کوٹھی میں رہائش پذیر ہوتی ہے۔اس کی دعوت پر وہ اسے ملنے اس کی کوٹھی پر جاتا ہے۔تو ڈرائیور سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو اپنی مالکن مس براؤن کے خلاف بڑی واہی تباہی بکتا ہے کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے اور اسے کئی ماہ سے تنخواہ بھی نہیں ملی اور وہ ڈرائیوری کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں مالی کا کام بھی کرتا ہے۔کھٹارا گاڑی بھی کوٹھی ہی میں کھڑی ہے۔ یہ اپنا گھٹیا سگریٹ جسے وہ گولڈ فلیک کی ڈبیا میں رکھتا ہے۔نکال کر پینے لگتا ہے اور واپس اپنے دوست اختر کے ہاں جاتا ہے۔ جو اپنی کوٹھی کے پلاٹ میں کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔اختر کو وہ تمام روداد سناتا ہے۔اتنے میں میم صاحب بھی ادھر آ نکلتی ہے۔ جو انہیں متاثر کرنے کے لیے کہتی ہے کہ ڈرائیور چھٹی پر گیا ہوا ہے اور وہ بینک سے پیسے نکلوانے کے لیے پیدل ہی چل پڑی تھی اور پھر وہی اس کی پرانی ڈینگیں۔اس کے جانے کے بعد ادھر ایک بڑھیا اپنی نئی نویلی دلھن بیٹی کو جسے وہ اس کے سسرال لے جانے کے لیے اسٹیشن کی طرف ریل گاڑی میں اپنے ساتھ لے جارہی تھی، آ نکلی۔ دلہن کا نام ریشماں ہے جو واقعی شکل وصورت حسن ورعنائی میں ریشمان ہے۔ وہ اختر سے ٹائم پوچھتی ہے۔تا کہ وقت پر اسٹیشن پہنچ جائے کہ کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔اختر جو دلہن کے حسن وشادابی سے خیرہ ہوا جارہا تھا۔فوراً ٹائم دیکھنے کے لیے اُٹھا تا کہ اندر کمرے میں جا کر گھڑی سے ٹائم دیکھ کر اسے بتا دے۔لیکن اختر ذرا تاخیر سے واپس آتا ہے۔اس کا سانس پھولا ہوا اور قمیض ایک دو جگہ سے پھٹی ہوئی ہوتی ہے جیسے کسی سے کشتی لڑ کر آیا ہو۔اس نے بڑھیا کو وقت بتایا جو دُعائیں دیتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ جب

اس کے دوست نے اس سے پوچھا کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی تھی تو اس نے جواب میں بتایا کہ اس کی گھڑی کئی دنوں سے خراب تھی لہٰذا وہ باہر کی دیوار سے پھاند کر ساتھ والی گلی میں گیا تھا اور اس بکواس میں اس کی کہنیاں چھل گئیں اور قمیض بھی پھٹ گئی لیکن ٹائم دیکھ کر واپس آ کر بڑھیا کو صحیح وقت بتا دیا۔ اس نے کہا یار! کمال ہے تو انکار کر دیتے کہ گھڑی نہیں ہے۔ اس پر اختر کہتا ہے: ''انکار نہیں ہوتا یار! وہ کیا خیال کرتی اتنے بڑے گھر میں گھڑی ہی نہیں۔'' اس جواب سے مرکزی کردار کو اپنی قمیض کا پھٹا ہوا بازو یاد آ جاتا ہے۔ جسے اُس نے کوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اس افسانے کا ماحاصل یہ ہے کہ یہ لوگ بظاہر بڑے گھروں میں، یا امیرانہ شان سے ظاہری زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں تمام کردار غربت، افلاس اور تنگ دستی کی حالت میں ہیں۔ یہ افسانہ بیسویں صدی کی چالیس اور پچاس کے دہائیوں کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کیونکہ میں خود اس کا عینی اور عملی شاہد ہوں۔ یہ ایک خوبصورت اور کامیاب افسانہ ہے۔ اس افسانے میں محبت، حسن، اور سادگی کی رعنائی قائم ہے اور اس زمانے کا یہی اہم خوشگوار اور اطمینان بخش سنہری پہلو ہے۔ آج کل کے لوگوں کی پریشان زندگی سے جو یوٹیلیٹی بلز، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ، دہشت گردی نا قابل برداشت مہنگائی، ملاوٹ، بے ایمانی، کرپشن، جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی سے بھرئی ہوئی ہے۔ مکمل طور پر نہ سہی مگر مجموعی طور پر آزاد تھی۔ بڑھیا کی سادگی اور ریشماں کے حسن سے متاثر ہو کر اختر ایک مشکل آزمائش سے گزرتا ہے لیکن ٹائم صحیح آ کر بتاتا ہے۔ بس اس زمانے میں ''سچائی ہی سچائی'' کا حسن تھا۔ اور اپنی عزت و آبرو کو قائم رکھنے کے لیے سو سو پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ گھٹیا سگریٹ کو گولڈ فلیک کی قیمتی ڈبیا میں رکھنا، پھٹی ہوئی قمیض کی آستین کو کوٹ میں چھپا کر رکھنا، کوٹھی کے پلاٹ میں بیٹھ کر اخبار پڑھنا اور چائے پینا اور پھر کسی فرنگن عورت سے جو خود بھی اپنی غربت کو ظاہری ٹیپ ٹاپ سے چھپائے ہوئے ہے۔ کتنی خوبصورت اور

دلچسپ صداقتیں ہیں جسے ریاض بٹالوی نے اس افسانے میں امر کر دیا ہے۔

الطاف فاطمہ کا افسانہ ''بیچلرز ہوم'' اس مجموعہ میں ستارہ کی طرح جگمگا رہا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد چار کزنز (چچایا ماموں زاد بھائی) ڈیوس روڈ کے ایک گھر میں اکٹھے رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی خاص سامان بھی نہیں ہوتا پس فرشی بستروں ہی پر رات بسر کرتے ہیں۔ راوی کے علاوہ دیگر فرسٹ کزنز کے نام یہ ہیں۔ دارا، ناصر اور خالد۔ پھر ان میں نسوانی کردار کا خوبصورت اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راوی کی والدہ کی چچازاد بہن کی بیٹی ہے۔ جو شملہ میں زیر تعلیم تھی۔ تقسیم کے بعد زینت کوثر کی والدہ نے اسے لاہور میں تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے بھیج دیا یہ سب کردار اگرچہ خون کے رشتہ کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ لیکن فطری خواہشات جو نوجوانوں میں پیدا ہوتی وہ ان میں بھی ہوتی ہے اور ہر فرد یہی چاہتا ہے کہ وہ اس نسوانی کردار کے نزدیک تر شمار ہو۔ اتفاق سے دارا جو کیپٹن تھا اس نے چند فوجی افسر دوستوں کی دعوت کر ڈالی جوان کنواروں کے لیے یہ مشکل ترین مرحلہ تھا لیکن اس تقریب میں زینت کوثر نے بھی ہاتھ بٹایا۔ ان فوجی افسروں میں ایک میجر بھی تھا جس کا افسانہ نگار نے یہاں نام نہیں بتایا۔ تاہم دعوت قائم ہوئی اور حالات نے سب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اتفاق سے ان چاروں دوستوں کو ایبٹ آباد میں زینت کوثر اور مسز میجر ریاض کے ہاں اکٹھے ہونے کا موقع ملتا ہے کیونکہ میجر ریاض نے انہیں مدعو کیا تھا۔ اب میجر ریاض، دو بچوں کا باپ بھی ہے۔ باتوں باتوں میں پرانی یادوں کا ذکر ہوا۔ اب خالد دوران گفتگو مسز ریاض احمد سے کہتا ہے۔ ''بھئی مسز ریاض ہماری ایک دوست ہوا کرتی تھی۔ زینت دی گریٹ کچھ معلوم ہے کہاں گئیں وہ؟ کچھ پتہ نہیں۔ اس نے اپنی سیاہ نگاہوں پر پلکوں کی اوٹ کر لی۔'' مسز ریاض اسی میجر ریاض کی بیوی بنی۔ جسے دارا نے بیچلرز ہوم میں دعوت پر بلایا تھا اور جس کا نام افسانہ نگار نے اس

وقت ظاہر نہیں کیا تھا۔ الطاف فاطمہ کا یہی فنی کمال تھا۔ یہ سب لوگ اب خود بھی شادی شدہ تھے اور ان سب میں ایک ہی خیال نے جنم لیا۔ ''کہ زینت کوثر ایک زبردست فراڈ تھی۔'' اس کی تصویر کے دو رُخ تھے اور وہ بڑی چار سو بیس اور مطلبی تھی۔ ''دراصل وہ نہ فراڈ تھی نہ مطلبی۔ یہ ان نوجوانوں نے اُن جذبات واحساسات کا اظہار کیا تھا جو محبت میں غیر متوقع ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ نئی ہنروری کا خوبصورت نمونہ ہے۔

رام لعل کا افسانہ ''لفنگا'' نہایت دلچسپ اور تحیر آمیز ہے۔ اختتامیہ تو بڑا ہی ڈرامائی اور حیرت انگیز ہے۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ اس میں کسی بھی وقت حیرت انگیز تبدیلی آ سکتی ہے۔ کبھی تو یہ شیطان، بدمعاش اور لچا لفنگا کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے اور کبھی نیک، پارسا اور ولی اللہ بن جاتا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے انسان کو سیدھی راہ پر جسے صراط مستقیم کہتے ہیں چلنے کے لیے پیغمبر اور نبی اور اپنی مقدس کتابیں بھیجی ہیں اور پھر انسان کو درسِ اخلاق اور تعلیم و تربیت دینے کے لیے درس گاہیں قائم کی گئی ہیں مگر آج بھی انسان شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے باز نہیں آتا۔ لفنگا جہاں سکھ کلچر کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ وہاں ایک ایسا کردار بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو ابتداء میں نہایت آوارہ گرد ہے، سینما میں جس روز پہلی فلم ریلیز ہوتی ہے وہ وہاں سے اپنی فنی مہارت سے ٹکٹ خریدتا ہے اور بلیک میں بیچ کر پیسے کماتا ہے۔ اس دھندے میں وہ ماہر جیب کترا بھی بن جاتا ہے اور کئی مرتبہ پولیس کے ہتھے چڑھ کر سزا بھی پاتا ہے۔ یہ کردار ہیرے کا ہے۔ ہیرا اپنے پھوپھی زاد بھائی ہزار سنگھ کے ہاں ایک زنگ آلود ٹرنک اور ایک دری میں لپٹے بستر کے ساتھ اچانک وارد ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب ہزار سنگھ اپنی نوجوان بیوی کے ساتھ کسی پکچر کو دیکھنے کے لیے جانے والا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر بیوی کا تو پارہ چڑھ جاتا ہے اور سارا موڈ آف ہو جاتا ہے لیکن ہیرے نے اپنے سکھ کلچر کے مطابق پہلے تو پھوپھی زاد بھائی کے اور

پھر بھابھی کے پاؤں چھوئے اور ان کی خدمت میں بوڑھے ماں باپ کا دیا ہوا اشیرواد پہنچایا۔ ٹرنک میں سے ایک تھیلی نکال کر دی۔ جس میں گاڑی کی ریوڑیاں تھیں۔ اب ہیرے کی سنئے وہ وہاں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے پاس نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ ہزار سنگھ نے اُسے تسلی دی کہ چند دنوں میں اُسے کسی ورکشاپ یا فارم میں نوکری دلوا دے گا۔ ہیرا بھی خوش ہوا اور بولا کہ نوکری ملنے کے بعد پہلی تنخواہ سے دو نئی پگڑیاں ایک نئی چپل، ایک کرتہ اور پاجامہ خریدے گا کیونکہ اس کا یہ جاٹوں والا حلیہ ہزار سنگھ کو قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔ اب ہیرے نے اپنے کرتوت دکھانے شروع کئے سات سات روٹیاں کھاتا۔ ہزار سنگھ جو بیچارہ کہیں کلرک ہوتا ہے اور اس کی سائیکل کو بے دریغ استعمال کرتا اور کبھی کبھار توڑ بھی لاتا۔ وہ ان کے لیے وبال جان بن جاتا ہے۔ ہزار سنگھ نے اسے ایک فارم میں نوکر کرا دیا۔ مگر وہاں سخت کام سے گھبرا کر بھاگ آیا۔ اپنی بھابھی پرکاش کور سے کہنے لگا۔ ''مشکل کام سے کیا گھبراتا ہوں۔ بھابھی مجھ سے آپ مشکل سے مشکل کام کروا کر دیکھ لیجئے لیکن کوئی شہر میں رونق ہونی چاہئے۔ میرے لیے سینما، تھیٹر، سرکس تو میری زندگی ہے۔ ان سے دور رہ کر میں کوئی کام نہیں کر سکوں گا۔ یہ بات وہ تب کہتا ہے۔ جب پرکاش کور اپنے خاوند کے سامنے ڈانٹتی ہے اور طعنہ دیتی ہے کہ اگر افسر وغیرہ بننا تھا تو پڑھ لکھ لیتے۔ میٹرک فیل کو تو فارم جیسی جگہ مشکل کام ہی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا تمام دن گھر میں پڑے رہنا۔ گانے وغیرہ اور کچھ کام نہ کرنے سے پرکاش کور بے حد تنگ پڑی ہوئی تھی اور پھر وہ بہت دیر سے رات کو لوٹتا تھا کیونکہ سینما میں اس نے بلیک میں ٹکٹ بیچ کر کچھ پیسے وغیرہ کمانے ہوتے تھے۔ فارم پر چند روز قیام اور کام کیا۔ پھر بیمار پڑ گیا اور واپس گھر آیا۔ جب ٹھیک ہوا تو ہزار سنگھ نے اسے واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مفصل خط کے ساتھ اپنے ماموں اور ممانی کے پاس اُسے گاؤں بھیج دیا۔ کئی روز کے بعد ہیرا پھر ایک دن شام کو اپنے وہی پرانے زنگ آلود

ٹرنک اور پرانی دری میں لپٹے بستر کے ساتھ آ ٹپکا اور اس روز بھی ہزار سنگھ اپنی بیوی پرکاش کور کے ساتھ کہیں جانے والا تھا۔ اب تو دونوں میاں بیوی کے چہرے پر ایک ہی جیسے جذبات تھے کہ اسے کھڑے کھڑے ابھی گھر سے نکال دیں گے۔ مگر اب ہیرے کے چہرے پر مایوسی اور شرمندگی کے آثار تھے۔ اپنا سامان نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا اور پھر اُن کے پوچھے بغیر کہنے لگا۔

''میں کل سے اسی کام پر جاؤں گا۔ ٹریکٹر کا کام سیکھنے، آپ میرے ساتھ چلیں گے نا باپا جی! ہزار سنگھ کے جواب دینے سے پہلے پرکاش کور بول اُٹھی ''لیکن اس گھر میں ایک چور اُچکے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔'' اس پر اپنے ہونٹوں پر ایک بے بسی کی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''میں اب سینما کے ٹکٹ نہیں بیچوں گا۔ بھابھی یقین کرو۔ میں ٹریکٹر ڈرائیور بننا چاہتا ہوں۔ اسی روپے تنخواہ ملے گی۔ یہی تنخواہ میں آپ کے قدموں میں لا کر رکھوں گا۔'' پرکاش کور بہت غصے میں تھی اور کچھ یہی کیفیت ہزار سنگھ کی تھی۔ پھر ہیرا نہایت احترام کے ساتھ پرکاش کور کو ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے اُسے کچھ بتایا۔ اس پر پرکاش کور کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اسے ایک اکنی دی اور کہا جا بھاگ کر ایک ٹکے کی برف لے آ۔ اسی بات پر تمہیں شربت پلاتی ہوں۔ ہیرا بولا کہ آپ رہنے دو۔ میرے پاس ٹکا ہے اور پھر وہ گاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔ ہزار سنگھ کی حیرانی ختم کرنے کے لیے پرکاش کور اُسے بتاتی ہے ''اس لفنگے کو ایک پی ڈبلیو ڈی کے چپڑاسی کی لڑکی کے ساتھ محبت ہو گئی ہے۔ لڑکی کے باپ نے اسے کہا ہے کہ اگر یہ چالیس پچاس روپے ماہوار بھی کمانے لگے تو وہ اپنی لڑکی کی اس کے ساتھ شادی کر دے گا۔ دیکھا محبت نے اسے بیل کی طرح اپنے جوئے میں جوت لیا ہے۔'' ہزار سنگھ بھی یہ سن کر مسکرا دیتا ہے۔ محبت نے واقعی اپنا رنگ دکھایا اور محبت نے واقعی اسکی قلب ماہیت کر دی۔ محبت نے ایک لفنگے کو اس کی نام کی مناسبت کے مطابق اس کے

اندر کا ہیرا برآمد کر ڈالا۔

''گم شدہ افسانے'' میں تمام شامل کی ہوئی تخلیقات اپنے دور کی نہ صرف ترجمانی کرتی ہیں۔ بلکہ بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ پاکستانی افسانے کے ارتقاء میں یہ تخلیقات اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ادب کا طالب علم ان سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ ملک مقبول احمد تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان افسانوں کو جو گم شدہ تھے از سر نو معرضِ وجود میں لے آئے۔

☆☆☆

صائمہ نورین بخاری

''گمشدہ افسانے''

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نیلے آسمان پر بادل آتے ہیں ۔۔۔ بھوری ۔۔۔ سیاہ ۔۔۔ سفید بدلیاں اُمڈ اُمڈ کر چھائی چلی جاتی ہیں ۔۔۔ مگر پانی کی ایک بوند نہیں برستی ۔۔۔ برکھا کا سندیسہ، پورب اور پچھم میں گھٹن پھیلاتا ۔۔۔ لمحہ لمحہ جمود کا احساس دلا کر رُخصت ہو جاتا ہے ۔۔۔ کچھ ایسا ہی آسمانِ ادب کے ساتھ بھی ہوتا ہے ۔۔۔ جب ہوائیں سراغِ بہار نہیں دیتیں ۔۔۔ پتھریلی نثریت اور روحانی اضطراب کی کیفیات سے دو چار افسانہ نگار، گمنام جنگلوں میں تخیلِ پرواز کھوجتے شاعر، تخلیقی فکر کے جمود کا رونا روتے ہوئے نقاد اور بچی کھچی ادبی توانائی جمع کرتے ہوئے ناشر ۔۔۔۔ یہی احساس دلاتے ہیں کہ فکر کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں ۔۔۔ حالانکہ آسمانِ ادب پر غزل، نظم، افسانہ، تنقید، ڈراما، سبھی کچھ تخلیق ہو رہا ہو ۔۔۔ تب بھی ایک جمودی کیفیت کا رونا ضرور رویا جاتا ہے ۔ ۔۔ اس موقع پر جناب ڈاکٹر انور سدید کے ایک فکری و تنقیدی مضمون کے چند دل چسپ جملے مجھے یاد آ رہے ہیں ۔۔۔ جو اس امر کی وضاحت میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

''ادب کی تخلیق الجبرے کے فارمولے سے مماثل نہیں کہ الف اور ب کے مربع کو جمع کیا جائے تو لازماً ایک ہی جواب معرضِ وجود میں آئے ۔۔۔ ادب اقلیدس کا خط بھی نہیں کہ مرکز کے گرد یکساں فاصلے پر گردش کرے تو دائرہ ہی متشکل ہو ۔۔۔''

ادب دراصل مفاہمت اور تصادم کی فکری لہروں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی لحاظ سے فن پاروں کی تعداد بھی ادب کی پیمائش کا صحیح پیمانہ نہیں ۔۔۔ بلکہ کسی بھی ادب کی توانائی

اور اس کی حالتِ وجود سے باہر نکلنے کی طاقت کا اندازہ اس امر سے لگانا چاہئے کہ اس ادب میں کس قدر فکری لہریں موجزن ہیں۔۔۔ جو جمود یا گھٹن کے تاثر کو توڑنے میں کامیاب ہوں گی۔۔۔

''چودھویں صدی'' کے ''گمشدہ افسانے'' دراصل وہی فکری لہریں ہیں جو ادب کے جمود کو توڑنے کی نوید اس زمانے میں بھی دیتی تھیں اور آج بھی۔۔۔۔ جن کی گمشدگی پر وقت کی گردش، گرد ڈالنے میں ناکام رہی۔۔۔

William Blake کے مطابق ''فن نخلِ زندگی ہے''۔۔۔ اور ملک مقبول احمد اس امر پر یقین رکھتے ہوئے یہ بات بھی بخوبی سمجھتے ہیں کہ جو فن کار، تخلیق کار، ذہنی کشادگی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر مبنی تخلیق کرتا ہے۔۔۔ اس کا فن پارہ وقت کی گرد اور گردش کا شکار نہیں ہوتا۔۔۔ اسے جاودانی نصیب ہوئی۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے جنھیں ڈاکٹر انور سدید ''چودھویں صدی'' کے ''گمشدہ افسانے'' قرار دیتے ہیں۔۔۔ ایسے ادبی معیار کا پتہ دیتے ہیں کہ بقول امین راحت چغتائی۔۔۔

''جب فکرِ سخن ہو شاعر کو تو جگ مگ جگ مگ شعر کریں
ہر افسانے کے لفظوں سے پھر پھوٹیں نور کے فوارے''

''عرضِ سدید'' کے مطابق، رسالہ چودھویں صدی کی تاریخ کچھ اس طرح بنتی ہے۔ انہی کے الفاظ میں:

> پندرہ روزہ ادبی رسالہ ''چودھویں صدی'' لاہور سے ملک مقبول احمد نے جنوری 1957ء میں جاری کیا تھا۔۔۔ اس رسالے کی تزئین و آرائش اور ترتیب و تدوین میں محترم مدیر کی معاونت محمد اکرم صاحب کرتے تھے لیکن اس کے ادبی نگران ملک کے نامور شاعر

احسان دانش صاحب تھے۔ مجھے ''چودھویں صدی'' کی دوسری جلد جو یکم جنوری 1957ء سے لے کر دسمبر 1957ء کی اشاعتوں پر مشتمل ہے۔۔۔کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا ہے۔۔۔''

جناب انور سدید نے اس ادبی رسالے کے معیار کو کچھ اس طرح سراہا ہے۔

''اس رسالے کے ساتھ احسان دانش کی وابستگی ہی کا نتیجہ تھا کہ اسے ملک کے نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہو گیا اور اس پرچے نے تھوڑے ہی عرصے میں معیاری مندرجات کی وجہ سے ملک میں کامیابی حاصل کی۔۔۔۔افسوس یہ ہے کہ زمانی لحاظ سے ''چودھویں صدی'' نے لمبی عمر نہ پائی اور قارئین کے عدم تعاون اور مالی خسارے کی وجہ سے شوق کا یہ کاروبار بند کرنا ناگزیر ہو گیا۔۔۔''

مقبول اکیڈمی کا ادبی سفر جاری و ساری رہا۔۔۔ملک مقبول احمد لکھتے ہیں کہ

''رسالہ چودھویں صدی کا ذکر ان کے لیے اب بھی بے پایاں خوشی فراہم کرتا ہے۔''

شاہ عالم مارکیٹ سے دفتر سمیٹنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ چودھویں صدی کی اہم فائلوں کی حفاظت نہیں ہو سکی۔ مگر کچھ عرصے قبل، رسالے کی کچھ دستیاب جلدیں جناب جمیل آذر کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کی گئیں اور تب ہی یہ فیصلہ ہوا کہ چودھویں صدی کے بلند ادبی معیار کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے اس دستیاب مواد میں مضامین، افسانے اور شاعری کو (جو اَب نایاب ہیں) کتاب کی صورت میں منظر عام پر لایا جائے۔۔۔

اس تجویز کو جناب اظہر جاوید، ڈاکٹر طارق عزیز، جناب آصف بھلی اور ناصر نقوی

نے بھی بہت سراہا۔۔۔اور اس طرح یہ گمشدہ خزانہ ''گلشنِ ادب''، ''ارمغانِ غزل'' اور ''گمشدہ افسانے'' کے نام سے منظر ادب پر جلوہ افروز ہوا۔۔۔ان تمام ادبی کتابوں کے تعارفی مضامین ڈاکٹر انور سدید صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔۔اور ''گمشدہ افسانے'' کو جدید اُردو انشائیہ کے تعارف نگار اور انشائی تنقید کے نظریہ ساز پروفیسر جمیل آذر کے نام خلوص اور محبت کے ساتھ کیا گیا ہے۔کتاب کا سرورق جناب انیس یعقوب کے حسین تخیل کا آئینہ دار ہے۔۔۔

ان گمشدہ افسانوں میں مجھ ایسے ادنیٰ ''طالبانِ علم'' کے لیے نہایت دل چسپی کا سامان موجود ہے۔کیوں کہ ان میں جناب ریاض بٹالوی کے افسانے اور ناولٹ ''انتظار کے بعد، ''بڑا گھر''، ''روشنی اور اندھیرے''۔۔۔محترمہ الطاف فاطمہ کا افسانہ بیچلرز ہوم اور رام لعل کا افسانہ ''لفنگا''۔۔۔اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ افسانے اور ناولٹ جب ''چودھویں صدی'' میں چھپے تو اپنے دبیز رومانوی فضا اور دردمندی پر مبنی ماحول کی بناء پر قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔۔۔

ڈاکٹر انور سدید ان افسانوں کی تازگی اور توانائی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''پاک و ہند 1957ء کے افسانوں کا ایک کڑا انتخاب کیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ پانچ تخلیقات اس میں ضرور شامل ہوتیں۔مَیں نے نصف صدی کے بعد انہیں دوبارہ پڑھا ہے تو مجھے ان میں مصنفین کا اپنے معاشرے کا مشاہدہ، کرداروں کا مطالعہ اور ماحول کی پیش کش میں تازگی اور توانائی نظر آئی۔۔۔''

معاشرے کے زندہ اور فعال کرداروں کا گہرا مشاہدہ اور خوبصورت منظر کشی ان افسانوں کی بنیادی خصوصیات ہیں۔۔۔یہ افسانے بے حسی کے اِس دور میں بھی دردمندی کا

درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ریاض بٹالوی کی کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل پی ٹی وی لاہور سنٹر نے بڑی کامیابی سے 80ء کی دہائی میں پیش کی تھی۔۔۔اور آج بھی یہ افسانے پڑھتے ہوئے ان میں ڈرامائی تاثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔''انتظار کے بعد''اور روشنی اور اندھیرے میں سینی ٹوریم کی سوگوار فضا سے استفادہ کیا گیا ہے۔۔۔منظر کشی میں ریاض بٹالوی کے قلم کی سحر انگیزی ان سطور سے ملاحظہ کیجئے۔۔۔

> ''سرد ہوائیں تھکی تھکی تھیں۔رات کے گھمبیر اندھیروں میں شہر کی ساری سڑکیں سنسان پڑی تھیں اور آسمانی جھیلوں کے سنہری کنول آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔۔۔اُفق کے ساتھ ساتھ بہنے والی غیر مرئی روشنی کے دامن میں تنہائی کے گیت سو رہے تھے۔''(روشنی اور اندھیرے)

سالمی سے شروع ہونے والی یہ کہانی سینی ٹوریم کی چند کہانیوں میں سے ہے جو قربان طاہر (مریض) اور شوکت آراء (نرس) کے گرد گھومتی تھی۔۔ روپہلی چاندنی، روشنیوں کے شہر اور ناریل کے درختوں کے سائے فراموش کرتے ہوئے، لمحہ لمحہ موت کے لمس کو بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں میں محسوس کرتے ہوئے کردار، روشنی اور اندھیرے کی جانب بڑھتی ہوئی جلتی بجھتی زندگی۔۔۔ بلاشبہ یہ افسانہ لائقِ مطالعہ ہے۔ انتظار کے بعد ناولٹ ہے۔جس میں بھی موت اور زندگی کی کشمکش، مسیحائی اور سوگوار سینی ٹوریم کی فضا قاری کو دل گرفتہ کر دیتی ہے۔۔دورانِ مطالعہ، جناب اشفاق احمد کے''شب خون'' کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے جو ٹی بی کے مریضوں اور سینی ٹوریم سے لپٹی جنگلی بیلوں اور انسانی رشتوں کے افسانے تھے۔۔۔مگر ہر موضوع، ہر مصنف کی انفرادی ٹریٹمنٹ کا محتاج ہوتا ہے۔۔۔''انتظار کے بعد'' کی رومانوی فضا اور ''زلیخا'' کی تلمیح کو معنویت عطا کرتا ہوا اختتام قاری کے ذہن پر ایک منفرد اثر چھوڑ جاتا ہے۔۔''محبت کبھی نہیں بھولتی، کہیں اجنبی

نہیں، وہ گھروں کو پہچان لیتی ہے۔۔۔ چہروں کو جان لیتی ہے۔"

ڈاکٹر کی نگاہوں میں پرانی کہانیوں کے مسیح کردار گھومنے لگے جب بوڑھے پادری دن، رات، گنجان، جنگلوں اور پہاڑی کی کھو میں عیسیٰ کا سراپا ڈھونڈتے رہتے تھے۔۔۔ انہیں کہیں انجیر کے درخت سے نورانی کرنیں نکلتی دکھائی دیتی تھیں اور کہیں پتھروں میں صلیب کا نشان نظر آتا۔۔۔ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر عبادت کرتے اور ان کی کنواری لڑکیاں زبور کے نغمے الاپتیں۔۔۔ ریتلے ساحلوں پر قدموں کے نشان تلاش کرتیں۔" (انتظار کے بعد)

"عبادت ہو رہی تھی اور لڑکیاں صبح کا گیت گا رہی تھیں۔ ان کی پُرسکون آواز سے گناہوں کی تاریکی سمٹ رہی تھی۔۔۔

Awake my soul, and with the sure.
All Praise to thee who safe hast kept.
Now that the day light fills sky, we praise these, not the night is over. O`Lord of life, the quickling voice, "The darkness is over."

حسین انجلینا، زینت کی رقیبانہ محبت اور ڈاکٹر "رومیو" کی ٹرائی اینگل چاندنی راتوں میں لیونڈر کے گھنے درخت کے مہک، کتابوں میں محفوظ خشک پھول، پرانی البم میں بسی یادیں، شیلے کی نظمیں، لیونارڈو ونچی کی مونا لیزا اور ڈزورتھ کی لوسی اور پرانی قبروں پر چڑھے پھول۔۔۔۔ "انتظار کے بعد" میں آج کا قاری ایک عرصے بعد ایسی سوگوار رومانوی فضا کو دل میں اُترتے ہوئے محسوس کرے گا۔۔۔

محترمہ الطاف فاطمہ کے افسانے سادگی اور معصومیت کی تکنیک سے گوندھے

ہوئے افسانے کہلائے جاتے تھے۔ ''بیچلرز ہوم'' بھی چار ''کنوارے نوجوانوں'' کے اپنے جذبات واحساسات (جو آج کے دور میں شاید ہی پائے جائیں)۔۔۔ جو اخلاقیات اور اقدار کے بندھنوں میں جکڑی یک طرفہ، غیر مذکورہ محبت کے ردِعمل کے طور پر جنم لیتے ہیں پر مبنی افسانہ ہے۔ جو الطاف فاطمہ کی فن پر مضبوط گرفت کا عکاس بھی ہے۔۔۔

رام لعل کا افسانہ ''لفنگا'' سکھ کلچر کے مشاہدات کا افسانہ ہے۔ اس کا موضوع بھی محبت ہے۔ معاشرے کے بے کار اور غیر ذمہ دار افراد کو فعال صورت صرف محبت ہی عطا کر سکتی ہے۔ یہی اس کا بنیادی خیال ہے۔ جناب ملک مقبول احمد نے نہ صرف ان افسانوں کو طباعتِ نو سے مرصّع کیا ہے۔ بلکہ اہلِ ادب کو گمشدہ تخلیقات کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا ہے۔ وہ خود ادیب ہیں۔ اس لیے ادب کو تخلیق کے معیار پر بڑی خوبی سے تخلیق کرتے ہیں اور خود مؤلف ہیں۔ اس لیے ادیب کو جاودانی کے معیار پر بازیافت کرتے ہیں۔ گہر نایاب تلاش کرنا۔۔۔ ان کا فن ہے اور ''گمشدہ افسانے'' ان کے اسی فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

۱۴۔اپریل ۲۰۱۱ء

☆☆☆

ارمغانِ غزل

2007ء میں جب میں ''راہ نوردِ شوق'' سپردِ قلم کر رہا تھا تو اس وقت مجھے پندرہ روزہ ادبی رسالہ ''چودھویں صدی'' جسے ملک مقبول احمد نے 1956ء میں جاری کیا تھا دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ''راہ نوردِ شوق'' میں ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کے حوالے سے لکھ رہا تھا۔ ملک صاحب نے مجھے اس پرچہ کی دو جلدیں مہیا کیں۔ میں وہ پرچہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ ادبی پرچہ پڑھ کر ایک تو پچاس کے عشرہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ دوسرے اس پرچہ میں مستقبل کے بڑے قد آور شاعروں کا کلام شامل تھا۔ جنہوں نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔ میری مراد یہاں احسان دانش، شان الحق حقی، حمایت علی شاعر، عارف عبدالمتین، ماہر القادری، استاد قمر جلالوی، راغب مراد آبادی، حافظ لدھیانوی اور جمیل ملک وغیرہ سب ہے۔ اس پرچے کے ادبی نگران جناب احسان دانش تھے۔ جو اس وقت ملک کے نامور شاعر اور دانش ور تھے۔ اس پرچہ میں تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین بڑے اہتمام سے شائع ہوتے تھے اور جن میں بقول ڈاکٹر انور سدید ان میں ''احسان دانش کے فکر و نظر اور اسلوب ادارت کی پختہ مہر لگی ہوئی ہے۔'' میں نے جب ان دو جلدوں میں مندرجات کو پڑھا تو ملک مقبول احمد صاحب سے کہا کہ آپ ''چودھویں صدی'' کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کریں تاکہ یہ معیاری تخلیقات وقت کی تباہ کاری سے بچ جائیں۔ ملک صاحب باکمال شخصیت کے مالک ہیں۔ جب انہیں کوئی نیک مشورہ

دیتا ہے تو وہ اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ میرے علاوہ بعض اور دوستوں نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا۔ لہٰذا انہوں نے غزلیات، تنقیدی و تحقیقی مضامین اور افسانوں پر مشتمل تین کتابیں مرتب کر ڈالیں۔ اس وقت میرے سامنے غزلیات کا مجموعہ ''ارمغان غزل'' ہے۔ جو نہایت خوبصورت انتخاب ہے۔

احسان دانش بنیادی طور پر کلاسیکل مزاج کے شاعر ہیں۔ وہ شاعری کو محض تفریح طبع کے طور پر نہیں لیتے۔ ان کے نزدیک شاعر معاشرے کا نہایت حساس، زیرک اور باشعور فرد ہے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے معاشرے کو خوب سے خوب تر بنانے کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ ان کا یہ شعر اس تصور حیات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے:

انسان ابھی انسان کی قیمت نہیں سمجھا
شاعر کے فرائض میں ابھی کام بہت ہے

احسان دانش کے ہاں حسن تغزل بھی بھرپور انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کے حسن تغزل کی غمازی کرتے ہیں:

ان کا منشاء تھا یہی وہ آشکارا ہو گئے
آنکھ اٹھا کر ہم گنہگار تقاضا ہو گئے
حسین سیرت چھوڑ کر صورت پہ شیدا ہو گئے
ہم خود آمادہ بر توہینِ تمنا ہو گئے
جانِ خلوت بھی وہی تھے، روح جلوت بھی وہی
اُن کا جانا تھا، کہ ہم دنیا میں تنہا ہو گئے

اس مجموعہ کلام میں احسان دانش کی کل آٹھ غزلیں شامل ہیں جو ان کے تصورِ حیات اور فکر و نظر کی مظہر ہیں۔ اس انتخاب میں جگن ناتھ آزاد کی صرف ایک غزل

شامل ہے۔ جوان کے قادرالکلام ہونے کی دلیل ہے۔:

وہ مجھ سے دور تو اتنے نہیں ہیں
فقط اک بے یقینی درمیاں ہے
کوئی کیوں کر بتائے کیا بتائے
جو بُوئے گُل یہ پوچھے گُل کہاں ہے

شان الحق حقی اقلیم سخن کا ایک تابندہ نام ہے۔ انہوں نے شروع ہی سے ''چودھویں صدی'' کو اپنے کلام سے زینت بخشی۔ ملک مقبول احمد نہایت خوش نصیب انسان ہیں۔ جنہیں جہاں احسان دانش جیسے نامور شاعر کا تعاون حاصل رہا۔ وہاں انہیں شان الحق حقی کی سرپرستی بھی نصیب رہی۔ اس انتخاب میں حقی صاحب کی کل سات غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ غزل بھی ہے جسے ملک کی نامور سنگر ناہید اختر نے گایا تھا۔ اس کے گلے کے جادو نے اس غزل کی دھوم گاؤں گاؤں، قریہ قریہ اور شہر شہر مچادی تھی۔ اس غزل کے بول یہ ہیں:

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے
لذت درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جاتے
وہی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غم ہستی سے نباہے جاتے

''چودھویں صدی'' کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں ان شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا جو نہ صرف اپنے زمانہ میں معروف تھے بلکہ آئندہ چل کر وہ آسمان ادب پر روشن

ستاروں کی طرح چمکے۔ انہی جگمگاتے ستاروں میں حمایت علی شاعر بھی ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں ان کی ایک غزل شامل ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے جان کا ضامن جاگتے رہنا
قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو! رات ہو یا دن جاگتے رہنا
آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن جاگتے رہنا
راہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو
دوست کا کیا ظاہر کیا باطن جاگتے رہنا

قتیل شفائی اور سیف الدین سیف کی طرح حمایت علی شاعر کا کلام بھی فلمی دنیا کی زینت بنا اور زبان زدِ خاص و عام ہوا۔ حمایت علی شاعر کی اس غزل کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

شعراء کی اس کہکشاں میں ہمارے دوست جمیل ملک بھی موجود ہیں۔ جمیل ملک ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اور وہ احمد ندیم قاسمی اور احمد ظفر کے قریب دوستوں میں سے تھے۔ افسوس اب یہ تینوں دوست اس دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کا کلام سدا ایوانِ ادب میں جگمگاتا رہے گا۔ اس انتخاب میں جمیل ملک کی صرف ایک غزل شامل ہے۔ اس غزل کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

روز کرتے ہیں علاجِ غمِ انساں ہم لوگ
زندگی روز نئے زخم دیئے جاتی ہے

''چودھویں صدی'' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جہاں نامور شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ وہاں چند غیر معروف شعراء کرام کا کلام بھی ان کی اہمیت کے اعتبار سے جگہ پاتا تھا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ موجودہ انتخاب میں دو شعراء کرام ایسے بھی ہیں جو نہایت غیر معروف تھے لیکن ان کا کلام اس میں موجود ہے میری یہاں مراد نیاز عرفان ایم اے اور ظہور الحسن خان ارزش سے ہے۔ ظہور الحسن خان ارزش اور نیاز عرفان ایم اے گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی میں میرے ساتھی تھے۔ نیاز عرفان فلسفہ کے پروفیسر تھے اور ارزش فارسی کے ارزش کو تو اس جہان فانی سے کوچ کیے بہت عرصہ بیت گیا ہے۔ البتہ نیاز عرفان بقید حیات ہیں اور تا حال بڑی مستعد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ بات مجھ پر پہلی مرتبہ منکشف ہوئی کہ نیاز عرفان کبھی شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ نیاز عرفان کی غزل کا ایک شعر دیکھئے:

دنیا میں ہیں رقیب نگاروں کے ساتھ ساتھ
ملتے ہیں کچھ بھنور بھی کناروں کے ساتھ ساتھ

ظہور الحسن خان ارزش کی غزل کا شعر بھی ملاحظہ ہو:

سکون قلب و جگر ہے غم تمام کی آگ
کشورِ کار ہو جس سے وہی ہے کام کی آگ

ان دو شعراء کرام کا ذکر کرنے سے میری یہ مراد ہے کہ ''چودھویں صدی'' نے ادب کی آبیاری میں کشادہ نظری کا بھرپور ثبوت دیا تھا۔ اور یہ احسان دانش کا ادب پر بہت بڑا احسان تھا کہ انہوں نے اپنے سامنے صرف میرٹ کو رکھا نام کو نہیں۔

''چودھویں صدی'' چند اشاعتوں کے بعد ہی ادبی دنیا میں اپنا ایک معتبر مقام بنا چکا تھا۔ اس میں شائع شدہ بعض مضامین، نظمیں اور غزلیں چند دیگر ادبی رسائل بلا اجازت مکرر اشاعت کے لیے اچک لیتے تھے لیکن افسوس اس ادبی پرچہ کا بھی وہی انجام ہوا جو کئی دیگر ادبی رسائل کا ہو چکا ہے۔ اقتصادی طور پر خود کفیل نہ ہونے کی وجہ سے ملک صاحب کو چار سال کامیابی سے اس پرچے کو نکالنے کے بعد بند کرنا پڑا۔ اقتصادی طور پر خود کفیل نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مفت پرچے مانگنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی جب کہ خرید کر پرچہ پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ قلمی معاونین نے اس کی بندش پر تو بہت احتجاج کیا لیکن انہوں نے خریداروں کی تعداد بڑھانے والوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی، اس کے علاوہ ادب ناشناس حکومت کی غفلت اور عدم تعاون بھی ادبی پرچے کے جاری رکھنے میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ میں یہاں ان تمام مدیروں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ جو نامساعد حالات اور مشکلات کے باوجود اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے عرصہ دراز سے ادبی جرائد کو نہایت کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ ان ادبی رسائل کو جاری رکھنے میں ان کی حتی الوسع مالی اعانت کرتے رہیں۔ ملک مقبول احمد صاحب ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمارے ادب کی اہم ترین صنف سخن کے ابتدائی مراحل کو پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے ''ارمغان غزل'' میں اپنے ''چودھویں صدی'' کے وسیلے سے محفوظ کر لیا۔ ان کا یہ گراں قدر کام اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کا کام دے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید

ارمغان غزل

بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ 1956ء میں لاہور سے ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ ''چودھویں صدی'' کے نام سے آج کی معروف ''مقبول اکیڈمی'' کے ڈائریکٹر ملک مقبول احمد شائع کرتے تھے۔ جس کے ادبی حصے کے نگران ملک کے ممتاز شاعر احسان دانش تھے۔ یہ رسالہ اب وقت کی گردش میں قصہ پارینہ بن چکا ہے لیکن اس کے دامن میں قیمتی جواہر پارے، ادبی مضامین، نظمیں اور غزلیں محفوظ ہیں۔ ''چودھویں صدی'' کی ایک فائل پروفیسر جمیل آذر نے دیکھی تو ملک مقبول احمد کو مشورہ دیا کہ وہ ''چودھویں صدی'' کے مضامین نظم ونثر کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کریں۔ زیر نظر کتاب ''ارمغان غزل'' اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو خوبصورت کتابت اور طباعت میں منظر عام پر آ گئی ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالہ ''چودھویں صدی'' کو ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کے لیے اور اعلیٰ معیار کے ادبی مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے حاصل کرنے کے لیے جناب احسان دانش کے نام کی عظمت اور شہرت نے جادو کا کام کیا اور چند اشاعتوں کے بعد ہی رسالہ ''چودھویں صدی'' ملک کا معروف ادبی پرچہ بن گیا۔''

اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب ''ارمغان غزل'' میں جو غزلیں شامل ہیں، ان کا انتخاب جناب احسان دانش نے کیا تھا اور غزل نگاروں میں

جناب جگن ناتھ آزاد، سردار جلیل شیر کوٹی، شان الحق حقی، حمایت علی شاعر، عارف عبدالمتین، وامق عظیم آبادی، الم مظفر نگری، ناطق گلاٹھوی، ماہر القادری اور ذوقی مظفر نگری جیسے ممتاز شعرائے کرام شامل ہیں۔ اس مجموعے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ جناب احسان دانش نے متعدد نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی 1957ء میں کی اور انہیں اعتماد حاصل کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور کے نئے نام آج اردو غزل میں تابندہ درخشندہ نام شمار کیے جاتے ہیں۔ چند نام یہ ہیں۔ سیف زلفی، حافظ لدھیانوی، بشیر بدر، اعجاز احسان، جمیل ملک، نصرت قریشی وغیرہ اس لحاظ سے اردو غزل کا یہ انتخاب سینئر اور جونیئر شعراء کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جو 1950ء کی دہائی میں لکھی جانے والی غزل کا نمائندہ ہے لیکن جس کی تازگی آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت''

05-09-2010

☆☆☆

محمد آصف بھلی

محترم ملک مقبول احمد صاحب

سلام ورحمت۔آپ نے ''ارمغانِ غزل'' مرتب کر کے اربابِ ذوق پر ایک اور احسان کیا ہے۔یہ ایک ادبی خزانہ تھا جسے اگر آپ اپنے زیرِادارت شائع ہونے والے جریدے ''چودھویں صدی'' کی فائلوں سے تلاش کر کے ایک کتاب کی صورت میں محفوظ نہ کرتے تو نئی نسل اس ادبی سوغات سے کبھی مستفید نہ ہو سکتی۔''ارمغانِ غزل'' کے پیش لفظ کے مطالعہ سے آپ کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ''چودھویں صدی'' کی صرف ایک سال کی فائل آپ کے پاس محفوظ رہی۔ گویا تین سال کا قیمتی ریکارڈ دستیاب نہیں رہا۔کاش! ''چودھویں صدی'' کی تمام فائلیں میسر آسکتیں تو ''ارمغانِ غزل'' کی شان کو چار چاند لگ جاتے۔غنیمت ہے کہ جو فائل آپ کے پاس محفوظ تھی وہ آپ نصف صدی بعد منظر عام پر لے آئے ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ایک سال کا ریکارڈ اتنا وقیع ہے تو چار سالوں کے ''چودھویں صدی'' میں کیسے کیسے لعل و جواہر چھپے ہوں گے۔

''ارمغانِ غزل'' کا انتساب آپ نے جن الفاظ کے ساتھ میرے نام کیا ہے۔اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں سوجھ رہے۔ یہ انتساب صرف اور صرف آپ کی برادرانہ محبت کا مظہر ہے۔ ورنہ پاکستان کے تمام بڑے اہل قلم سے آپ کی ذاتی دوستی کا عرصہ نصف صدی پر محیط ہے۔ادیبوں اور شاعروں کی ایک کہکشاں ہے جن میں سے ایک ایک

ستارہ دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن آپ نے ''ارمغانِ غزل'' کا انتساب ایک ذرۂ بے مقدار کے نام کر دیا ہے۔ اسے کہتے ہیں ذرّے کو آفتاب بنانا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں میرے لیے کتنی عزت ہے۔ لیکن میں اسے آپ کا بڑا پن سمجھتا ہوں کیونکہ من آنم کہ من دانم والا معاملہ ہے۔ آپ کا اپنی کتاب کا میرے نام انتساب میرے لیے بڑے سے بڑے ادبی ایوارڈ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت اور وقعت کا حامل ہے۔ اس کے پیچھے آپ کی چھپی ہوئی محبت اور خلوص کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔

والسلام

محمد آصف بھلی

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

ارمغانِ غزل

جناب ملک مقبول احمد، مالک و ناشر مقبول اکیڈمی اپنی خودنوشت، سوانح ''سفر جاری ہے'' کے صفحہ 51 پر میری زندگی حقیقت کے تحت لکھتے ہیں:

سپاس و حمد بے پایاں خدارا
کہ صنعش در وجود آورد مارا

میں ذات باری تعالیٰ کی اس کرم فرمائی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے میری صحت مند تخلیق کی، ''میرے والدین کو میری پرورش کے جملہ وسائل مہیا کیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے انسان پیدا کیا اور حضرت محمد ﷺ کی امت میں پیدا کیا۔

انہی ملک مقبول احمد صاحب کی ایک تالیف جدید ''ارمغانِ غزل'' اس وقت میرے زیر مطالعہ ہے۔ جس کے محاسن پر ایک نظر ڈالنی مقصود ہے۔ لفظ ''ارمغان'' کا مطلب حضرت نسیم امروہوی نے یہ لکھا ہے:

(فارسی، مذکر) تحفہ، ہدیہ، قابل قدر، گراں قیمت (چیز) (فرہنگ اقبال اردو صفحہ 17)

''غزل'' کے بارے میں حضرت نسیم امروہوی یوں رقمطراز ہیں:

''(عربی، مونث) ہم قافیہ و ہم ردیف (اگر ردیف ہو تو) اشعار جن میں حسن و عشق، وصال و فراق۔

اور واردات و معاملات عشق کے مضامین نرم اور گداز لہجے میں نظم رقم کیے

جائیں۔'' ایضاً صفحہ 572)

''ارمغان غزل'' دراصل انتخاب و مجموعہ ہے ملک مقبول صاحب کے قلمی نام ایم اے ملک کی زیرادارت شائع ہونے والے ایک ادبی پرچے پندرہ روزہ ''چودھویں صدی' کی ایک سال کی فائل سے حاصل کردہ غزلوں کا۔ یہ ''چودھویں صدی'' کی دوسری جلد تھی۔ یکم جنوری تا 31 دسمبر 1957ء۔ اس رسالہ کے ادبی شعبہ کے نگران معروف شاعر احسان دانش تھے۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' تین چار سال تک رنگِ بہار دکھاتا رہا۔ پھر نامساعد حالات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اور اس کی فائلوں میں سے صرف ایک فائل ملی۔ اس سے انتخاب کیا گیا ہے۔ دراصل اس ذریعے سے چودھویں صدی کو پندرہویں صدی میں لانے کا معجزہ دکھایا گیا ہے۔ ایک مشاعرے میں شعری ذوق کے مالک نے عرش تخلص کے حامل شاعر کو یہ شعر کہہ کر اسٹیج پر بلایا:

معجزہ آپ کو دکھاتا ہوں

عرش کو فرش پر بلاتا ہوں

بالکل ایسے ہی ملک مقبول صاحب نے معجزہ دکھایا ہے کہ چودھویں صدی کا سورج پندرہویں صدی میں چڑھا دیا ہے۔ ''ارمغان غزل'' کی رونمائی ہوتی ہے۔ ٹائٹل پر بنی مصور کے ہاتھ کی ایک مغنیہ کی کلاسیکل تصویر سے جو ستار یا سارنگی پر اپنی انگلیاں چلا رہی ہے۔ بیٹھنے کا انداز محبوبانہ، چہرے کی واردات محجوبانہ، انگلیوں کی حرکت معشوقانہ، لباس مستورانہ، پورٹریٹ جمالیاتی ذوق سے معمور، شاید کسی کے لیے یہ ٹائٹل قابل اعتراض ہو مگر ''ارمغانِ غزل'' جیسی کتاب کے لیے اس سے بہتر ٹائٹل ہو ہی نہیں سکتا۔

بیک ٹائٹل پر فاضل مرتب گھرے ہوئے ہیں۔ اپنے مداح قلمکاروں کے قلمی گجروں اور ادبی تحفوں میں ''گیارہ مداحوں کے رشحاتِ قلمی سے ملک صاحب کے بارے میں چنیدہ اقتباسات اور پسندیدہ خیالات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ فلیپ پر احسان دانش کی

نعت کا مطلع اور مقطع دیا گیا ہے۔ یہ نعت کتاب کے اندر صفحہ 19 تا 21 موجود ہے۔ پھر احسان دانش کی غزلوں میں سے تین اشعار رقم کیے گئے ہیں۔ بیک ٹائٹل کے اندرونی فلیپ پر جلیل قدوائی، جلیل شیر کوٹی اور شان الحق حقی کے غزلیہ اشعار سجائے گئے ہیں۔

ارمغانِ غزل کا انتساب سیالکوٹ کے نامور کالم نگار، قلمکار، محقق اور مدقق جناب آصف بھلّی کے نام ایں الفاظ کیا گیا ہے۔

''شہرِ اقبالؒ (سیالکوٹ) کے نامور فرزند، ادب و صحافت کے گوہر نایاب محمد آصف بھلّی کے نام جن کا آئین، حق گوئی و بے باکی ہے۔''

ارمغانِ غزل کی فہرست دو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

عرض سدید میں ڈاکٹر انور سدید نے ''ارمغانِ غزل'' کے بارے میں چھ صفحات میں ایک بسیط دیباچہ تحریر کیا ہے۔ جس میں کتاب ''ارمغانِ غزل'' سے سولہ اشعار ان کی نظر انتخاب کا شکار ہو کر مختلف عبارتوں کے درمیاں سج گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دیباچہ میں صفحہ 10 پر ڈاکٹر قمر میرٹھی کی نعت کا ایک شعر مولانا ظفر علی خان کی زمین میں قافیہ بدل کر حوالۂ قرطاس کیا ہے۔

فرماں روائے کشور احساں تمہی تو ہو
جبریلؑ جن کے در کے ہیں درباں تمہی تو ہو

پیش لفظ میں ملک مقبول احمد نے ''ارمغانِ غزل'' کے لیے تحریک کنندگان اور غزل گو شعراء کا ذکر خیر کر کے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اب آتے ہیں ارمغانِ غزل کے اصل یعنی شعری خزینہ کی طرف جو صفحہ 19 تا صفحہ 157 پر مشتمل ہے۔

''چودھویں صدی'' کی بازیافت اور اس کی غزلوں، افسانوں اور ادبی مضامین کی اشاعت کے محرک پروفیسر جمیل احمد آذر ہیں۔ جو ملک صاحب کے دیرینہ رفیق، ہمدم و دم ساز

اور ''سفر جاری ہے'' سے متاثر ہو کر ''رہ نوردِ شوق کی تخلیق کرنے والے محرمِ راز ہیں۔
ملک صاحب نے اپنے پیش لفظ میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ ''چودھویں صدی'' کی
تین سال کی ریکارڈ فائلیں زمانہ کی دست برد سے نہ بچ سکیں۔ ورنہ آج ''ارمغان غزل''
کی ضخامت بالیقین ساڑھے چار سو صفحات سے زیادہ ہوتی۔ کتاب کا آغاز احسان دانش کی
نعت سے ہوتا ہے۔ جس کا مطلع اور مقطع زیادتِ ایمانی اور وفورِ عشق کے لیے لکھ رہا ہوں:

مطلع:

ہر صبح ہے نورِ رُخِ زیبائے محمدؐ
ہر شام ہے گیسوئے دل آرائے محمدؐ

مقطع

دانش مری آدابِ محبت پہ نظر ہے
قبلہ ہے مرا نقشِ کفِ پائے محمدؐ

مائل نقوی کی نعت ''شبِ معراج'' کا مقطع یوں ہے:

مانگنا ہے جو تجھے مانگ لے تو بھی مائل
کھل گیا درِ فیض و عطا کی آج کی رات

احسان دانش کی پہلی غزل کا مطلع یوں دردِ دل پہ دستک دیتا محسوس ہوتا ہے:

حساس دلوں کے غم و آلام بہت ہے
اس دور میں جیتے ہیں یہی کام بہت ہے

دیکھئے احسان دانش اسی غزل کے مقطع میں کیا کہہ رہے ہیں:

ہر چند کہ میں رحمتِ حق سے نہیں مایوس
دانش مجھے اندیشۂ انجام بہت ہے

احسان دانش کی دوسری غزل پچیس اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:

مطلع:

عشرت محفل بنے لطف سراپا ہو گئے
تم تو دنیا سے ملے ایسے کہ دنیا ہو گئے

مقطع

پرسشِ احوال پر احسان بھر آتے ہیں اشک
دل شکستہ ہم توقع سے زیادہ ہو گئے

غرض، احسان دانش کی تمام غزلوں میں جذبات و احساسات کو Touch کرنے والے اور نرم گداز سوچوں کو بیدار کرنے والے تخلیات اور ادبی بندشیں موجود ہیں۔ جو واقعتاً پڑھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

صفحہ 52 پر جلیل قدوائی کی غزل کا عنوان ہے۔ ''دوغزلیں'' اس کا مطلع پڑھئے اور گیس Guess کیجئے کہ یہ کس قسم کے عاشق کے جذبات کا اظہار ہے؟

ناشاد کر دیا تو کبھی شاد کر دیا
دل کو تمہارے کھیل نے برباد کر دیا

جگن ناتھ آزاد کی غزل کا یہ شعر اپنے قاری کو فکر و تخیل کی ایک ایسی رومانوی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں ہر جفا پر خاموشی اور ہر عطا پر خاموشی ہے۔ ہر جفا کو عطا سمجھ کر زبان بندی عشق کا پہلا دستور ہے علامہ اقبال کے اس مصرعے ''خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری'' کی حقیقت کو آزاد صاحب نے بیان کیا ہے:

یہ راز اہل فغاں پر فاش کر دو
خموشی بھی اک انداز فغاں ہے

سردار جلیل شیر کوٹی کی غزل ''حدیثِ دگر'' کا مقطع بڑا دل آویز ہے فرماتے ہیں:

ہر ایک انجمن میں لب پر تیرے ذکرِ غیر بر حق
کبھی میرا دم بھی بھرتے تو کچھ اور بات ہوتی!

شان الحق حقی، دیکھئے، اس غزل میں کچھ کس معصومانہ اور عاشقانہ خواہش کا اظہار کرتے نظر آ رہے ہیں:

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

مظفر الم نگری کی ''دعوتِ نظر'' میں یہ مقطع پڑھیے اور سر دُھنیے:

ملحوظ رکھ الم ادب اہل مے کدہ
ساقی ہو یا مغاں ہیں سبھی برگزیدہ دیکھ

ذرا ٹھہریئے اور بصارت دل سے یہ شعر سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ناطق گلاٹھوی کیا پوچھ رہے ہیں۔

نہیں ناطق کچھ آگے جستجو اسرار ہستی کی
ہمیں تو آدمی اتنا بتا دے، آدمی کیا ہے!

وامق عظیم آبادی کی محبت کا ذائقہ روایتی محبت سے مختلف ہے تبھی تو وہ ''ڈھلتے سائے'' میں یہ کہتے نظر آ رہے ہیں:

اللہ اللہ یہ تکلف، یہ توجہ یہ کرم
شائد اب ان کی محبت میں کمی آنے لگی

حمایت علی شاعر نے شاید دوستوں سے زخم کھایا ہے جو اپنی غزل میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

رہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو

دوست کا کیا ظاہر کیا باطن، جاگتے رہنا

غزل گوئی کا آہنگ پھیلتے پھیلتے یہاں تک آ پہنچا کہ ڈاکٹر قمر بھٹی کو اپنی غزل میں یہ کہنا پڑا:

عشق سے وہ لفظ غم میں وسعتیں آئیں قمر

زندگی نقطے سے بڑھ کر داستاں تک آ گئی

جناب عارف عبدالمتین، جناب بشیر بدر، جناب عثمان صدیقی، تینوں شعرا کی غزلیں طویل بحر میں ہیں۔ ماہر القادری کی غزل میں مطلع میں 'دیکھئے' شاعر کس مان سے تسلی کا اظہار کر رہے ہیں اور دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں:

اس طرف بھی نظر اے دیدۂ صاحبِ نظراں!

میں نے ذروں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں

ذوقی مظفر نگری نے اس شعر میں کیا خوب تخیل پیش کیا ہے:

اہل وفا کی بزم کا جب سے چراغ گل ہوا

راحتِ دوستی کے ساتھ عظمتِ دشمنی گئی

رکیے رکیے! ذرا ارشد صدیقی کا یہ تخیلاتی تحفہ تو دل و نظر کے حوالے کرتے جائیے

جان گلشن ہیں جو پھول ارشدؔ

مسکراتے ہیں کانٹوں میں پل کے

کیا حافظ لدھیانوی کے اس شعر میں غالب کا رنگ نظر نہیں آتا؟ تبھی تو غالب کی پیروی میں میر کے لیے رطب اللسان ہیں۔

غزل کے اور بھی استاد ہیں مگر حافظ

کہاں وہ میر کا انداز اس کا رنگ سخن

ڈاکٹر سید اکرام حسین عشرت ''دل دیاں لگیاں'' میں نفع ونقصان سے یوں صَرفِ نظر کر کے شعر کہتے ہیں:

شایانِ شانِ دل نہیں سودائے بیش و کم
راہِ وفا ہے منزل سود و زیاں سے دور

مقطع ملاحظہ کیجئے:

عشرت عبث ہے کوششِ ترکِ خیالِ دوست
اب تیر جا چکا ہے میری جاں کماں سے دور

دیکھئے نصرت قریشی نے یہ کتنا رومانی شعر کہا ہے، ہر بار پڑھیئے ہر بار نئی تعبیر کیجئے:

پڑیں کس کی نظریں چشمِ نرگس پر لبِ گل پر
تیرے ہوتے ہوئے حُسنِ گلستاں کون دیکھے گا

ارزشؔ اپنے کلام کی گرمی سے دل وجگر رکھنے والے عاشقوں کو رُلا بھی رہے ہیں اور پگھلا بھی رہے ہیں۔

جنہیں ہے دعویٰ ضبط و قرار اے ارزش
وہ آزمائیں مری گرمیٔ کلام کی آگ

غرض کہ ہر شاعر کا اپنا اپنا رنگ ہے۔'اپنا اپنا آہنگ ہے، اپنا اپنا پیغام ہے، اپنا اپنا تخیل ہے اور ہر ذوق کے قاری کی تسکین کا سامان ہے جسے ملک مقبول احمد نے ''چودھویں صدی'' کی فائلوں کے انبار سے چن کر خوانِ شعری باذوق لوگوں کے لیے پیش کر دیا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ ''ارمغانِ غزل'' کے ذریعے پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' لاہور اب تادیر زندہ رہے گا۔

عمر زمان

ارمغانِ غزل

غزل وہ صنف شعروادب ہے جسے قدیم قرار دے کر نثری شاعری والوں نے اس کے خلاف بہت پروپیگنڈا کیا مگر غزل کی اہمیت کم نہ ہو سکی بلکہ نثری شاعری کو ابھی تک اہل ذوق نے تسلیم نہیں کیا۔ غزل کے ایک شعر میں فکر واحساس اور جذبے کی پوری کائنات سموئی جا سکتی ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جنہیں اساتذہ کے ہزاروں شعر ازبر ہوتے تھے اور وہ اپنی گفتگو میں موقع ومحل کے مطابق خوبصورت اشعار کا استعمال کرتے تھے۔ اب مشینی دور میں شاعری کی طرف توجہ کچھ کم ہوگئی ہے لیکن آج بھی غزل، گیت، نظم، نثری ادب کے شانہ بشانہ بلکہ ایک قدم آگے ہی نظر آتے ہیں۔ منتخب غزلوں سے قارئین میں دلچسپی پائی جاتی ہے۔ ہر انتخاب، انتخاب کرنے والے کے مزاج کی عکاسی بھی کرتا ہے کیونکہ اس کی ذاتی پسند پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ خالص میرٹ کی بنیاد پر شاعری کا انتخاب کم کم ہی سامنے آتا ہے۔

ملک مقبول احمد صاحبِ ذوق پبلشر ہیں اور خود بھی قلم کار ہیں۔ اشاعت کتب کے کاروبار سے منسلک ہونے کی وجہ سے ملک کے اہم ترین اہل قلم سے ان کے قریبی مراسم رہے ہیں اور ان مراسم کی وجہ ان کی زیرادارت ایک عرصہ تک شائع ہونے والا ادبی جریدہ ''چودھویں صدی'' بھی رہا۔ ''ارمغانِ غزل'' کے عنوان سے منتخب غزلوں کا زیرنظر مجموعہ زیادہ تر انہی شاعروں کی غزلوں پر مشتمل ہے جو ان کے جریدہ ''چودھویں صدی'' میں شائع ہوتے رہے۔ مجموعی طور پر کلاسیکی انداز کی یہ غزلیں بہت خوبصورت ہیں اور منتخب کرنے

والے کے اعلیٰ شعری ذوق کی مظہر ہیں۔اس مجموعہ غزلیات سے ہمیں اردو غزل کی ارتقائی منازل کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیا ہے۔ایک پیرا دیکھئے جس میں وہ ایک مشہور غزل کا حوالہ دے رہے ہیں جو پہلی بار ''چودھویں صدی'' میں شائع ہوئی، لکھتے ہیں'' رسالہ چودھویں صدی کو شان الحق حقی نے احسان دانش کی طرح اپنے کلام سے زیادہ نوازا۔اس کتاب میں ان کی سات غزلیں شامل ہیں اور ان میں وہ غزل بالخصوص قابل ذکر ہے جو مغنیہ ناہید اختر کی زبان سے نغمہ بار ہوئی تو یہ صدائے درد قریہ قریہ کوبہ کوپھیل گئی۔

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کی چاہے جاتے
لذتِ درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت سے کراہے جاتے

غزلوں کے معیار کے علاوہ یہ کتاب ظاہری حسن کے اعتبار سے بھی قابل توجہ اور شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کی لائبریری کا حصہ ہونے کے لائق ہے۔

ماہنامہ ''تخلیق''

دسمبر 2010ء

☆☆☆

آپس کی باتیں

برسبیل گفتگو

فہرست

آپس کی باتیں

برسبیل گفتگو

...........o...........

پروفیسر جمیل آذر

آپس کی باتیں

"آپس کی باتیں" ڈاکٹر انور سدید کے مختلف اوقات میں معروف صحافی اور ادبی حضرات کو دیئے ہوئے اٹھارہ انٹرویوز (Interviews) پر مشتمل کتاب ہے۔ جسے مقبول اکیڈمی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ وہ مقبول اکیڈمی کے اہم مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ اس اشاعتی ادارے نے جو ان کی کتابیں شائع کی ہیں اُن میں چند اہم کتابیں بر سبیل تنقید، میر انیس کی قلمرو، خطوط کے آئینے میں، اردو نظم کے اربابِ اربعہ، زندہ لوگ، پرندہ سفر میں اور ادب در ادب شامل ہیں۔ انہیں ادبی خدمات کے صلے میں تین طلائی تمغے اور چار قومی ایوارڈز مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید، کثیر الجہت ادبی شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، نقاد، محقق اور صحافی اور دانشور ہیں۔ ہر ہفتہ مختلف کتاب پر تبصرہ لکھنا اور ہر سال اُن نگارشات پر جو ادبی پرچہ ماہنامہ "تخلیق" میں شائع ہوئی ہیں، تبصرہ اور تجزیہ کرنا اُن کی ممتاز پہچان بن چکا ہے۔ انور سدید کثیر المطالعہ اور بسیار وزود نویس ہیں۔ یہ اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ انٹرویوز اُن کی مخفی اور ادبی سوانح حیات کا کام بھی دیتے ہیں۔ ان انٹرویوز میں سوالات کی نوعیت کے اعتبار سے تکرار بھی ملے گی۔ لیکن ان جوابات میں تکرار کے باوجود کہیں تضاد نظر نہیں آئے گا، کیونکہ انہوں نے جو کہا وہ سچ کہا اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ یہ انٹرویوز شخصی اور ادبی دونوں حوالوں سے دلچسپ ہیں اور قاری کہیں بھی کسی

اُلجھن کا شکار نہیں ہوتا انہوں نے جو باتیں کہیں فی البدیع کہیں۔ ان کا ادبی سفر نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے ہوسکتا ہے کہیں یادداشت نے ساتھ نہ دیا ہو اور بھول چوک ہوگئی ہو وہ علیحٰدہ بات ہے۔ مجموعی طور پر اُن کے انٹرویوز میں صداقت اور خلوص کی مہک رچی بسی ہے۔ جس سے قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اپنی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ سکول سرٹیفکیٹ کے مطابق وہ ۴۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں سرگودھا میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کے مراحل بھی انہوں نے وہیں طے کیے۔ بچپن کے اساتذہ اگرچہ مار کٹائی اور سزا دینے میں خاصے لبرل تھے مگر وہ مشفق اور مہربان بھی تھے، خلوص سے پڑھاتے تھے۔ بچپن کے اساتذہ میں سے وہ مرزا ہاشم الدین کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں ''مرزا صاحب نے ہمیں نصاب سے باہر کی کتابیں محض اس لیے پڑھائیں تاکہ بچوں کی اُردو درست ہو جائے''۔ مولانا محمد حسین آزاد کی قصص الہند میں نے لفظاً لفظاً اُن سے چوتھی جماعت میں پڑھی تھی۔ اُن کے والد مولوی امام الدین نے تریسٹھ سال کی عمر پائی۔ انہوں نے دو حج کیے۔ دو سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزارے۔ ۱۹۵۴ء میں اپنی پوتی کی شادی کرنے کے لیے آئے۔ تو سرگودھا ہی میں پیوند خاک ہوئے۔ ان کا خاندان محنت کش راجپوتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اُن کے والد معمولی پڑھے لکھے تھے لیکن وہ اقبال اور مولانا رومی کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ والد کی وساطت سے مرزا مظہر جانجاناں، خواجہ میر درد، اقبال اور اکبر جیسے شعراء سے اوّلین تعارف ہوا۔ سکول ہی کے زمانۂ تعلیم میں انہوں نے منشی پریم چند، رتن ناتھ سرشار اور رسوا کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ جب وہ ساتویں جماعت میں تھے تو انہوں نے ابتدائی کچی پکی شاعری کو ترک کر کے ایک کہانی لکھی جو رگھوناتھ سہائے کے رسالہ ''گلدستہ'' میں ایم۔ انور سیالوی کے نام سے شائع ہوئی۔ میانی اُن کے آبائی قصبہ کا نام ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''مجبوری''، فلمی رسالہ ''چترا''

میں شائع ہوا تھا۔ پھر اُن کے افسانے مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے بڑے بھائی اُن کے کفیل بن گئے۔ اس لیے انہوں نے عملی زندگی کا آغاز جلد ہی کر دیا۔ پہلے محکمہ آبپاشی میں کلرکی کی۔ اس کے پس انداز سے انجینئر نگ سکول رسول کی تعلیم حاصل کی۔ سب انجینئر نگ کی ملازمت سے طمانیت نہ ہوئی تو انہوں نے پرائیویٹ طور پر اپنی اُدھوری تعلیم کی تکمیل شروع کر دی۔ پہلے ادیب فاضل کیا، پھر ایف اے اور بی اے کا امتحان صرف انگریزی میں پاس کیا۔ بعدازاں انجینئر نگ میں ایم بی آئی ڈھاکہ سے کی اس امتحان کا آخری پرچہ انہیں ہمیشہ ہر بار دغا دے جاتا تھا۔ چنانچہ وزیر آغا نے انہیں ایم اے اُردو کر کے محکمہ تعلیم میں جانے کا مشورہ دیا۔ اس دوران انہیں ایس ڈی او کا عہدہ مل چکا تھا۔ لہٰذا وہ محکمہ آبپاشی کے شجر سایہ دار سے پیوستہ رہے۔ ایم آئی ای پاس کرنے کے بعد ان کی زندگی میں بہار آ گئی اور وہ ۱۹۷۷ء میں ایگزیکٹو انجینئر بن گئے۔ ریٹائرمنٹ سے قبل انہیں سپرنٹنڈنٹ انجینئر کا گریڈ مل چکا تھا۔ تاہم ڈاکٹر وزیر آغا اُن کے ادبی رہنما کی حیثیت میں ان کی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ اُردو تنقید کی طرف وہ ۱۹۶۶ء میں اوراق کے اجراء سے آئے۔ انہوں نے ہی انہیں ایم اے اُردو کرنے کا مشورہ دیا اور جو انہوں فرسٹ کلاس فرسٹ میں پاس کیا۔ پھر ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں پی۔ ایچ ڈی کی ترغیب دی اور اُن کے مقالہ ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کے داخلی نگران بنے اور تحقیق و تنقید میں ان کا ریاض کروایا۔ یوں اوراق اور وزیر آغا سے اُن کا قلبی، روحانی اور ادبی تعلق ''اوراق'' کے ۳۵ سالہ خاص نمبر کی اشاعت تک قائم رہا۔

گزشتہ چند سالوں سے میں انشائی تنقید کے تصور (Concept) کو اُجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس سلسلے میں میری ایک کتاب انشائی تنقید کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔ اب جب میں ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز پڑھ رہا ہوں تو میری

حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہی بات جو میں کہہ رہا ہوں اور جسے انشائی تنقید یعنی تخلیقی تنقید کہتا ہوں ڈاکٹر انور سدید بھی کہتے ہیں۔ جواز جعفری کے تنقید کے بارے میں سوال کے جواب میں انور سدید کہتے ہیں:

''میں تنقید میں فن پارے کے ساتھ باتیں کرتا ہوں۔ فن پارہ بھی میرے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے۔ ہماری ان باتوں کا حاصل میری تنقید ہے......اگر تصنیف کا باطن روشن ہے تو اس کی کرنیں مجھے شرابور کر دیتی ہیں۔''

یہ گویا تخلیق، تنقید، تخلیق کار اور نقاد کے وحدت کا تصور ہے۔ گویا تنقید بذاتِ خود تخلیق میں منتقل ہو جاتی ہے۔ تنقید، تخلیق نو کا کردار ادا کرتی ہے۔ یہی انشائی تنقیدی رویہ ہے۔ وہ نقاد جو تنقید، اپنے نظریات کے طے شدہ پیمانوں سے کرتے ہیں۔ تخلیقی تنقید کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔

جواز جعفری کے ایک سوال پر کہ ''انشائیہ کی مختصر تعریف کیا ہو سکتی ہے اور کیا کسی انشائیہ نگار نے ایسے انشائیے لکھے ہیں جو مذکورہ تعریف پر پورے اُترتے ہوں۔'' ڈاکٹر انور سدید نے کہا۔ ''انشائیہ مظاہر، مناظر اور اشیاء کو ذاتی آنکھ سے دیکھنے اور مشاہدے کو خالصتاً ذاتی زاوئیے سے پیش کرنے کی تخلیقی صنفِ ادب ہے۔ انگریزی ادب میں اس کا متبادل، پرنسپل ایسے Personal Essay ہے۔ اس تعریف کے مطابق متعدد انشائیہ نگاروں نے کامیاب انشائیے پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر اور جمیل آذر تو اس کے پیشرو ہیں اور ان میں سے بیشتر کے انشائیوں کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں'' ڈاکٹر انور سدید نے انشائیہ کی بڑی عمدہ جامع تعریف کی ہے۔ ایڈیٹر ''کھیل رنگ'' کو انٹرویو دیتے ہوئے وہ ادب سے کومٹمنٹ کا اس طرح

اظہار کرتے ہیں کہ جب تک کسی ادیب کی ادب کے ساتھ کو مٹمنٹ نہ ہو، وہ بڑا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ ادب کا تعلق لوگوں سے اور معاشرے سے ہوتا ہے۔ جو لوگ زندگی سے مخلص ہو کر ادب تخلیق نہیں کرتے ادب انہیں خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ادب کی تخلیق کو پیغمبرانہ عمل کہتے ہیں۔ مگر انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ بعض ادیب عام لوگوں کی طرح اپنے اعصاب پر عورت اور ''ایوارڈ'' کو سوار کیے ہوئے ہیں۔ سلیم اختر کے ایک بے بنیاد الزام پر کہ انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' ان کی کتاب کا چربہ ہے۔ جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید جواز جعفری سے کہتے ہیں:

> ''جواز جعفری آپ کو اور سب کو معلوم ہے کہ سلیم اختر کی رائے ان کی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے ہر ایڈیشن پر بدل جاتی ہے۔ جو ادیب اچھی چائے نہ پلائے وہ قابل مذمت ہے۔ جو پلا دے وہ قابل تعریف ہے۔ وہ ادیبوں کو ''تاریخ بدر'' کر دیتے ہیں۔ پھر اصنافِ ادب کا ''سیاپا'' بھی شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے یہ بتائیں کہ میں نے ان کی کتاب کے کس ایڈیشن کا چربہ کیا ہے؟ بہت سے ادیبوں کے نزدیک یہ تاریخ کی غیر سنجیدہ بلکہ ''مزاحیہ'' کتاب ہے کیونکہ اس میں ادیبوں کا مذاق اُڑایا گیا ہے...... میری کتاب ۱۹۹۱ء میں مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی جو تجارتی ناشرین کا نہیں بلکہ محققین کا ادارہ ہے۔

فلیپ نگاری کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ فلیپ لکھنے والا بالعموم کتاب نہیں پڑھتا۔ بس ایک رائے جو اس کے ذہن میں ہوتی ہے اسے بیان کر دیتا ہے۔ اس میں تحسین کا پہلو پیش نظر ہوتا ہے۔ بقول ان کے ''میں تقریبات میں پڑھے گئے

مضامین اور کتابوں پر لکھے گئے فلیپ کو بچے کو سالگرہ پر دینے والا تحفہ سمجھتا ہوں۔‘‘ میں یہاں ذرا ڈاکٹر صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے کہوں گا کہ میں نے اکثر انگریزی کتابوں کے فلیپ پڑھے ہیں جن میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرتے ہیں اور کتاب پڑھ کر نہایت جچی تلی رائے بڑے جامع اور دلکش اسلوب میں دیتے ہیں۔ مختصر ترین الفاظ میں پوری کتاب کا نچوڑ فلیپ میں موجود ہوتا ہے اور قاری کی رہنمائی کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً میں نے ورڈ سورتھ کی پری لیوڈ (Prilude) کا فلیپ پڑھا تو مجھے یہ جملہ اب تک یاد ہے۔‘‘ Prelude is the spirtual auto biography of wordsworth. یعنی پری لیوڈ ورڈ سورتھ کی روحانی سوانح عمری ہے۔ اس بات کا انحصار فلیپ لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنی محنت، صداقت اور دیانت داری سے فلیپ لکھتا ہے۔ فلیپ نگار بیشک تعریف و تحسین کے ڈونگرے نہ برسائے لیکن کم از کم کتاب کا چند جملوں میں جو ہر تو بتا دے تا کہ خرید کر پڑھنے والے کو کتاب کے انتخاب میں آسانی اور کشش ہو۔ فلیپ ایک طرح کا مختصر ترین تعارف نامہ ہے جو کسی نامور ادیب کی طرف سے ہوتا ہے۔ میری دانست میں فلیپ تو دیباچہ سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس کا سارا دارومدار فلیپ نگار کی شخصیت اور اس کے خلوص پر منحصر ہے۔ وہ ملک مقبول احمد کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ ایڈیٹر ’’کھیل رنگ‘‘ سے ملک مقبول احمد سے تعارف کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔: ’’اظہر جاوید صاحب نے میرا تعارف مقبول اکیڈمی کے سربراہ ملک مقبول احمد سے کرایا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ملک صاحب رائلٹی ادا کر کے چھاپنے والے ناشر ہیں۔‘‘

کہیں کہیں اُن کے انٹرویو میں مزاح کا پہلو بھی در آیا ہے۔ انور سدید کا اصل نام محمد انورالدین ہے اور ان کا قلمی نام انور سدید ہے۔ محمد انورالدین محکمہ آبپاشی کی نوکری سے

انور سدید اور اس کے بچوں کے لیے رزق کماتا اور انور سدید، محمد ادیب، نقاد اور افسانہ نویس وغیرہ تھا اس کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے کتابیں خرید کر اپنے ذوق کی تسکین کرتا تھا۔ جب ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ منظر دیکھا تو 1944ء کے لگ بھگ انہوں نے انور سدید کو سمجھایا کہ کتابوں اور رسالوں کا نقشہ ان کے کتب خانے سے پورا کر لیا کرے اور انورُالدین پر زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ اب انور سدید کی گاڑی پھراٹے بھرنے لگی۔'' وزیر آغا اسے ہر سمت میں دوڑانے لگے۔ کئی معصوم لوگ گاڑی کے نیچے آ کر ''جاں بحق'' ہو گئے۔ 1988ء جب انوارالدّین سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوا تو انور سدید کو احساس ہوا کہ اب اسے بڑھاپے میں انورالدین کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے۔ چنانچہ اس نے ''قومی ڈائجسٹ'' میں ملازمت اختیار کر لی۔ ...... جوانی میں انور سدید اپنے ہمزاد انوارالدین کی کارکردگی پر خوش تھا۔ بڑھاپے میں انوارالدین، انور سدید کو دُعائیں دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے کام سے مطمئن ہیں۔ کبھی شکایت پیدا ہوئی تو یہ معمولی نہیں ہو گی۔ محلے کے لوگ بتا دیں گے کہ ایک اور جنگ چھڑ گئی ہے۔ اس جنگ میں لڑتے لڑتے دونوں ڈھیر ہو جائیں گے یا پھر ایک کی چونچ گم ہو جائے گی۔ دوسرے کی دم...... اگر ڈھیر ہو گئے تو کفن دفن کا انتظام امجد اسلام امجد کریں گے۔ نماز مولانا عطاء الحق قاسمی پڑھائیں گے۔ سلیم اختر تصدیق کریں گے کہ گہرے دابے گئے ہیں۔ اب بالکل باہر نکل نہیں سکیں گے۔ مشکور حسین یاد مرثیہ پڑھیں گے۔ بہت سے لوگ خوش ہوں گے کہ اب اُن کا بلڈ پریشر نارمل رہے گا۔'' یہ گلزار جاوید کو دیئے گئے ایک انٹرویو کا دلچسپ مزاحیہ انداز کا ٹکڑا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کے اس حیاتِ ناپائیدار میں کتنے رقیب اور غنیم ہیں۔ تاہم اس عداوت کے پیچھے ایک داستان ہے۔ جو احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے درمیان غلط فہمی کی وجہ سے معرض وجود میں آئی کیونکہ میری دانست میں یہ دونوں عظیم ہستیاں جو اپنے اپنے دائرہ کار میں بے

مثل تھیں۔ اب ذکر چونکہ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کا ہو گیا ہے تو کیوں نہ آپ اسی انٹرویو کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید ہی کی زبانی ان دونوں عظیم ہستیوں کے بارے میں سن کر لطف اندوز ہوں۔ ''میں یہاں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے احمد ندیم قاسمی نے ہمیشہ سرگرم عمل رکھا۔ وزیر آغا کے احسانات مختلف قسم کے ہیں۔ قاسمی صاحب کے احسانات کی نوعیت جداگانہ ہے۔ کم نظر لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ قاسمی صاحب میرے محسن ہیں۔ وہ اگر مجھے ہمہ وقت قلم چلانے کی عادت نہ ڈالتے تو میں اب تک ادب سے بھی ریٹائر ہو چکا ہوتا۔ انہوں نے مجھے تیز دوڑا کر سانس قائم رکھنے کی تربیت دی۔ میں قیامت کے دن اُن کے احسان کو تسلیم کروں گا...... خدا سے ان کی بخشش کی دُعا کروں گا۔ ترقی پسندوں میں سے وہ جنت کے حقدار ہیں۔ اب میں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں۔ میں نے ادب میں وزیر آغا کو پایا۔ قاسمی صاحب کو کھو دیا۔ صحافت میں وزیر آغا کو کھو دیا۔ قاسمی صاحب کو پا لیا۔ ادب میں وزیر آغا اور صحافت میں قاسمی صاحب میرے آئیڈیل ہیں۔ میں نے دو سرچشموں مقدور بھر فیض اُٹھایا ہے آپ حیران نہ ہوں بعض وقت زانوائے تلمذ تہہ کیے بغیر بھی فیض حاصل کیا جا رکھا ہے۔ قاسمی صاحب کے آفتاب جلال کی کرنیں میں نے دور سے محسوس کیں وزیر آغا کے علم کی چاندنی میں غسلِ ماہتابی کرتا رہا۔''

اس تھوڑے سے ٹکڑے میں بلا کی تیز رمزیت (Subtle Irony) ہے۔ جسے آپ نہ صرف انجوائے کر سکتے ہیں بلکہ دونوں شخصیتوں کو سمجھ بھی سکتے ہیں۔ ایک منجھے ہوئے انشائیہ نگار اور ادیب کی حیثیت سے انور سدید نے اپنے فن کا جادو بھی جگایا ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''کبھی کبھی کوئی اچھا شعر بھی ہو جاتا ہوگا، لیکن میں مطمئن نہیں ہوتا البتہ ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم اگر خدانخواستہ میری غزل بھی اپنے سنگیت کے لیے منتخب کر لیتیں تو میری غزل کے نصیب جاگ اُٹھتے۔ میری

شاعری مشہور ہو جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی شاعروں کے نصیب موسیقاروں نے جگائے ہیں۔ فریدہ خانم، مہدی حسن، غلامی علی، نور جہاں، اقبال بانو کے شاعروں پر بڑے احسانات ہیں۔ کئی مردہ شاعروں کو انھوں نے ہی زندگی دی۔" یہاں بھی رمز و کنائیہ میں انور سدید بڑی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔

ادبی رسائل پر گفتگو کرتے ہوئے وہ محمد خالد اختر سے کہتے ہیں کہ ہر ادبی پرچے کا اپنا ایک علیحدہ مزاج ہے۔ اوراق جو ڈاکٹر وزیر آغا اور عارف عبدالمتین کی ادارت میں شائع ہوا۔ کشادہ فکری کا علمبردار ہے۔ اپنے نظریات کو دوسروں پر ٹھونسنے کی بجائے انہیں سلیقے سے پیش کرتا ہے۔

اپنے مخالفین کو للکارنے کی بجائے دلیل سے ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اوراق کے نظریات ہنگامی یا اضطراری نہیں ہوتے بلکہ اُن کے پیچھے برسوں کی سوچ اور اس سوچ کے دوررس نتائج اثر فرما ہوتے ہیں۔ یہ ادبی جملہ نئے تجربات، نئے خیالات وافکار کا خیر مقدم کرتا ہے۔ یوں یہ پرچہ ارتقاپسند ہے لیکن ایں ہمہ مشرقی اخلاقیات کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ روشن خیالی کی بھیڑ چال میں عریانی کو اپنے صفحات میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ نئی نظم نیا انشائیہ نیا علامتی و تجریدی افسانہ کو فروغ دینے میں اوراق کا بڑا اہم کردار ہے۔ گویا جدید ادب کو فروغ دینے میں اوراق ہمیشہ پیش پیش رہا۔ یہ نیا انشائیہ کی ترکیب میری ہے۔ اسے آپ جدید انشائیہ کے معنیٰ ہی میں سمجھیں کیونکہ انور سدید نے جدید نظم، جدید انشائیہ اور تجریدی اور علامتی افسانہ کی ترکیب برتی ہے۔ انہوں نے اوراق کی ایک اہم خوبی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ "اوراق نے بہت سے ادیبوں کی خفیہ صلاحیتوں کو پرکھا اور ان کے اظہار کی صنف کو صحیح ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی۔" مثال کے طور پر بقول انور سدید "مشتاق قمر ابتداً مزاح نگار کی حیثیت میں سامنے آئے۔ اوراق نے ان کی شگفتہ نگاری کو انشائیہ کی ڈگر پر ڈالا اور آج وہ اُردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے

ہیں۔ پروفیسر جمیل آذر تازہ فکر انشائیہ نگار تھے۔ اوراق نے اُن سے تنقید لکھوا کر انہیں موقر نقادوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ رشید امجد خوش اسلوب افسانہ نگار تھے۔ اور اب وہ اس میدان میں نمایاں کامرانیاں حاصل کر رہے ہیں۔ اوراق نے انہیں تنقید پر مائل کیا اور اب وہ تنقید کی ایک معروف کتاب کے مصنف بھی بن چکے ہیں۔ خود مجھے اعتراف ہے کہ میں عرصے تک افسانہ نگاری کے میدان میں سرگرداں رہا اور ہمایوں، آج کل، عالمگیر اور شاہکار وغیرہ میں مسلسل شائع ہونے کے باوجود معروف نہ ہو سکا۔ اوراق نے میری تنقید کو اعتماد بخشا اور مجھے اظہار کی ایک نئی صنف سے روشناس کرا دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اوراق نے جن نئے ادباء کو سب سے پہلے متعارف کرایا وہ عرصے تک دوسرے ادبی رسائل کے نامظور مسودوں میں گم پڑے رہے لیکن جونہی اوراق نے انہیں اشاعت کی منزل پر پہنچایا۔ دوسرے ادبی پرچوں میں بھی اُن کی اہمیت بڑھ گئی۔ اوراق نے افسانے میں تجرید اور علامت کے تجربات کو بھی پیش کرنے میں فوقیت حاصل کی'' اوراق کے علاوہ دیگر ادبی پرچوں پر گفتگو کرتے ہوئے انور سدید اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں: 'نقوش نے ادب کے کلاسیکی شہ پاروں کو تحفظ عطا کیا۔ سیپ ہر دور کے نئے اور پرانے لکھنے والوں کا پرچہ ہے۔ افکار ماہناموں کی صنف میں وقت کی پابندی کا امین ہے اور ایک ایسا فورم ہے۔ جہاں آپ آزادئ اظہار کا مظاہرہ بھی کر سکتے ہیں۔ ادب لطیف بلاشبہ ایک عہد ساز پرچہ تھا لیکن اب اس کا تعطل اس کی فعالیت پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ سویرا جن دنوں ترقی پسند تحریک کا آرگن تھا تو مخصوص حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ فنون نے لے لی ہے۔ صحیفہ کے ساتھ تحقیق کی روایت وابستہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے ایک منفرد ادبی تشخص عطا کیا تھا...... گزشتہ چند سالوں میں نیرنگ خیال، تخلیق اور تحریریں نے صحت مند کروٹ لی ہے۔ بالخصوص تخلیق کی ہر اشاعت اب نئے مباحث کو کروٹ دے رہی ہے اور یہ شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو بن جاتا ہے...... اس اقتباس سے آپ

اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید کی تمام ادبی پرچوں پر بڑی گہری نظر ہے اور وہ ان سب کے مزاج آشنا ہیں۔ یہ باتیں انہوں نے محمد خالد اختر سے ۱۹۸۶ء میں اپنے ایک انٹرویو میں کہیں جو اوراق لاہور کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ آج کل جو مقام کبھی فنون اور اوراق کا تھا۔ اب یہ مقام بلند تخلیق اور الحمرا کو حاصل ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ تخلیق اور الحمراء بھی نئی نسل، نئے خیالات اور نئے افکار کے لیے اپنے دامن کشادہ رکھتے ہیں۔

''آپ کی باتیں، میں ان کا آخری انٹرویو جولائی ۲۰۰۱ء ''حرفِ ملاقات'' کے لیے جو عمران نقوی کو دیا تھا، شامل ہے۔ یہ انٹرویو بھی نہایت اہم ہے اور قاری کے لیے دلچسپی کا حامل ہے۔ جن حضرات نے اُن سے انٹرویوز لیے اُن میں ''آغا شیدا کاشمیری، رفیع الدین ہاشمی، جواز جعفری، مدیر کھیل رنگ، گلزار جاوید، محمد خالد اختر، محمد نعیم تسلیم احمد تصور، محمد یسٰین بسمل، حسن رضوی، محمد اسلم حیات، ایم۔ڈی بشا احمد زعفران، آشر محمود، ممتاز عارف، زبیر جعفری، رضی الدین صدیقی اور عمران نقوی شامل ہیں۔ یہ سب اہل قلم ادب کے زیرک تخلیق کار اور تنقید نگار بھی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کی اردو ادب کی تمام اصناف پر مضبوط گرفت ہے۔ ان کی رائے بڑی متوازن اور شائستہ ہوتی ہے۔ جہاں تک اُن کی شخصی صفات کا تعلق ہے۔ وہ بڑے خوددار، قناعت پسند اور رزق حلال کما کر زندگی بسر کرنے والے شخص ہیں۔ چونکہ ان کی شریانوں میں راجپوتی خون ہے۔ اسی لیے وہ دوستوں کے دوست ہیں تو دشمنوں کے کھلے دشمن۔ منافقت ابن الوقتی، مفاد پرستی کا اُن سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ انہیں گالی کا جواب دینے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ اور اپنے مخالف کو شکست فاش دینے کا ہنر بھی۔ لاہور کے بعض جملہ باز ادیب اور شاعر اُن کے سامنے ممولہ بن جاتے ہیں۔ مجھے اُن کی یہ خوبی پسند ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆

پروفیسر نذیر احمد تشنہ
بھمبر، آزاد کشمیر

آپس کی باتیں

جناب ملک صاحب!

السلام علیکم!

رحمتوں کے مہینے کا اختتام ہوا۔عید کے دوسرے روز ہی ''آپس کی باتیں'' پڑھنا شروع کی اور ایک ہی دن میں ساری کتاب پڑھ ڈالی۔ آپس کی بات ہے کہ ہے بڑے خاصے کی چیز! آپ کی اس کاوش نے ڈاکٹر انور سدید کے عہد کو ایک کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انٹرویوز میں ڈاکٹر صاحب نے ادب کی مختلف جہتوں پر بڑی فاضلانہ رائے قائم کی ہے جو آنے والے ادیبوں اور نقادوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو گی۔

تاریخ ادب میں دو شاگردوں نے اپنے اساتذہ کا حق شاگردی بخوبی ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو حکومتِ برطانیہ سے جب ''سر'' کا خطاب دیا جانے لگا۔ تو انہوں نے کہا کہ خطاب کے مستحق تو میرے استاذ ''میر حسن'' ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کی ''تخلیق'' کون سی ہے؟ تو انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ ان کی تخلیق ''اقبال'' اقبال کو اقبال، میر حسن نے بنایا ہے۔ اس پر انہیں ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا علم و ادب کا درخشندہ ستارہ تھے مگر ڈاکٹر انور سدید نے انھیں ادب کا ماہتاب بنا کر تاریخِ ادب میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

میرا ڈاکٹر انور سدید صاحب سے پہلا تعارف 1985ء میں اس وقت ہوا جب میں اوپن یونی ورسٹی کے ایم فل (اُردو) کا طالب علم بنا۔ اس پروگرام میں ایک پرچہ "اُردو ادب کی تحریکات" تھا۔ اس پرچے کی تیاری کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب، اُردو ادب کی تحریکیں" خریدی اور پڑھی۔ یقین جانیے اس کتاب نے دیگر کتب کے مطالعے سے بے نیاز کر دیا کیونکہ اوپن یونی ورسٹی کی اسائنمنٹ کا مدار کسی ایک کتاب کو نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے ساتھ، اس موضوع پر دیگر کتابوں کا مطالعہ بھی کرنا، ضروری تھا۔ میں نے اُس مواد کو یک جا کر کے "تحریکات ادب" کے نام سے ڈاکٹر محمد صدیق شبلی صاحب کے دیباچہ کے ساتھ مدوّن کیا اور مکتبہ عالیہ نے اُسے طبع کیا۔

ڈاکٹر انور سدید کا مقالہ "اُردو ادب کی تحریکات" تاریخ ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کی سند ایک تو ڈاکٹر صاحب خود ہیں اور دیگر وہ نام اور علمی وادبی شخصیات ہیں۔ جنھوں نے اس مقالے کو پرکھا اور اس کے معیار پر اپنے دست خط ثبت کیے۔ "1976" میں "اردو ادب کی تحریکیں" لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے داخلی رہنما ڈاکٹر وزیر آغا اور ممتحن ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر شمس الدین صدیقی تھے۔ اس کتاب پر انھیں ہجرہ ایوارڈ دیا گیا۔ "اسے کہتے ہیں آموں کے آم، گٹھلیوں کے دام۔

ان کی تصنیف وتالیف کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ تاہم ملک مقبول احمد کی کتاب "۵۰ نامور ادبی شخصیات" سے ایک اقتباس کی مدد سے ان کی نوعیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے"۔ "اقبال کے کلاسیکی نقوش" پر گلڈ ایوارڈ، مقالہ اُردو میں حج ناموں کی روایت پر "نقوش ایوارڈ اور بہترین کالم نگاری پر "اے پی این، ایس ایوارڈ انھیں مل چکا ہے۔ انور سدید متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔

ان کی کتابیں "اُردو ادب میں سفرنامہ"، "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش"،

''اُردو ادب کی تحریکیں''، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' اولیات کا درجہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ادب کے سومناتی بتوں کو پاش پاش کرتے ہیں اور دلائل سے مبنی برحقیقت ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ ''احمد ندیم قاسمی جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے آزادی کے فوراً بعد انہدام اقبال کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا اور یہ تحریک کیمونسٹ پارٹی کے حکم پر چلائی گئی تھی لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ فیض احمد فیض نے جو احمد ندیم قاسمی سے بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے ترقی پسند تھے۔ پارٹی کے اس حکم کی مخالفت کی تھی۔ بہت عرصے کے بعد جب ملک کی سیاسی فضا تبدیل ہوگئی تو قاسمی صاحب نے بھی زمانے کی ہوا کا رُخ دیکھا لیا۔ اقبال کی مدحت اختیار کر لی اور اخبار و رسائل میں متعدد ٹپیکل (Typical) قسم کے مضامین لکھے جن کی سطح صحافتی ہے، علمی یا فکری نہیں ہے۔ انھوں نے اقبال پر کوئی ٹھوس کام نہیں کیا۔''

ڈاکٹر صاحب جادہ ادب پر نو واردوں کی حوصلہ افزائی بھی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کا جذبہ اور ولولہ ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ راقم کی کتاب ''اُردو ضرب الامثال'' جب اُنھیں تقریظ لکھنے کے لیے پیش کی گئی تو انہوں نے بڑی شفقت سے حوصلہ افزا ریمارکس دیئے جس سے آگے بڑھنے اور مزید لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔ ''اُردو ضرب الامثال'' میں نذیر احمد تشنہ نے نہ صرف اُردو میں مستعمل ضرب الامثال جمع کر دی ہیں۔ بلکہ بعض امثال کے پس منظر میں موجود واقعات کی حکایت یا حقیقت بھی بیان کر دی گئی ہے اور آخر میں فرہنگ بھی شامل کر دیا ہے تاکہ منظر سے اوجھل ہو جانے یا استعمال میں کم آنے والے الفاظ کے مطالب و معانی واضح ہو جائیں نیز ضرب الامثال کی الف بائی ترتیب نے قارئین کے مطالعے اور کتاب کے استعمال کو آسان بنا دیا ہے۔ عام ضرورت کی یہ کتاب تعریف و تحسین کے قابل ہے۔ بلاشبہ نذیر احمد تشنہ نے لمبے

عرصے کے بعد نظر انداز کیے ہوئے اس اہم کام کی تجرید کی ہے، تو میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور کام ہمارے لیے ''جدوجہد'' کا عملی نمونہ ہے۔ آپ نے اُردو ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ ایک صدی تک ادیب اور شاعر آگے بڑھنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے کام کی طرف پیچھے مڑ کر ضرور دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا سایہ اُردو ادب کے سر پر دراز رکھے تا کہ آنے والے ادیب اُس کے نیچے پناہ لے سکیں۔

ملک مقبول احمد صاحب کی کتاب ''آپس کی باتیں'' ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی افکار و نظریات سمجھنے سمجھانے کی واحد کتاب ہے۔ جو قاری کو ڈاکٹر صاحب کے گراں بہا مجموعہ تنقیدات و تخلیقات کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے۔ ملک صاحب اب اپنے ادارے ''مقبول اکیڈمی'' سے منسلک رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کے کام کو متعارف کرانے میں کوشاں ہیں۔ جیسے ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں پچاس اہل قلم کا تعارف، اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں برکت عطا فرمائیں تا کہ وہ ایسے کام سرانجام دیتے رہیں۔

☆☆☆

آپس کی باتیں

ملک مقبول احمد بنیادی طور پر مقبول اور معروف ناشر و پبلشر ہیں۔ وہ گزشتہ پچپن برس سے اس شعبہ سے منسلک ہیں اور انہوں نے اچھی، عمدہ اور علمی و اصلاحی ہزاروں کتب شائع کر کے نیک نامی کمائی ہے لیکن تین چار برسوں سے وہ ایک رائٹر اور قلمکار کے طور پر سامنے آئے ہیں اور انہوں نے اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب ان کی خودنوشت سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' کے عنوان سے منصۂ شہود پر آئی ہے تو اہلِ علم وادب نے اس کی اس قدر پذیرائی کی کہ انہوں نے ان تبصرہ نگاروں کے تبصروں، جائزوں اور خطوط پر مبنی کتاب بعنوان ''پذیرائی'' چھاپ دی۔ ''پذیرائی'' کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ جس کے بعد ان کا شہسوار قلم رُکا نہیں اور انہوں نے ''اہل قلم کے خطوط'' کتابی صورت میں شائع کر دیئے۔ یہ خطوط ان کی پچپن سالہ زندگی کا سرمایہ ہیں۔ چند ماہ قبل اُن کی نہایت دلچسپ، عمدہ اور شاندار کتاب، ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کے عنوان سے بہترین کاوش سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب ادیبوں کے دلچسپ معلوماتی خاکوں پر مشتمل ہے۔ ریفرنس بک ہونے کے اعتبار سے اس کی افادیت اور اہمیت بہت زیادہ ہے۔ پہلی بار کسی غیر ادیب نے ادیبوں کے بارے میں قلم اُٹھایا ہے اور پچاس ان ادیبوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے قوم وملت کو اور نئی نسل کو روشناس کرایا ہے، حقیقتاً ان کا یہ کام کسی ''کارنامے'' سے کم نہیں۔ اس کے لیے نہ صرف ادباء وشعرائے کرام بلکہ پوری قوم ان کی شکر گزار ہے۔

حال ہی میں ان کی مرتبہ ومؤلفہ کتاب ''آپس کی باتیں'' شائع ہوئی ہے۔ جو اپنی اہمیت وافادیت کے اعتبار سے قابل قدر کاوش ہے۔

یہ کتاب دراصل، ممتاز ادیب، صحافت کی عظیم شخصیت، بلند قامت نقاد اور محقق، عالی مرتبت دانش ور اور پوری قوم میں بزرگ ومحترم شخصیت، ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف شخصیات نے کیے۔ یہ گراں قدر اوراق بکھرے ہوئے تھے اور اوراق پریشاں کی حالت میں تھے، ملک مقبول احمد نے بڑی محنت اور کوشش بسیار کے بعد انہیں جمع کیا اور اب انہیں کتابی شکل میں اہل ذوق وشوق کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر انور الدین، محتاج تعارف نہیں۔ وہ قبیلہ اہل قلم میں بخوبی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ان کے بے شمار مداح ان کے حق میں رطب اللسان ہیں تو ان کے مخالفین کی بھی کمی نہیں اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے کیونکہ حق گو قلمکار کے مخالفین لامحالہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصر حاضر ''ستائش باہمی'' جیسی قباحت میں غلطاں ہے۔ جونہی کسی نقاد نے کسی کی کتاب کے بارے میں کلمۂ حق لکھ دیا، تو وہ مخالفت پر اُتر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی منافقت اور مداہنت کے بغیر جس بات کو سچ سمجھا، اُسے صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ انہوں نے لکھتے ہوئے ہمیشہ شخصیت کو سامنے رکھنے کی بجائے ''مواد'' کو سامنے رکھ کر لکھا اور اس کے حسن وقبح بیان کر دیئے جبکہ لوگ صرف تعریف وتحسین سننے کے عادی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب جو بظاہر انٹرویوز پر مشتمل ہے، اس میں بھی انہوں نے سوالات کے جوابات بلاکم وکاست پیش کیے ہیں۔ جس بات کو سچ اور حق سمجھا، بیان کر دیا۔ سوالات کی صورت میں انٹرویوز نگاروں نے بعض علمی وادبی اور عصری مسائل کو بھی چھیڑا اور ڈاکٹر صاحب سے بہت چبھتے ہوئے اور تیکھے سوالات بھی کیے لیکن جوابات سے پتہ چلتا ہے کہ نہایت سنجیدگی اور متانت سے جوابات دیئے۔ کہیں ''ری ایکشنری'' ہونے کا تاثر نہیں ملتا۔

ان کے جوابات قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوتا حتیٰ کہ بعض لوگوں کی طرح انہوں نے جوابات دیتے ہوئے ''خودستائی'' سے کام نہیں لیا۔ البتہ معترضین کے اعتراضات کا کافی وشافی نہ صرف جواب دیا بلکہ دلائل و براہین سے ان کے اعتراضات کا توڑ کیا ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ بعض باتوں اور مسائل کی تکرار کے باوجود قاری کو بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر انور سدید متعدد علمی وادبی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں ان کے زندۂ جاوید ہونے کے لیے یہی کارنامے کافی تھے لیکن انٹرویوز کی اشاعت نے ان کی زندگی کے اُن متعدد پہلوؤں کو آشکار کیا ہے۔ جو پہلے کسی وجہ سے لوگوں کو معلوم نہ تھے۔

زیادہ تر لوگ انہیں ایک ادیب، اور محقق یا نقاد کے طور پر جانتے تھے لیکن بہت لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ بنیادی طور پر انجینئر ہیں اور انہوں نے ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ افادۂ عام کے لیے نہریں اور پُل بھی تعمیر کیے ہیں۔ دونوں پیشے اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب ہر دو مقامات تخلیقی کارنامے ہی سرانجام دیتے رہے اور اپنا لوہا منواتے رہے۔

بعض لوگوں نے ادب میں بھی سرحدیں بنا ڈالیں۔ جس کے نتیجے میں ''سرگودہا مکتبۂ فکر'' کی تخلیق کی گئی جس کے سرخیل ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کا تعلق بھی چونکہ سرگودھا سے تھا، اس لیے لامحالہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے مقربین میں شامل ہو گئے اور اُن کے لیے بہت کام کیا۔ان کے رسالے ''اوراق'' کے لیے برسوں خدمات سرانجام دیں اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالفین اور معترضین کا دلائل و براہین سے مقابلہ کیا اور ان کے چھکے چھڑا دیئے۔

ادب اور ادیب کے بارے میں ایک استفسار پر فرماتے ہیں ''ادیب کا اساسی

منصب یہ ہے کہ وہ ادب کے بالواسطہ عمل سے فرد کے کھردرے جذبات کی تہذیب کرے اور اسے بہتر مستقبل کی طرف بڑھانے میں مدد دے۔ اچھا ادیب زندگی کو اپنی آرزوؤں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے اور موجود کی کثافت کو لطافت میں تبدیل کرنے کے لیے ادب تخلیق کرتا ہے..........ادیب انہیں (خوابوں) سے مستقبل سازی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ ادیب ان خوابوں کو نہ صرف اپنی تخلیقات میں سموتا ہے بلکہ ان سے اپنے زمانے اور عصر کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ادیب میں نہ صرف مقصد اہم ہوتا ہے بلکہ کوئی ادب بھی مقصدیت کے بغیر تخلیق نہیں ہوتا۔......ادب قوموں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور لوگوں کو منقلب کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کو ایک فعّال قوت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے......۔

ادبی اختلاف کی حدود کے متعلق سوال پر ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔

''میری رائے میں زندگی، معاشرہ اور ادب کی صحت مند ترویج کے لیے اختلاف رائے بے حد اہم ہے۔ اختلاف ہر ذمہ دار شہری کا جمہوری حق ہے اور اس کے بغیر کسی مسئلے کے جملہ پہلو پوری طرح سامنے نہیں آتے۔''

ادبی اختلاف ذاتی نہیں ہوتا، اس کا مقصد زیر بحث موضوع کی صداقتوں کو اُجاگر کرنا ہوتا ہے اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے نئی راہیں تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اختلاف رائے کی حدود بھی تمام تر علمی ہونی چاہئیں۔......اختلاف کے لیے لہجہ شائستہ اور اندازِ تحریر تہذیبی ہونا بھی ضروری ہے..........

ترقی پسند تحریک کے بارے میں سوالات کے جواب میں فرماتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے نہ صرف ادب کو نیا خون دیا ہے بلکہ اسے

حقیقت نگاری سے روشناس کرایا۔ اس تحریک نے حال اور مستقبل ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ ترقی پسند تحریک داخلی طور پر توانا تحریک تھی۔ المیہ یہ ہوا کہ یہ تحریک وجود میں آنے کے بعد ہی قول وفعل کے تضاد کا شکار ہوگئی۔ اس نے ادب کا لباس زیب تن کیا مگر لباس کے نیچے سیاست کا زیر جامہ چھپائے رکھا۔ عوامی زاویے کے تحت اس نے ایک خاص سیاسی مسلک کی تشہیر کی اور شخصی زاویے کے تحت صرف ذاتی مفاد کی فصل کاٹی۔ اس تحریک کے ادباء، ادب اور فن کے ساتھ اتنے مخلص نہیں تھے جتنے وہ اپنی ذات کے ساتھ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ادب کو ذاتی ترقی، حصول معاش اور شہرت کا وسیلہ بنایا اور اس کے تحت جو ادب پیدا ہوا وہ خلوص سے عاری تھا۔"

ممتاز سکالر ڈاکٹر رفیع الدین کی طرف سے سوال کے جواب میں علامہ اقبالؒ کے بارے میں حقیقت افروز خیال کا اظہار کرتے ہیں:

"مجھے افسوس ہے کہ جس طرح کالج کی تعلیم نے طلباء کو گمراہ کیا ہے اسی طرح سرکاری سرپرستی نے اقبال صدی کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اب تک علامہ اقبالؒ کے اذکار اور اشعار پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، باستثنائے چند سب کی سب سہل نگاری اور تعجیل نگاری کا شکار ہیں۔ مصنفین نے اقبال پر ادبی کام کو منفعت کا ذریعہ بنایا اور کتاب میں غیر ضروری پھیلاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتابوں کے انبار میں اقبال کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا۔ حد یہ ہے کہ اقبال کی سرگزشت بھی اغلاط سے خالی نہیں۔"

غرضیکہ زیرِ نظر کتاب ''آپس کی باتیں'' بے حد دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتاب ہے۔ اس میں نہ صرف ادب اور ادیب کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے بلکہ بعض ادیبوں کے ''کردار'' پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ نصف صدی کی ادبی اور عصری تحریکوں کے بارے میں قاری کو معلومات کا بیش قیمت خزانہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے ''انکشافات'' کیے ہیں جنھیں پڑھ کر آج کا قاری ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے ادیب کیا گل کھلاتے رہے ہیں۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہے۔ ٹائٹل دل آویز ہے اور یہ کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے لیکن پروف ریڈنگ کی غلطیاں کتاب کے حُسن کو گہنا رہی ہیں۔ ملک مقبول احمد صاحب اغلاط کے بارے میں بہت حساس ہیں لیکن اس کتاب میں نہ جانے یہ سہو کیسے ہو گیا ہے۔ یہ کتاب 18 انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ جو مختلف ادیبوں اور صحافیوں نے کیے ہیں۔ ان میں ممتاز سکالر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور معروف ادبی شخصیت، محمد خالد اختر اور عمران نقوی بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تسلیم احمد تصور، ڈاکٹر حسن رضوی، رضی الدین رضی، ممتاز عارف اور اسلم حیات کی طرف سے کیے گئے انٹرویوز بھی موجود ہیں۔ بہرحال زیرِ نظر کتاب متعدد خوبیوں اور دلچسپیوں کی حامل ہے اور اس کا مطالعہ اہلِ ذوق وشوق کو دعوت فکر دیتا ہے۔ ملک مقبول احمد ہر لحاظ سے تعریف و تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں معلومات سے معمور اور حقائق سے بھرپور کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اُمید ہے کہ وہ دیگر ادیبوں اور صحافیوں کے انٹرویوز پر مشتمل ایسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھیں گے کیونکہ انٹرویوز میں جو باتیں اور حقائق سامنے آتے ہیں وہ کسی اور ذریعے سے نہیں آ سکتے۔

آپس کی باتیں

ملک مقبول احمد کا شمار ملک کے معروف ناشروں میں ہوتا ہے۔ ان کی لکھی ہوئی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' جب منصۂ شہود پر آئی تو وہ ادبا کی صف میں شامل ہوئے۔ اس کتاب کی اتنی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوئی کہ پاک و ہند میں اس پر دھڑا دھڑ مضامین تحریر کئے گئے کہ ایک نئی کتاب پذیرائی کے عنوان سے منظر عام پر آ گئی۔ پروفیسر جمیل آذر کو اس کتاب نے اس درجہ متاثر کیا کہ انہوں نے اس کتاب پر ایک کتاب راہ نورد شوق کے نام سے لکھ ڈالی۔ دراصل پروفیسر موصوف کو اس خودنوشت سوانح عمری میں اپنے بچپن اور اپنے گاؤں کا عکس دکھائی دیا تو انہوں نے ماضی کی یادوں سے سرشار ہو کر پوری کتاب تحریر کر دی۔

ملک صاحب نے اپنے بچپن سے لے کر آخری دور تک کے نقوش کو سلیس، رواں اور خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سوانح عمری پر پذیرائی کے بعد شناسائی کے عنوان سے ایک اور کتاب معرض وجود میں آ چکی ہے۔ آخر اس سوانح عمری میں ایسی کون سی بات ہے جس سے ادباء اور دانشور اس قدر متاثر ہوئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اردو ادب میں پہلے ناشر کی سوانح عمری ہے۔ دوم اسے اتنی سچائی، ایمانداری اور خلوص سے تحریر کیا گیا ہے کہ مصنف نے اپنی کمزوریوں پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے ساتھ بچپن سے لے

کرعمر کے آخری حصے تک جو واقعات اور حادثات پیش آئے انہیں من وعن تحریر کر دیا ہے۔ سوم اسلوب سادہ ہونے کے باوجود اس قدر جاندار اور پرکشش ہے کہ قاری کتاب کھولنے کے بعد بند کرنا بھول جاتا ہے۔

اس کتاب کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کے بعد ملک صاحب کا رہوار قلم قرطاس کے سینے پر اپنی جولانیاں دکھانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ متعدد کتب کے مصنف اور مؤلف بن گئے۔ ان کی ایک نئی کتاب ''آپس کی باتیں'' ڈاکٹر انور سدید کے اٹھارہ انٹرویوز پر مشتمل ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں ادبا اور دانشوروں کو دیئے تھے۔ وہ تمام انٹرویوز اخبارات اور رسائل کے صفحات پر بکھرے پڑے تھے۔ انہیں یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر ملک صاحب اپنے دوستوں کی معاونت اور اپنی ذاتی کاوش سے اس دشوار گزار مرحلے سے گزر گئے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا جو کام انور سدید صاحب چاہنے کے باوجود انجام نہ دے سکے وہ کام ملک مقبول احمد صاحب نے کر دکھایا۔ ان انٹرویوز سے ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بہت سی وہ باتیں جو وقت کی گرد میں گم ہوگئی تھیں اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہمارے سامنے آگئی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید ہمیشہ الزامات کی زد میں رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ اردو ادب کی ایک متنازعہ شخصیت بن گئے تھے۔ ان انٹرویوز کے ذریعے ان پر پڑا ہوا جب پردہ اٹھتا ہے تو اندر سے ایک ایسا ڈاکٹر انور سدید ہمارے سامنے آتا ہے جو پہلے والے ڈاکٹر انور سدید سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کتاب کے چند انٹرویوز ان کے بچپن، خاندانی پس منظر، تعلیم اور بچپن کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ اس لئے ان میں تکرار کا آجانا قدرتی امر ہے۔

ایک انٹرویو میں حسن رضوی کے اس سوال پر کہا جاتا ہے کہ ناشر آپ کی کتابیں چھاپنے سے

کتراتے ہیں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا قاسمی صاحب سے ڈرتے ہیں؟ ان کا یہ سوال سن کر ڈاکٹر انور سدید نے جواب دیا:

''میری سب سے اہم کتاب اردو ادب کی تحریکیں انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی تھی۔ سرکاری اداروں میں مجھے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ لاہور میں مجھے اشاعتی تعاون سب سے زیادہ ملک مقبول احمد نے فراہم کیا۔ جن کا مقبول اکیڈمی ملک کا نامور اشاعتی ادارہ ہے۔ ملک صاحب سے میرا تعارف اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' نے کروایا تھا۔ انہوں نے میرا سفرنامہ ''دلی دور نہیں''، ''انشائیوں کا مجموعہ''، ''آسمان پر پتنگیں'' اور ''میر انیس کی قلم رو'' شائع کیں اور کتابوں کی اشاعت سے پہلے مجھے اعزازیہ ادا کر دیا۔''

میں اس مضمون کا اختتام ڈاکٹر وزیر آغا کے اس پیراگراف سے کرتا ہوں جو انہوں نے ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں ایک مضمون میں فرمایا تھا:

''ڈاکٹر انور سدید موضوع پر پوری تحقیق کے بعد لکھتے ہیں اور مسائل پر لکھتے وقت ان کا قلم برق کا کوندا بن جاتا ہے۔ نیز یہ کہ جہاں کہیں انہیں ناانصافی' منافقت' ہٹ دھرمی یا اسی وضع کے کوئی مذموم حرکت نظر آتی ہے تو وہ ایک با اصول اور زیرک ایڈووکیٹ کی طرح باقاعدہ اپنا کیس تیار کرتے اور پھر اسے اپنے قلم کے سارے زور اور منطق کی

پوری قوت کے ساتھ اسے بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں کہ جو لوگ اس تنقید کی زد میں آتے ہیں وہ ''تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولہو'' کہتے ہوئے بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔''

☆☆☆

آپس کی باتیں

"آپس کی باتیں" اُردو ادب کے نامور مصنف اور نقاد ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف قلمکاروں اور لکھاریوں نے حاصل کیے اور پھر شائع بھی ہوئے۔ ملک مقبول احمد بنیادی طور پر تو کتب کی اشاعت سے وابستہ ہیں لیکن انہوں نے تالیف تصانیف میں بھی نام کمایا ہے۔ یوں ملک صاحب نے ڈاکٹر انور سدید صاحب کی بکھری ہوئی مگر قابل غور وفکر باتوں کو یکجا کر کے محفوظ بنا دیا ہے۔ انور سدید سے مختلف قلم کاروں نے نوکیلے اور تیز تر سوالات کیے مگر ڈاکٹر انور سدید نے ان کے جوابات نہایت عمدگی سے دیئے اور یوں نقطۂ اختلافات سننے اور پھر اس کا مہذب اور مثبت انداز میں جواب دینے کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ اسے تقویت بخشی۔

تالیف میں 18 انٹرویوز شامل ہیں اور ملک مقبول احمد کو مزید کی تلاش ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے قاری کو کئی نئی باتوں کا علم ہو سکے گا اور علمی وادبی حلقوں میں کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ مقبول اکیڈمی نے کتاب اپنی روایت کے مطابق خوبصورتی سے پیش کی ہے۔

ہفت روزہ زندگی

۲۴۔ جولائی، ۲۰۱۱ء

برسبیل گفتگو

گذشتہ سال ۲۰۱۱ء میں ملک مقبول احمد نے ''آپس کی باتیں'' کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کے مختلف اوقات میں ادبی حضرات کو دیئے ہوئے اٹھارہ انٹرویوز پر مشتمل کتاب شائع کی تھی۔ جسے اہل فکر ونظر نے بڑی قدر ومنزلت بخشی۔ اب ملک مقبول احمد نے امسال ۲۰۱۲ء کے پہلے مہینے جنوری میں ''برسبیل گفتگو'' کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کے مزید اٹھارہ انٹرویوز پر مشتمل کتاب شائع کی ہے۔ آپ ان دو کتابوں کی یکے بعد دیگرے اشاعت سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملک مقبول احمد کو ادب سے کتنی گہری بے لوث محبت اور وابستگی ہے۔

کائناتِ ادب میں ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت نہ صرف منفرد ہے بلکہ اُردو ادب میں تاریخ کے حوالے سے سرچشمہ علم و ادب اور دلچسپ ہے۔ ملک مقبول احمد' اُن کے انٹرویوز کو کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے اپنے پیش لفظ میں' رقمطراز ہیں:

> ''ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کے ایک زیرک مصنف ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے اپنا رزق حیات محکمہ آبپاشی میں نہروں کی تعمیر اور زرعی پانی کی تقسیم سے حاصل کیا اور ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے تو ایگزیکٹو انجینئر کے عہدہ تک پہنچ چکے تھے لیکن ادب ان کی پہلی محبت تھی جو

انجینئرنگ کی ملازمت کے دوران ''عشق'' میں تبدیل ہو گئی۔ اِس تمام عرصے میں اُن کے تنقیدی مضامین' انشائیے' نظمیں اور غزلیں ملک کے نامور ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا سے وابستگی اور رسالہ ''اوراق'' سے تعلق کی وجہ سے وہ ایسے متنازعہ ادیب شمار ہوئے کہ جن سے ادب اور ادبی معاشرے کے سوالات اکثر پوچھے جاتے تھے اور وہ اپنے جوابات سے نہ صرف سوال کے موضوع کو بلکہ ادبی منظرنامے کو بھی روشن کر دیتے تھے۔ اِن کے انٹرویوز اخبارات اور رسائل میں چھپتے تو نہ صرف دلچسپی سے پڑھے جاتے بلکہ یہ موضوعِ بحث بھی بن جاتے۔''

ملک مقبول احمد کو ڈاکٹر انور سدید کی متعدد کتابیں چھاپنے کا بھی شرف حاصل ہے۔ میں ذاتی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ملک مقبول احمد ادب دوست اور ادیب شناس ہی نہیں بلکہ ادیب گر بھی ہیں۔ وہ ایک ماہر فلم پروڈیوسر کی طرح جو اپنی فلموں کے لئے اعلیٰ کردار کے چناؤ میں مہارت رکھتا ہے اپنے اشاعتی ادارے کے لئے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کو ادب کی دنیا میں متعارف کرانے میں یدطولےٰ رکھتے ہیں۔ رئیس احمد جعفری' احسان دانش' اے حمید' میرزا ادیب' ابوالامتیاز ع-س مسلم' بلقیس ریاض' ڈاکٹر طارق عزیز' ڈاکٹر صفدر محمود' علی سفیان آفاقی' طارق اسماعیل ساگر' حفیظ تائب' ڈاکٹر وحید قریشی' عبدالعزیز خالد' قمر نقوی نقشبندی' سلمیٰ اعوان' اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید جیسے نامور لوگوں کی ایک پوری کہکشاں ہے جو خود ہیرا تھے ملک صاحب نے اپنی خلاقانہ نظر طباعت سے خوبصورت اور دلکش بنا کر ایوان ادب کی گیلری میں سجا دیا ہے۔ اِن نامور ہستیوں سے ادب کے طلباء اپنے دماغوں کو روشن اور دلوں کو منزہ کرتے ہیں۔ ملک مقبول احمد کا یہ ادب میں بہت بڑا

عطیہ ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی میں عجیب اتفاقات دیکھنے میں آئے بعض ادیب اور شاعر ناشر بن کر کتب کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے اور بعض ناشر کتب کی طباعت و اشاعت اور کاروبار سے دست کش ہو کر ادیب کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ ملک مقبول احمد موخر الذکر گروہ میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ گذشتہ چار پانچ سال سے وہ ایک پسندیدہ ادیب کے طور پر ایوان ادب میں نمودار ہوئے۔ ان کی خود نوشت ''سفر جاری ہے'' جب ۲۰۰۷ء میں منصۂ شہود پر آئی تو سینکڑوں ادیبوں' شاعروں' دانشوروں اور صفحہ اوّل کے ادبی رسائل اور روزناموں نے اس کی کشادہ دلی سے پذیرائی کی اور انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اِس کتاب پر بڑے مبسوط مضامین لکھے گئے۔ خود میں نے اِس کتاب پر نہ صرف مضمون لکھا بلکہ ایک پوری کتاب ''راہ نوردِ شوق'' کے نام سے سپرد قلم کی جو ادب میں اپنی نوعیت کی اوریجنل تصنیف تھی۔ ''سفر جاری ہے'' نہ صرف اپنے متن کے لحاظ سے بلکہ اسلوب بیان میں بھی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے' اب ملک مقبول احمد ناشر سے ادیب بن کر تخلیق ادب میں مصروف ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے مضامین نو کے انبار لگا دیئے اور اب وہ بیک وقت تخلیق کار' مؤلف اور مرتب کے طور پر حرمت قلم کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں' انہیں ادیبوں اور شاعروں کو ادیبانہ رنگ میں تعارف کرانے کا خاص ملکہ ہے۔ ''پچاس (۵۰) نامور ادبی شخصیات'' اِس سلسلے میں اُن کی یادگار تصنیف ہے۔ پذیرائی' شناسائی' اہل قلم کے خطوط' سیاحت نامہ ترکی' گلشن ادب' گم شدہ افسانے اور ارمغانِ غزل اُن کی ادبی نظر کے ناقابل فراموش کارنامے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کئی دینی کتب تالیف کر کے بلا معاوضہ دین سے وابستہ لوگوں میں خوش دلی سے تقسیم کرتے ہیں۔ اُن کی ایک نہایت خوبصورت اور روح افروز کتاب پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے۔ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کو اتنی جامعیت اور اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا

ہے کہ اِسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے پہلی بار حضورؐ کا خطبہ حجتہ الوداع کا مکمل متن اِسی کتاب میں پڑھا اور اپنے دل ودماغ کو روشن کیا۔ اُن کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے کہ آج کل وہ اپنا سفرنامہ حج لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ یقیناً اُن کی یہ کاوش بھی اہل فکر و دانش پسندیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

''برسبیل گفتگو'' اُن کی تازہ کتاب ہے جس میں ڈاکٹر انور سدید کے وہ انٹرویوز شامل ہیں جو انہوں نے جون ۲۰۰۱ء سے لے کر ستمبر ۲۰۱۱ء تک کے عرصہ میں دیئے ہیں۔ اِن انٹرویوز کی روشنی میں ہم نہ صرف ڈاکٹر انور سدید کی سوانح حیات مرتب کر سکتے ہیں بلکہ اُن کا ادب کی مختلف اصناف کے بارے میں نقطہ نظر اور رائے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ادبی تاریخی دستاویز بھی مرتب کر سکتے ہیں۔

محمد اقبال نجمی نے اُن سے ایک اہم سوال تنقید کے حوالے سے پوچھا کہ ''تنقید کی خوبصورتی'' کسے کہتے ہیں۔ اس اہم سوال پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے جواب دیا:

> ''فن پارے کے داخل سے نئے نکتے کی دریافت کو تنقید کی خوبصورتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ نقاد نے اپنی دریافت کو کس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ یہ بات اسلوب سے تعلق رکھتی ہے۔ میں تنقید میں جمالیاتی اسلوب کا حامی ہوں۔ فن پارے سے تنقیدی نکتہ تخلیقی عمل سے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اِس کو تنقید کی خوبصورتی سمجھتا ہوں۔''

عجیب بات ہے کہ اُن کی تنقید کے بارے میں جواب میرے انشائی تنقیدی رویے کے نظریہ کے عین مطابق ہے۔ انشائی تنقیدی رویہ فی الحقیقت تخلیقی تنقیدی رویہ ہے۔ اِس رویہ میں تخلیق اور تنقید دونوں میں وحدت کا تصور کارفرما ہے۔ میں یہاں اپنے

انشائی تنقیدی رویہ کو زیر بحث لانا نہیں چاہتا تاہم میرے اِس تصورِ تنقید کی جھلکیاں ڈاکٹر انور سدید کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ جسے وہ جمالیاتی اسلوب کا نام دیتے ہیں۔

ادب کے حوالے سے نجمی صاحب نے ایک ذاتی سا سوال کیا کہ وہ اِس ضمن میں کن خاص دوستوں کے کام کا ذکر کرنا پسند کریں گے تو انہوں نے فی البدیہہ جواب دیا کہ ان دوستوں میں سرِفہرست تو ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ انہوں نے جدید اردو نظم اور غزل میں بڑا کام کیا لیکن اُن کے تخلیقی کام کو اِن اصناف میں لوگوں نے صحیح طور پر پہچانا نہیں۔ مگر تنقید اور انشائیہ میں اُن کا مقام بہت بلند اور ممتاز ہے۔ افسانہ نگاروں میں وہ غلام الثقلین نقوی، فرخندہ لودھی، رحمان مذنب، عذرا اصغر اور سلیم آغا قزلباش کی دوستی پر فخر کرتے ہیں۔ اردو انشائیہ میں انہیں غلام جیلانی اصغر، جمیل آذر، مشتاق قمر اور سلیم قزلباش نے بلند مقام حاصل کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں وہ بڑے رمزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ

"میں احمد ندیم قاسمی کو بھی اپنا محسن سمجھتا ہوں، انہوں نے مجھے باندازِ دگر لکھنے کی تحریک دی اور مجھے ہمیشہ سرگرمِ عمل رکھا۔ ان جیسے لوگ اب اکیسویں صدی میں پیدا نہیں ہوں گے۔ شاید اکیسویں صدی پرسکون ہوگی۔"

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ وہ بھی میری طرح تنقید میں تخلیقی رچاؤ کے حق میں ہیں۔ بقول اُن کے:

"نقاد کو اگر قدرت کی طرف سے تخلیقی اسلوب عطا ہو تو اس کی تنقید میں پڑھے جانے کی زیادہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس قسم کی تنقید کا ایک زاویہ محمد حسین آزاد ہیں۔ مولانا شبلی کی تنقید کی معنویت کو اُن کے تخلیقی اسلوب نے زیادہ کروٹ دی۔ سر سید احمد خاں کی تنقید تخلیقی

عنصر سے عاری ہے۔ اِس لئے یہ سائنسی حقیقت بیان تک محدود

ہے۔ میں نے آل احمد سرور، خورشید الاسلام، مولانا صلاح الدین احمد

کے تخلیقی اسلوب کو قبول کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی جدید تر

صورت ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ گنجلک اسلوب کے نقادوں میں

ممتاز حسین، ریاض صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کو شمار کر لیجئے۔

بلاشبہ اُن کا تنقیدی معیار بہت بلند ہے لیکن اسلوب اکثر اوقات

قاری سے معانقہ تو کیا مصافحہ بھی نہیں کرتا۔"

میں ذاتی طور پر موخر الذکر ناقدین کی تنقید کو غیر تخلیقی یا بالفاظ دیگر غیر انشائی تنقید کہتا ہوں جبکہ اوّل الذکر ناقدین کی تنقید کو انشائی تنقید کے زمرے میں شامل کرتا ہوں۔ یہ باتیں انہوں نے جون ۲۰۰۶ء میں اپنے ایک انٹرویو میں کیں جو انہوں نے اقبال نجمی کو دیا تھا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھارت) کو دیئے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے انشائیہ کی تعریف پوچھنے پر یہ جواب دیا:

"انشائیہ زندگی کے موجودہ مظاہر، اشیا، تجربات اور معمولات کو

آزاد روی، خوش خیالی اور زندہ دلی سے دیکھنے اور اس کے انوکھے

گوشوں کو نثر کے تخلیقی اسلوب، کفایت لفظی، غیر رسمی انداز اور دوستانہ

ماحول میں پیش کرنے سے عبادت ہے۔"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہم کسی بھی صنف ادب کی جامع اور مانع تعریف نہیں کر سکتے۔ تخلیق کا اپنا ایک مزاج ہے یہ کسی حد تک تو تعریف کے فریم ورک میں آجاتی ہے مگر اچھی تخلیق بالفاظ دیگر اوریجنل تخلیق اپنا راستہ خود متعین کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر

انشائیہ نگار کا اپنا اسلوب ہوتا ہے اور اِس میں اس کی کامیابی مضمر ہے۔

عمران نقوی نے اُن سے ایک بڑا عمدہ سوال کیا کہ وہ اردو کے پندرہ بڑے شاعروں کا نام بتائیں جو عظمت کے لحاظ سے بڑے ہوں نہ کہ زمانی اعتبار سے۔ اِس پر انہوں نے فی البدیہہ اپنے جواب میں جن شعراء کرام کا ذکر کیا اُن میں غالب' میر' حالی' میر انیس' اقبال' مومن' سودا' ولی دکنی' فراق' مجید امجد' راشد' میراجی' وزیر آغا' ماحر کاظمی اور شکیب جلالی شامل ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو واقعی یہ شاعر عظیم ہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر انور سدید کا اپنا نقطہ نظر ہے جو اُن کی ذاتی پسند سے تعلق رکھتا ہے ہم اُن سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فیض احمد فیض' احمد فراز اور منیر نیازی بھی تو عظیم شعراء میں آتے ہیں' جگر' عدم اور حفیظ جالندھری وغیرہ ان شعراء سے کم نہیں۔ مگر سوال کرنے والے نے ڈاکٹر انور سدید کو پندرہ کے ہندسے میں پابند کر کے انہیں مزید کہنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ میری دانست میں یہ سوال کسی پس منظر کے حوالے سے ہونا چاہئے تھا۔

''برسبیل گفتگو'' میں اُن کا تازہ انٹرویو وہ ہے جو انہوں نے زرنگار کے مدیر علامہ ضیاء حسین ضیاء کو ستمبر ۲۰۱۱ء کو دیا تھا۔ یہ سارا انٹرویو نہایت معلومات افزا ہے میں یہاں تمام انٹرویو کو تو پیش نہیں کر سکتا تاہم کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ ضیاء حسین ضیاء نے اُن سے ایک نہایت چبھتا ہوا سوال کیا کہ کیا وزیر آغا کے ''بازوئے شمشیر زن'' ہونے سے ''شخصی شہامتوں کے مقتل'' ہی آباد کئے ہیں یا ''علمی گلزار بھی لہکائے''؟

ڈاکٹر انور سدید نے اِس نوکیلے اور تیکھے سوال کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے کہا کہ

''مجھے آغا صاحب کا نیازمند ہونے کا شرف حاصل ہے تو احمد ندیم قاسمی

کے قرب سے محروم ہونے کے باوجود میں اُن کا احترام کرتا ہوں۔
حسن رضوی کے سامنے لکھے ہوئے ایک اہانت آمیز جملے اور ناصر بغدادی کے رسالہ ''بادبان'' میں اُن کی دس ننگی گالیوں کو میں نے اُن کے ''محبت کے پھول ہی میں شمار کیا ہے''، ''شخصی شہامتوں کا مقتل'' کہاں آباد ہے؟ ازراہِ کرم چند نام گنوا کر میرے علم میں اضافہ کیجئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی علمی بے بضاعتی کے باعث ''علمی گلزار'' نہیں کھلا سکا اور اپنی طالب علمانہ حیثیت پر قناعت کر کے خوش وخرم ہوں۔''

ڈاکٹر انور سدید نے بعدازاں اپنی چند ایک تصانیف کے نام بتائے جن میں: اردو ادب کی تحریکیں، فکر وخیال، اختلافات، کھردرے مضامین، اردو ادب میں انشائیہ، اردو ادب میں دیہات کی پیشکش، موضوعات، دلی دور نہیں، خطوط کے آئینے میں، اردو افسانے کی کروٹیں، سعید صورتیں، ادیبان رفتہ، نقوشِ رفتگاں، اردو نثر کے آفاق، شاعری کا دیار، اس صدی کے افسانے اور میر انیس کی قلم رو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''آپس کی باتیں'' اور ''بر سبیل گفتگو'' میں شامل تمام انٹرویوز سے ہم ڈاکٹر انور سدید کی نہ صرف سوانح عمری مرتب کر سکتے ہیں بلکہ اُن کی ادبی خدمات کا مکمل طور پر احاطہ بھی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء قصبہ میانی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم سرگودھا میں حاصل کی۔ پرائمری درجے میں ممتاز ماہر اقبالیات مرزا محمد منور کے والد مرزا ہاشم الدین اُن کے استاد تھے۔ چھٹی جماعت میں انہیں اوّل آنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ مڈل کا امتحان انہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے پاس کیا۔ انہوں نے ورنیکلر کے امتحان میں بھی اوّلیت حاصل کی۔ انہوں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول

سرگودھا سے فرسٹ کلاس فرسٹ کی حیثیت سے پاس کیا۔ اِس تعلیمی گراف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیمی لحاظ سے پرائمری سے لے کر میٹرک تک ہمیشہ اوّل آتے رہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ایم۔اے (اردو) بھی فرسٹ کلاس فرسٹ کی حیثیت سے پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انجینئرنگ کی فنی تعلیم انہوں نے گورنمنٹ انجینئرنگ سکول رسول سے حاصل کی۔ یہاں بھی اعزاز کے ساتھ اوّل آئے اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ دورانِ ملازمت ادیب فاضل کیا اور اِس میں بھی اوّل آئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رہنمائی میں پی۔ایچ۔ڈی کیا۔

''برسبیل گفتگو'' میں جن ادیبوں اور شاعروں نے اُن سے گفتگو کی اُن میں اقبال نجمی، عارف شفیق، ساحل ناصری، کرامت بخاری، احسن اختر ناز، خاور چوہدری، شائستہ حمید خان، راشد حمید، سلطانہ مہر، ندیم اپل، محمد ہاشم خاکوانی، مناظر عاشق ہرگانوی، عمران نقوی، عذرا اصغر، کاظم جعفری، عبدالرؤف روفی، عرفان احمد اور ضیاء حسین ضیا شامل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید اُن خوش نصیب شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی حیاتِ مستعار میں اپنی صلاحیتوں کا لوگوں سے لوہا منوایا۔ اُن کی گرانقدر ادبی خدمات کے صلے میں انہیں تین طلائی تمغے اور چار قومی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ غالباً ۲۰۰۸ء میں حکومت پاکستان نے انہیں تمغہ امتیاز سے بھی سرفراز کیا۔ ''برسبیل گفتگو'' کے انٹرویوز میں انہوں نے ادب کی تمام اصناف کا بشمول صحافتی ادب کے احاطہ کیا ہے۔ یقیناً یہ کتاب اردو ادب کے طلباء کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے بڑی جچی تلی، متوازن، صحیح اور شائستہ ہوتی ہے۔ ان کی روحانی بنیاد قرآن کریم اور اسوۂ رسولؐ کے قابل عمل اصولوں پر استوار ہے۔ جب علامہ ضیاء نے اُن سے دینی عقائد اور مذہب کے بارے میں سوال کیا تو انہوں

نے بڑے تیقن اور پختہ ایمانی کے ساتھ کہا کہ مجھے مذہبی انسان ہونے پر فخر ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ قرآن مجید رسول آخرالزمانؐ پر وحی کے ذریعے اتاری جانے والی آسمانی کتاب ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور میرے ایمان کا حصہ ہے۔ اسلام کی پیروی دنیوی اور اُخری فلاح کا راستہ استوار کرتی ہے۔ انور سدید میں انکسار ہے وہ علم سے محبت کرتے ہیں' کتاب سے دوستی اور خیال خاطر احباب رکھتے ہیں۔ وہ بڑے خوددار' قناعت پسند اور رزق حلال کما کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ اُن کی رگوں میں راجپوتی خون بھی ہے اِسی لئے وہ دوستوں کے دوست ہیں اور دشمنوں کے کھلے دشمن ہیں۔ منافقت' ابن الوقتی' مفاد پرستی سے انہیں شدید نفرت ہے۔ انہیں گالی کا جواب دینے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور اپنے مخالفین کو زچ کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے۔ لاہور کے بعض غیر سنجیدہ جملہ باز ادیب اور شاعر اُن کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ مجھے اُن کے ساتھ پُرخلوص دوستی اور محبت پر آسودگی قلب حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سدا انہیں اپنی عافیت میں رکھے! ملک مقبول احمد اگر اُن کے یہ گرانقدر انٹرویوز منظر عام پر نہ لاتے تو یقیناً ہم بہت بڑے علمی سرمایہ سے محروم رہتے۔ ہم تہہ دل سے ان کی اس سعی مشکور کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

برسبیل گفتگو پر گفتگو

ملک مقبول احمد کا نام ملک کے معروف ناشرین میں تو پہلے ہی تھا۔ جب سے انہوں نے کاغذ اور قلم سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے تو بطور ادیب بھی ان کی شہرت کا شاہین آسمانِ ادب کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگا ہے۔ ملک صاحب کے اندر ابتدا ہی سے ایک ادیب چھپا بیٹھا تھا۔ کاروباری مصروفیات اور گھریلو جھمیلوں کی وجہ سے ان کی نظر اس پر نہ پڑ سکی۔ ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو ان کے پوتے پوتیوں اور چند دوستوں نے دریافت کیا۔ انہوں نے ملک صاحب کو اپنی آپ بیتی لکھنے پر مائل کیا تو انہوں نے اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کے عنوان سے تحریر کی۔ جس کی بہت پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ پروفیسر جمیل آذر نے ''راہ نوردِ شوق'' کے نام سے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ علاوہ ازیں دو کتابیں پذیرائی اور شناسائی کے نام سے معرضِ وجود میں آئیں۔ جن میں آپ بیتی کے حوالے سے پاک و ہند کے معروف ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ جنہوں نے ملک صاحب کے رخشِ قلم کو مہمیز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قرطاس کے سینے پر سرپٹ دوڑنے لگا اور وہ بہت کم وقت میں ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مؤلف بن گئے۔ انشاء اللہ کتب کی اشاعت کا یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

آج کل ان کی کتاب ''برسبیل گفتگو'' میرے مطالعے کی غذا بنی ہوئی ہے۔ اس

کتاب میں ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کے انٹرویوز کی کتاب اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ پہلی کتاب میں اٹھارہ انٹرویوز تھے اور موجودہ کتاب بھی اٹھارہ انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ ادبی رسائل اور جرائد میں بکھرے ہوئے انٹرویوز جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ملک صاحب کی یہ عادت ہے کہ جس کام کے کرنے کا وہ ٹھان لیتے ہیں پھر اسے مکمل کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اپنے متعدد انٹرویوز میں ملک صاحب کے ادارے سے اپنی شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر بڑے احسن انداز میں کیا ہے۔ ملک صاحب بھی اس کتاب کے پیش لفظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

''میرے اشاعتی ادارہ مقبول اکیڈمی کو ڈاکٹر انور سدید کی متعدد کتابیں چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ سلسلہ ان کے سفرنامہ ''دلی دور نہیں'' سے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں ہوا اور اب تک جاری ہے۔''

''آپس کی باتیں'' اور ''برسبیل گفتگو'' میں انور سدید کے سوانحی حالات کا دہرایا جانا ایک قدرتی بات ہے۔ دونوں کتابوں میں ان کے حالات زندگی کو اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ قاری کو زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ ملک مقبول احمد پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''ان کی کئی باتیں سابقہ انٹرویوز میں بھی پیش کی جا چکی ہیں لیکن جواب میں نئی باتوں کا اضافہ بھی ہوتا چلا گیا ہے۔''

اس کتاب میں نئے ادیبوں نے اپنے انداز سے انٹرویوز کئے ہیں۔ صرف ایک نام عمران نقوی کا ہے جو پہلی کتاب میں بھی موجود ہے مگر ان کا انٹرویو بالکل نیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید سے تنقید کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار سوالات کئے گئے ہیں۔ انہوں نے نہایت خوبصورت انداز میں مدلل جواب دیئے ہیں

انور سدید سے پوچھا گیا بعض شاعر ادیب اپنے سینئر قلم کاروں کے بارے میں منفی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں خود کو نہ صرف ان سے بلکہ دوسروں سے بھی برتر فنکار تسلیم کرانے کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں جبکہ ان کی تحریریں پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب وقت کا بہتا ہوا دریا بھی دیتا رہتا ہے۔ وقت کا دریا اپنی پشت پر بہت کچھ لاد کر چلتا رہتا ہے مگر جب وہ اپنے مدار میں داخل ہونے لگتا ہے تو صرف ان کو اپنے ساتھ لے کر داخل ہوتا ہے جو اس قابل ہوتی ہیں۔ باقی کو خس و خاشاک سمجھ کر پہلے ہی اپنی پشت سے اتار کر پھینک دیتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کا جواب سنئے:

"بیشتر جونیئر ادیبوں نے ادب کا پورا ریاض کئے بغیر اور کوئی کارنامہ انجام دینے سے پہلے اپنی عظمت کا پرچم بلند کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے قلم سے نکلی ہوئی تحریر کو نوائے سروش قرار دے رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کی تعریف و تحسین کریں۔"

بڑے ادب کی تعریف ڈاکٹر انور سدید نے ان الفاظ میں کی ہے جس سے بڑے ادب کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"بڑا ادب وہ ہے جو روح کے داخلی جزیروں کی آبیاری کرے، انسانی دکھ پر شبنم افشانی کرے، خارجی کرب کو مسرت میں شرابور کر دے اور اعلیٰ اخلاقیات کی افزائش کرے۔"

انور سدید کو اپنے ملک سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ وہ وطن سے باہر جاتے ہیں تو جلد ہی انہیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگتی ہے۔ کسی دوسرے ملک میں جا کر

مستقل رہنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ان کی پہچان اپنے ملک سے ہے اور وہ اس پہچان کو اپنے لئے باعث فخر خیال کرتے ہیں۔ ارض وطن سے وابستگی ایک قدرتی امر ہے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

''ارض وطن سے وابستگی اور کمٹمنٹ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ ہر ملک ملک ماست محض منطقی مفروضہ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان سے باہر جاتے ہی پاکستان کی دھرتی واپس بلانے لگتی ہے اور وطن کی یاد ستانے لگتی ہے اور اپنی جڑوں سے الگ ہو جانے کا احساس ہونے لگتا ہے۔''

معروف اور بڑے ادیب کے فرق کو ڈاکٹر صاحب اس انداز سے وضاحت کرتے ہیں کہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے:

''ادب کا معروف ترین پیمانہ تو ذوقِ ادب ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ تعلیم اور مطالعہ اس ذوق کی پرورش کرتے ہیں اور معیاری ادب کی پرکھ کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔''

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی بارات'' کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

''یادوں کی بارات سے ایک بات سامنے آئی ہے کہ خودنوشت میں دروغ گوئی کو شامل کرنے کے مواقع دستیاب ہو جاتے ہیں اور یاد نگار جتنا جھوٹ چاہے خود لکھ سکتا ہے۔ اس قسم کا افسانوی تاثر قدرت اللہ شہاب نے بھی پیدا کیا۔ مجموعی طور پر یادوں کی بارات کے تاثرات مثبت نہیں ہیں۔''

راشد نے سوال کیا کہ نئی تخلیقات کے مقابلے میں قاری پرانی تخلیقات کو زیادہ اہم کیوں اور بہتر سمجھتا ہے؟ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب کا جواب سنئے کہ انہوں نے اس سوال کا جواب مختصر مگر جامع انداز میں دیا ہے:

''پرانی تخلیقات وقت کے جاروب کش کی زد سے نکل چکی ہیں اور ان کا معیار پرکھا جا چکا ہے۔ نئی تخلیقات زمانے کے میزان میں پڑی ہیں۔ ان پر ابھی حتمی فیصلہ نہیں دیا گیا۔ یہ فیصلہ وقت کے ہاتھ میں ہے جو بہترین منصف ہے۔''

انشائیہ کو ابتدا ہی سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اب تک یہ صنف مخالفت کی زد میں ہے۔ شدید ترین مخالفت کے باوجود اس صنف نے نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھا بلکہ تیزی سے ترقی کی منازل طے کر کے اردو ادب میں اپنا مقام بھی بنالیا ہے۔ انشائیہ آج بھی ادبی رسائل و جرائد میں نمایاں مقام پر کھڑا ہے۔ ایک انٹرویو میں ہرگانوی نے ڈاکٹر صاحب سے انشائیہ کی جامع تعریف پوچھی تو انہوں نے کہا:

''انشائیہ زندگی کے موجودہ مظاہر' اشیا' تجربات اور معمولات کو آزردہ روی' خوش خیالی اور زندہ دلی سے دیکھنے اور اس کے انوکھے گوشوں کو نثر کے تخلیقی اسلوب' کفایت لفظی غیر رسمی انداز اور دوستانہ ماحول میں پیش کرنے سے عبارت ہے۔''

ہرگانوی نے ڈاکٹر صاحب سے عشق کے متعلق ان کے نظریے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا:

''اس کی توضیح کے لئے اقبال کا ایک مصرعہ مستعار لینے کی اجازت دیجئے۔ یہی عشق کی تغیر بھی ہے اور نظریہ بھی۔

"عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام"

محققین ادب کی دفن شدہ حقائق کو تحقیق اور جستجو سے منظر عام پر لاتے ہیں۔ وہ شدید محنت کے بعد اصل ماخذ تک پہنچتے ہیں جو ایک دقت طلب ہے اور صبر آزما کام ہے۔

انور سدید ایک زود نویس ادیب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی ادبی رسالہ اٹھایا جائے انور سدید سے مصافحہ اور معانقہ ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ عرصہ دراز سے بڑی باقاعدگی اور تیزی سے لکھ رہے ہیں۔ ہر سال ان کی دو ایک کتابیں کاغذی لباس میں ملبوس ہو کر قاری کے ادبی ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ زود نویسی کے باوجود وہ معیار کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ عمران نقوی ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کے قلم پر کبھی تھکاوٹ طاری ہوئی ہے؟ جواب میں وہ کہتے ہیں:

> "جی ہاں زندگی کے ۸۰ ویں برس میں مجھے اضمحال کا احساس ہو رہا ہے اور اب جسم اجازت دے تو کام کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ زندگی کا بونس اب کم رہ گیا ہے۔ اس لئے جلدی جلدی اپنے کام سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

کاظم جعفری ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا نئی نسل میں شعر و ادب کے امکانات موجود ہیں؟ کاظم کے سوال پر انور سدید کہتے ہیں:

> "ہر نئی نسل سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صادق روایات کو توسیع دے تو جدیدیت کے پیوند سے فنی شجر کاری بھی کرے، اردو ادب میں جو نئے ادبار نمودار ہو رہے ہیں ان میں یہ صفات نمایاں نظر آتی ہیں اور مجھے اردو ادب کا مستقبل روشن نظر آ رہا ہے۔"

روفی نے ان سے انٹرویو کے دوران پوچھا کہ ناول اور افسانے میں سے کون سی صنف زیادہ پسند ہے؟ تو انور سدید نے جواب دیا:

''مجھے دونوں اصناف پسند ہیں۔ افسانہ کسی درخت کی ایک شاخ ہے جبکہ ناول پورا درخت موسوم کیا جاتا ہے۔ افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے۔ ناول پوری زندگی ہے۔''

عرفان احمد نے ان سے پوچھا کہ آپ کی ذہنی نشوونما میں سب سے زیادہ کس مصنف کا اثر ہوا؟ انور سدید نے جواب دیا:

''میں نے سب سے زیادہ استفادہ ڈاکٹر وزیر آغا سے کیا ہے۔ ان کا مطالعہ ہمہ جہت اور وسیع ہے اور وہ اپنے مطالعے میں دوستوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔''

''برسبیل گفتگو'' کے مطالعہ سے ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کے وہ گوشے جو ابھی تک قاری کی نظروں سے اوجھل تھے آئینہ ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے تنقید' تحقیق اور ادب کی مختلف اصناف کے بارے میں گراں قدر معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ''برسبیل گفتگو'' کے مطالعہ سے ان کی حالات زندگی' روزمرہ کے معمولات بچپن کے حالات اور ان کے اساتذہ کے بارے میں سیر حاصل معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب اردو ادب میں عمدہ اضافہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے نہ صرف ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں بلکہ اردو ادب کے مختلف رجحانات سے آگاہی اور شناسائی ہوتی ہے۔ بے حد مفید کتاب ہے آپ اس کا مطالعہ کر کے تو دیکھئے آپ بھی اس کے قائل ہو جائیں گے۔

اظہر جاوید

''سبیل گفتگو''

یہ کتاب بھی انور سدید صاحب کے انٹرویوز پر مبنی ہے، جسے بڑے سلیقے سے جمع کر کے ملک مقبول احمد نے شائع کیا ہے۔ تبصرے میں ایک جملہ اُوپر لکھا ہے...... ''یہ کتاب بھی''...... تو اس 'بھی' کا محل یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ملک مقبول احمد ''آپس کی باتیں'' کے عنوان سے انور سدید کے انٹرویوز اکٹھے کر کے چھاپ چکے ہیں...... خوشی کی بات یہ ہے، ملک مقبول احمد کے اندر کے قلم کار نے یہی کوئی تین چار برس پہلے انگڑائی لی اور اپنی ''نوجوانی'' کی جولانی دکھانا شروع کر دی...... اپنی آپ بیتی لکھی، سفرنامہ تحریر کیا اور دوسری کئی کتابیں تصنیف و تالیف کر ڈالیں...... وضع دار ہیں، مروت والے ہیں اور آنکھوں میں دید لحاظ کی رمق ہے...... انہوں نے محسوس کیا، انور سدید نے اب تک بیسیوں لوگوں کے بارے میں لکھا ہے...... کئیوں کو عروج دیا...... کئی ایک کی عظمت کو سراہا، مگر خود کو پچھلی صفوں میں رکھا، نہ شہرت کی تمنا نہ صلہ کی پروا...... اُن کے بارے میں کچھ خوش ظرف لوگوں نے جو کچھ لکھا، کسی نے انٹرویو صرف اس شوق میں کیا کہ اس میں سے متنازع معاملات کو اُبھارا جائے، انور سدید کو تلخ جملوں سے دیوار سے لگانے کی کوشش کی۔ (کارنر کرنے کی) لیکن انور سدید کا تدبر، تحمل اور علمی تبحر نمایاں رہا...... منفی

سوالوں کا جواب بھی مثبت انداز میں دیا اور ادب کی تاریخ کو روشن رکھا......

ملک مقبول احمد نے (شاید، تہیہ کر رکھا ہے کہ انور سدید کی درویشی کی لوئی (درویش کی گدڑی) کو ذرا سا سرکا کر اُن کے قلم کے کرشموں اور ان کی عبقریت کے جوہروں کو جلوہ نمائی کی جائے...... زیادہ داد ملک مقبول کے حصے میں جاتی ہے......

انور سدید ہمہ صفت موصوف ہیں۔ نثر، نظم دونوں میں رواں......کوئی صنفِ سخن ان کی دسترس سے بچی نہیں۔ پرگوئی اور زودنویسی کے باوجود، اپنے پرائے سبھی مانتے ہیں، کہ اُن کی کوئی تحریر بھی سطحی نہیں ہوتی۔ مطالعے کی گواہی دیتی ہے......لوگ حیران ہو ہوکر پریشان ہوتے ہیں کہ وہ اتنا لکھنا تو درکنا، اتنا پڑھ کیسے لیتے ہیں...... اُردو دنیا...... کیا پاکستان، بھارت کیا دیارِ مغرب...... جہاں کوئی رسالہ، کتاب چھپتی ہے اس کی خوشبو اُن تک پہنچ جاتی ہے اور پھر کسی نہ کسی ذریعے سے رسائی بھی ہو جاتی ہے...... بہت دوستوں سے تعلق خاطر ہے مگر اُن کی تعریف میں بھی ڈنڈی نہیں مارتے...... خوش اسلوبی سے رائے دیتے ہیں۔ بہت سے دوستوں کو تو وہ اپنی ہر تحریر میں کسی نہ کسی بہانے یاد کرتے (ہی) رہتے ہیں۔ اُن میں قابل ذکر احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔

کتاب میں شامل انٹرویوز مختلف خواتین و حضرات نے اپنے اپنے اخبارات اور رسائل کے لئے کئے...... ان میں عذرا اصغر، سلطانہ مہر، شائستہ حمید خان، مناظر عاشق ہرگانوی (بھارت)، ہاشم خاکوانی اور کاظم جعفری اور دوسرے اہل قلم شامل ہیں۔ انتساب جمیل آذر، نذیر احمد تشنہ اور شبیر احمد میواتی کے نام ہے۔ ایک ایک فقرہ ان کی صفات کا بھی لکھا گیا ہے۔ انیس یعقوب نے حسبِ معمول بہت معنی آمیز سرورق بنایا ہے۔

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

فروری 2012ء

خاکے

خطوط

فہرست

☆☆☆==☆☆==☆☆☆

انور سدید

ملک مقبول احمد (ادب شناس ناشر)

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ادب کے جرثومے ملک مقبول احمد کے باطن کے ''سیف بکس'' میں مبدائے فطرت نے ان کی پیدائش کے وقت ہی رکھ دیئے تھے اور یہ جرثومے وقت کی روانی کے ساتھ پرورش پاتے رہے چنانچہ وہ اپنے گاؤں سے نکل کر لاہور آئے اور تلاشِ معاش میں مصروف ہو گئے تو سب سے پہلے ''ادب'' نے ہی انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے رسالہ ''چودھویں صدی'' جاری کیا اور اس رسالے کے مرکز پر اس دور کے تمام نامور ادیبوں کو جمع کر لیا۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' اپنی اشاعتی زندگی کی چند بہاریں ہی دیکھ سکا اور مفت پڑھنے والوں کی بے جا فرمائشوں کی وجہ سے مالی خسارے کا سامنا نہ کر سکا اور بند ہو گیا۔ لیکن آپ اسے ایک چھوٹی سی ندی کو ایک بڑے دریا میں شامل ہو جانے کا عمل سمجھئے کیوں کہ ''چودھویں صدی'' کی اشاعت بند کر دینے کے بعد ملک صاحب نے مقبول اکیڈمی کی داغ بیل ڈالی اور یہ اشاعتی میدان میں ان کا اگلا قدم تھا جس کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی اس دور کے نامور ادیب رئیس احمد جعفری نے کی۔ اب میں مقبول اکیڈمی کی کامیابیوں کا شمار کرتا ہوں اور اس اشاعتی ادارے کے ساتھ ملک کے بیشتر ممتاز ادیبوں کو منسلک دیکھتا ہوں تو مجھے یہ ادارہ واقعی ایک علمی، ادبی اکیڈمی نظر آتا ہے اور ملک مقبول احمد ان مصنفین کی کتابوں میں گھرے ہوئے خود بھی ایک کتاب ہی نظر آتے ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ کتابوں اور مصنفین کی ہم نشینی کے اس جمال نے ادب کے ان جرثوموں کی زیادہ افزائش کی جو اپنی غذا مقبول اکیڈمی کی ادبی فضا سے حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک دن اہلِ ادب نے حیرت سے دیکھا کہ ملک مقبول احمد ایک کتاب کے مصنف کی حیثیت سے ان کے سامنے رونما ہو گئے تھے۔

یہ کتاب ان کی سوانح عمری تھی جو انہوں نے ایک ناشر کی حیثیت میں اپنے تجربات کی روشنی میں ''سفر جاری ہے'' کے نام سے لکھی تھی اس کتاب کو پوری اردو دنیا میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ملک مقبول احمد نے سادہ زبان میں اپنی زندگی کے'' سچ'' کو دروغِ مصلحت آمیز سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس کتاب کو کسی اردو ناشر کی پہلی آپ بیتی قرار دیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ ملک صاحب نے اپنی اس پہلی کتاب سے مسرت اور طمانیت تو بے پایاں حاصل کی لیکن تصنیف و تالیف کے سلسلے کو بند نہیں ہونے دیا بلکہ اس نئے میدان میں اپنا سفر جاری رکھا اور اب وہ'' اہل قلم کے خطوط'' .... ''سفرِ آرزو'' ''سیاحت نامہ ترکی'' . . . . '' پچاس نامور ادبی شخصیات گمشدہ افسانے ارمغان غزل'' ... '' شناسائی'' .... '' پذیرائی'' اور'' گلشن ادب'' جیسی کتابوں کے مؤلف و مصنف بن چکے ہیں اور اعزاز کی بات یہ ہے کہ ایجوکیشنل یونیورسٹی لاہور کی ایک طالبہ نے ان کی کتاب ''سیاحت نامہ ترکی'' پر ایم اے کا امتحانی مقالہ بھی تحریر کیا ہے۔ جواب'' نشاطِ سفر'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

جملہ معترضہ قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن اس کے بغیر میرے لیے بات کو آگے بڑھانا ممکن نہیں تھا۔ اور اب یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملک صاحب نے اپنے ادارے سے میری ایک کتاب دلی دور نہیں'' 1998 کی دہائی میں شائع کی تھی۔ اس سے قبل میں اس ادارے کی کتابوں کا محض ایک قاری تھا۔ جناب مجیب الرحمان شامی کے رسالہ'' قومی ڈائجسٹ'' کے ادارتی عملے میں شامل ہوا تو اسی ادارے کی کتابیں تبصرے کے لیے بھی میرے پاس آنے لگیں۔ مجھے حیرت ہوتی کہ مقبول اکیڈمی نے ادب کے ہر موضوع پر کتابیں چھاپی تھیں اور انہیں جہاں اعلیٰ پائے کے نامور مصنفین کا تعاون حاصل تھا۔ وہاں وہ نسبتاً نئے لکھنے والوں کے تعارف سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ اور ان کی ابتدائی کتابیں چھاپ کر انہیں ادب کے آسمان کا روشن ستارہ بنا دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن معروف مزاح نگار تنویر حسین سے ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے ادیب

بننے کا تمام کریڈٹ ملک مقبول احمد کو دیا اور خاص بات یہ بتائی کہ لاہور کے بعض ناشرین مصنفین سے پیسے لے کر ان کی کتابیں چھاپتے ہیں لیکن ملک صاحب مصنف کو رائیلٹی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مصنف اسے اپنے ادبی وقار میں اضافہ تصور کرتا ہے اور پھر اسی ادارے کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہو جاتا ہے۔ ان کی کتاب اہل قلم کے خطوط شائع ہوئی تو رائیلٹی کی خاموش اور علم طلب ادائیگی کی بات کئی ادیبوں نے بھی لکھی اس اجمال کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مقبول اکیڈمی اور ملک مقبول احمد کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن ان سے میرا با قاعدہ تعارف ماہنامہ ''تخلیق'' کے گیسو دراز ایڈیٹر اظہر جاوید نے کرایا تھا جو لکھنے والی خواتین کے حلقے میں ''ادب کا کرشن کمار'' شمار ہوتے تھے۔ اظہر جاوید میرے جنم شہر سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں بھاگٹانوالہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ادب کا ذوق طالب علمی کے زمانے سے ہی پالنا شروع کر دیا تھا اور سرگودھا میں شاعر شباب الطاف مشہدی اور ممتاز الشعراء جوہر نظامی کی شاگردی بھی اختیار کی تھی لاہور آئے تو زندگی گزارنے کے لیے متعدد پاپڑ بیلے۔ اور آخر اس دور کے مقبول اخبار ''امروز'' میں ملازمت اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ہی اپنا ذاتی ادبی رسالہ ''تخلیق'' بھی جاری کیا۔ ''تخلیق'' اور ''اظہر جاوید'' سے میرا ادبی تعلق سرگودھا کے حوالے سے ہی ہوا۔ اور اب میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' میں ''غالب کے نئے خطوط'' کا سلسلہ شروع کیا تو اس کو کتاب کی صورت بھی دلائی۔ میں دہلی کی یاترا کر کے آیا تو انہوں نے اس سفر کے ادبی مشاہدات ''تخلیق'' میں قسطوں میں چھاپے اور جب اسی سفر نامے کی قیمت کتاب کے برابر ہو گئی تو میرا تعارف ملک مقبول احمد سے کرایا۔ اس ملاقات میں ہی مجھے محسوس ہوا کہ اظہر جاوید ملک صاحب کے دام محبت میں عرصے سے گرفتار تھے۔ اور ملک صاحب بھی اظہر جاوید کو رسالے کا ایڈیٹر نہیں سمجھتے تھے بلکہ بھائی تصور کرتے تھے اور ان کی کسی بات کو ٹالتے نہیں تھے۔ اس ملاقات میں ملک صاحب نے جب پر تکلف چائے میز پر سجادی تو اظہر جاوید نے کیک کا ٹکڑہ اٹھانے سے پہلے ان

کے سامنے میری کتاب ''دلی دور نہیں'' رکھ دی اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی۔ میرا خیال تھا کہ لاہور کے دوسرے ناشرین کی طرح ملک صاحب اس کتاب کو پڑھنے اور ادارے کے متعلقین سے مشورہ کرنے کا ذکر کریں جو معنوں اور کتاب کی عدم قبولیت کے مترادف ہوگا لیکن مجھے حسرت ہوئی کہ انہوں نے اسی وقت کاتب کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس کتاب کی کتابت کر دے۔ کاتب اٹھ کر گیا تو ملک صاحب اظہر جاوید کے سامنے سراپا درخواست گزار بن گئے اور بولے ''حضرت جی! اب چائے لیجئے''

تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ملک مقبول صاحب اپنے ادارے کے مصنفین کے ساتھ کاروباری سلوک نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنے حلقہء احباب میں شامل کر لیتے ہیں اور دوستانہ تعلقات کی نوعیت بدل کر برادرانہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

مجھے ملک صاحب کے ساتھ اس رشتے میں بندھے ہوئے اب قریباً ربع صدی ہو گئی ہے اور میں بات کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی کتابوں کا ناشر تلاش کرنے سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ میری چند اولین کتابیں ''دلی دور نہیں'' میر انیس کی قلم رو'' برسبیل تنقید'' شائع کرنے کے بعد انہوں نے میرے لیے اشاعت کا نظم الاوقات بھی طے کر دیا اور کہا کہ وہ جب تک زندہ ہیں (خدا ان کی صحت مند عمر دراز کرے) ہر سال میری کم از کم ایک کتاب ضرور شائع کریں گے چنانچہ اب صورت یہ بن گئی کہ ایک کتاب چھپ جاتی تو دوسری زیر طباعت او تیسری زیر ترتیب ہوتی۔

میں نئی کتاب پر کام کر رہا ہوتا تو ملک صاحب میری نئی چھپی ہوئی کتاب کی اعزازی کتابوں کا بنڈل اٹھائے ہوئے تشریف لے آتے اور مجھے حیرت زدہ کر دیتے۔ ساتھ ہی کہتے ''نئی کتاب کا مسودہ دیجئے''۔ ان کے جانے کے بعد میرا استعجاب اور تبسم ہو جاتا کہ ایک بند لفافہ صوفے پر پڑا ہوتا اور اسی میں رائیلٹی کی وہ رقم ہوتی جس کا ملک

صاحب کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اعتراف حقیقت کے طور پر عرض ہے کہ میں ہر سال ایک کتاب مکمل کرنے اور ملک صاحب کو پیش کرنے کے معاہدے پر ضعیفی کے بوجھ سے دب جانے کی وجہ سے باقاعدہ عمل نہ کر سکا تو ملک صاحب نے ایک اور طریقہ وضع کر لیا۔ انہوں نے اخبارات و رسائل سے میرے انٹرویوز تلاش کیے اور دو کتابیں ''آپس کی باتیں'' اور ''بر سبیل گفتگو'' مرتب کر کے شائع کر دیں۔

کہنے لگے کہ نئی کتاب چھاپنے کے لیے نہیں دیں گے تو ترتیب و تدوین کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اظہر جاوید زندہ تھے تو ملک صاحب کی محبت کے عملی زاویوں کا ذکر فراوانی سے کرتے تھے۔ ایک دن بتانے لگے کہ میں مقبول اکیڈمی کی کتابوں کا اختیار اپنے رسالہ ''تخلیق'' میں ان کے استاد کے بغیر ایفائے دوستی کے لیے شامل کر لیتا ہوں۔ لیکن ان کے پاس رسالہ پہنچتا ہے تو کتابوں کے اشتہار کا معاوضہ خود ہی طے کرتے ہیں اور اسی روز بند لفافہ مجھے دفتر میں مل جاتا ہے اظہر جاوید ان کی اس خوبی کا اظہار بھی اکثر کرتے کہ میں انہیں کسی غیر ملکی ادیب کی لاہور آمد کی خبر کرتا تو ان کا سوال ہوتا ان کی ضیافت کب اور کہاں کرنی ہے اس تقریب ملاقات کے جملہ انتظامات میرے ذمے ڈال کر مالی امور خود سنبھال لیتے۔ تقریب ہو جاتی تو غیر ملکی ادیب خوشی سے سرشار واپس جاتے لیکن ان کی تقریب کے تمام اعزازات میرے کھاتے میں جمع ہو جاتے۔ ملک صاحب کے اس کریمانہ عمل کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مجھے یاد ہے کہ بھارت کے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال ایک دفعہ لاہور آئے تو اپنے نئے ناول ''خواب رو'' کا مسودہ بھی ساتھ لائے وہ اسے پاکستان میں چھپوانا چاہتے تھے۔ میں نے ملک صاحب سے ذکر کیا تو وہ اسی کے ناول کا مسودہ لینے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں پہنچ گئے جن کے پاس جوگندر پال ٹھہرے ہوئے تھے۔ دریافت کیا کہ پال صاحب کتنے دن پاکستان میں قیام کریں گے انہوں نے کہا کہ وہ ایک ہفتہ لاہور میں ٹھہریں گے'' ملک صاحب عرصہ قیام کا سن کر واپس چلے گئے۔ اور پھر ایک ہفتے میں کتاب چھاپ کر

جوگندر پال کو پیش کروں۔ اب پال صاحب کا دہلی سے خط آیا تو وہ ملک صاحب کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں اوران کی تعریف بے تحاشا کرتے ہیں کہ ایسا مستند ناشر تو انہوں نے دہلی میں بھی نہیں دیکھا۔

بلاشبہ ملک مقبول احمد کو بنیادی طور پر ایک ناشر ہی کہنا چاہیے لیکن ان کی فطری خوبی یہ ہے کہ وہ تعلقات استوار کرنے اور نسبتیں قائم رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ دوستوں سے اپنے مسائل کا ذکر نہیں کرتے لیکن ان کی مشکلات دور کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ وہ ادب کے مخصوص مکتبہ فکر سے تعلق نہیں رکھتے' بلکہ ایک کشادہ نظر انسان کی حیثیت میں ہر نظریے کے ادیب کا احترام کرتے ہیں اور خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے زندگی سے جو تجربات حاصل کیے ہیں ان کے مثبت زاویوں پر عمل کرتے ہیں اور منفی زاویوں کو صرف غلط کی طرح مٹا ڈالتے ہیں۔ اللہ نے انہیں فطری اخلاقی خوبیوں سے سرفراز کرر کھا ہے اور ان سے پہلی ملاقات میں ہی احساس ہو جاتا ہے کہ آپ سادہ طبیعت کے ایک ایسے خوش خلق انسان سے ملاقات کررہے ہیں۔ جو اپنی طبع حقیقت پسند کو کسی ناواجب بات سے آلودہ نہیں کرتے ان کی یہ خوش روی اللہ کو بہت پسند ہے جس نے انہیں لمبی عمر عطا کی ہے۔ ملک مقبول احمد صاحب اسّی کی حد عبور کر چکے ہیں اور صحت مند نظر آتے ہیں۔ بیماریوں کا ایک دور گزار کر وہ پانی کے علاج کی طرف آ گئے اور اس علاج کی شفایابی سے ایسے متاثر ہوئے کہ اب اپنے دوستوں کو بھی پانی کے علاج کی طرف راغب کرتے رہتے ہیں اور پانی کے علاج کی کتاب مفت تقسیم کرتے ہیں۔ ان کا منزاج دینی ہے۔ اللہ کی طرف سے انہیں کئی مرتبہ مکے مدینے کا بلاوا آ چکا ہے حج اور عمرے کی سعادت انہیں کئی مرتبہ حاصل ہو چکی ہے دین اسلام کی خدمت کے لیے اب انہوں نے تبلیغی کتابوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے ان کی تالیف کی ہوئی یہ کتابیں بلا قیمت تقسیم ہوتی ہیں اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف لانے کا فریضہ ادا کرتی ہیں میں دعا کرتا ہوں کہ فیض کا یہ سلسلہ جاری رہے اور ملک مقبول احمد کا ادارہ ان کی صحت مند راہنمائی میں ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

پہلے میں ملک مقبول احمد صاحب کی تحریروں کے حوالے سے اُن کا معترف تھا اور اب اُن کی دل نواز و دل گداز شخصیت کے حصار میں ہوں۔ انہوں نے ایک ناشر اور مصنف کے طور پر جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی اس میں ان کی دل موہ لینے والی شخصیت کا بہت حصہ ہے۔ بہت سے تخلیق کار اور قلم کار ایسے ہیں جن کی تحریریں دامن دل کھینچتی ہیں لیکن ان کے قریب جاؤ تو دامن کشاں پرے ہٹنے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اُن کا عمل اس کے برعکس شہادت دیتا ہے۔ ملک صاحب جیسے اپنے لفظوں میں ضوفشاں ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر اپنی من موہنی شخصیت میں عکس ریز ہیں۔ اُن کی شخصی زندگی اور کاروبارِ حیات کا بہت کچھ احوال اُن کی خودنوشت سوانح ''سفر جاری ہے'' میں مذکور ہے جسے ایک بار پڑھ لو تو پھر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک کامیاب اور فعال زندگی کے اصول جس طرح ملک صاحب موصوف نے خود پر آزمائے اور ان کے بہتر نتائج پائے ہیں۔ دوسروں کے یہاں کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

بہت عرصہ ہوا، یہی کوئی لگ بھگ پینتیس برس اُدھر کی بات ہے جب میں نے پہلی بار ملک مقبول احمد صاحب کا نام اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر ایم ایس ناز کی زبان سے سُنا۔ مرحوم تحقیق کے آدمی تھے۔ تاریخ کے خوابیدہ گوشے کھنگالنے کے ساتھ ساتھ وہ

شخصیت کی پرتیں اُتارنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ بعض اوقات وہ اتنی بے دردی سے یہ فریضہ انجام دیتے کہ شخصیت بے چاری کو نڈھال کر کے رکھ دیتے۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز کے ملک رب نواز مرحوم کے پاس اُن کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ کبھی کبھار وہ میرے پاس بھی اوپر آ جاتے کہ میں بھی اس ادارے کا ایک فرد تھا اور ''روشن کتابیں'' کے سلسلے کی ترتیب و تہذیب کا کام کرتا تھا۔ اپنے نذیر ہاشمی مرحوم، جن کی خوب صورت خطاطی، نفاست طبع اور حُسنِ مزاج کا میں مداح تھا، میرے ساتھ ہی نشست پر براجمان ہوتے۔ ڈاکٹر ایم ایس ناز تشریف لاتے تو ہم سب کام چھوڑ چھاڑ کر چائے منگواتے اور اُن کی باتیں سُننے میں محو ہو جاتے۔ تب وہ ملک مقبول احمد صاحب کا نام لیتے کہ میں ابھی اُن سے مل کر آ رہا ہوں۔ اور اُن کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوتے کہ میں سوچتا، کیا دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو مرحوم ناز کے دل کو بھا جائے اور وہ یوں کُھلے عام انہیں کی تعریف میں وقت صَرف کریں۔ ہاشمی صاحب چونکہ ملک صاحب کے شنا سا تھے اس لیے وہ ناز مرحوم کی باتوں پر صاد کرتے بلکہ میری معلومات میں اضافے کے لیے چند اور باتوں کا اضافہ بھی فرماتے۔

بہت سا وقت گزر گیا۔ میں بھی حالات کے تھپیڑے کھاتا کھاتا ایف سی کالج جا پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر طارق عزیز صاحب کی زبان پر یہی نام آیا۔ میں چونکا تو انہوں نے بتایا کہ ملک مقبول احمد صاحب اُن کے بہت اچھے دوست ہیں، وہ مقبول ہی نہیں، نہایت معقول بھی ہیں۔ ڈاکٹر طارق عزیز یونہی کسی کی تعریف میں وقت ضائع نہیں کرتے، بہت سوچ سمجھ کر نپی تلی بات کرتے ہیں۔ میرے دل میں ملک مقبول احمد کی قدر و منزلت کا گراف کچھ اور اونچا ہو گیا۔

''تخلیق'' کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ایک روز اظہر جاوید مرحوم نے ایک کتاب میری طرف بڑھائی۔ اس پر تبصرہ کر دیجیے، تخلیق کے آئندہ شمارے کے لیے۔ میں نے کتاب لے لی ''سیاحت نامہء ترکی''، ملک مقبول احمد صاحب کا سفر نامہ تھا جسے انہوں نے خوب ڈوب کر تحریر کیا تھا۔ عام طور پر تبصرے کے لیے کتاب کا پڑھنا ضروری نہیں

سمجھا جاتا بلکہ ہنرمند اسے سُونگھ کر ہی چند سطریں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن میں نے کتاب کے ابتدائی صفحات ہی دیکھے تھے کہ مجھ پر پوری کتاب کا مطالعہ واجب ہو گیا۔ چنانچہ میں نے کتاب پڑھی اور بیچ میں کئی مقامات کو میں نے بار بار پڑھا اور پھر محض تبصرہ نہیں ایک مضمون نا حاصل مطالعہ لکھا گیا جو ''تخلیق'' میں شائع ہوا۔ اِس کتاب کے مطالعہ کے بعد میں نے ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' خود انہی سے منگوا کر پڑھی۔ تب مجھ پر وہ ملک مقبول احمد منکشف ہوئے جو اس سے پہلے عیاں نہیں تھے۔ اُن کے سفرِ حیات کا ایک ایک لمحہ کئی زاویوں سے اَب بھی میرے دھیان میں اُبھرتا اور اِس حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ '' ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم''۔ ملک صاحب کی زندگی کے تجربات سے سیکھنے اور اُن کی روحانیت سے فیض حاصل کرنے والے بہت ہوں گے اور ہونے چاہئیں بلکہ میری طبیعت پر اُن کی شخصیت کا اثر ایک اور حوالے سے بھی ہے وہ یہ کہ آپ اتنا کچھ کرنے اور پانے کے باوجود اُن کا عجز اور انکسار جوں کا توں قائم ہے اور مجھ جیسے شخص کو گھائل کرنے کے لیے کافی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ عالم کا علم اس کے عجز میں چھپا ہوتا ہے۔ یہ قول بلیغ ملک صاحب موصوف پر صادق ٹھہرتا ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے اور اُن کی زندگی کا ہر سفر یونہی جاری رہے اور اُن کے علم و آگہی کے فیضان کا سلسلہ بھی دراز تر ہوتا رہے۔

☆☆☆

افتخار مجاز
پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور (0300-4328713)

سدا بہار پھول

یاداش بخیر! یہ کوئی اٹھائیس برس قبل کا قصہ ہے۔ میں پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر راولپنڈی (تب اسلام آباد سنٹر ابھی قائم نہیں ہوا تھا) سے تبدیل ہو کر لاہور سنٹر پر تعینات ہوا تو یہاں کی علمی ادبی فضا اور اپنے فطری مزاج کے باعث تفویض ہونے والے پروگرامز میں تنوع اور جدت لانے کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ اگست کا مہینہ آنے سے قبل ہی میں نے تحریک آزادی۔ اور پھر دسمبر سے پہلے ہی یوم ولادت حضرت قائداعظم کے لئے خصوصی پروگرامز کی تیاری شروع کر دی، میرے پروگرامز کا مرکزی استحادہ کتابیں اور وہ تاریخ تھی جو مستند تاریخی کتابوں ہی سے ملتی ہے، میری یہ ضرورت مجھے اصل علم و ادب اور اصل دانش کے ساتھ ساتھ بڑے، اہم اور تاریخ و ادب پر کتابیں شائع کرنے والے پبلشرز کے پاس لے گئی۔ اب کیا عرض کروں، ایک عجیب کیفیت اور صورتحال پیدا ہوئی۔ جدھر اور جہاں جانا ہوا، مایوسی اور عدم تعاون کے معاملات سامنے آئے۔ ایسے میں میرے برادر گرامی، دانشور شاعر، جناب اعزاز احمد آذر نے مجھے مقبول اکیڈمی کی راہ سجھائی۔ مگر میں عملاً مایوس و نامراد ہو چکا تھا۔ تاہم رب کریم کو اپنے نبی ﷺ کے صدقے مجھے عزت و تکریم دینا تھی اور میرے کریڈٹ پر پاکستان ٹیلی ویژن کے لئے اچھے یادگار خوبصورت، تاریخی اور تخلیقی پروگرامز آنا تھے۔ مقبول اکیڈمی سے میرے ایک فون پر مجھے ملک مقبول احمد کا بلاوا آ گیا۔ میں وہاں

پہنچا تو نہ صرف ملک مقبول احمد صاحب سے ملاقات کا اعزاز ملا، بلکہ وئیں جناب اے حمید سے پہلا تعارف اور ملاقات ہوئی جو بعد ازاں گہرے مراسم میں بدل گئی۔ بہر طور اس پہلی ملاقات ہی میں ملک مقبول صاحب نے شفقت و محبت اور تعاون و سر پرستی کا ای ایسا اظہار کیا، کہ میں تب سے اب تک ان کے حلقہ اثر اور حصارِ محبت میں ہوں یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جن ٹیلی ویژن پروگرامز کے لئے ملک صاحب سے کتابوں کے لئے رابطہ ہوا تھا، وہ ضرورت انہوں نے کمال محبت سے پوری کر دی اور اس مقصد کے لئے اپنے بیٹے عزیزی ڈاکٹر ارشد صاحب کو ذمہ داری تفویض کروں۔ جنہوں نے انہی کی طرح تعاون اور مطلوبہ کتب تک رسائی میں رکاوٹ نہ آنے دی۔

قبلہ ملک صاحب ایک نہایت ہی سادہ، پروقار، حقیر اور پر خلوص انسان ہیں، جن سے میری محبت وعقیدت میں اضافے کا باعث جناب انور سدید، محترم اظہر جاوید، علامہ عبدالستار عاصم اور برادرم اعزاز احمد آذر ہیں کہ ان کی محفلوں میں محبت بھرے دوستوں کا تذکرہ آتا ہے تو جناب ملک مقبول احمد کا ذکر ضرورت شامل ہوتا ہے کہ یہ اخلاص بھرے لوگ پھول کی خوبشو کو مقید کرنے کی معنی نہیں کرتے، ان سب کے نزدیک ملک مقبول احمد ایک صدا بہار معطر پھول کی طرح سے ہیں جو اہل علم و دانش کی محفولں میں اپنے تذکرے کی باتیں سے موجود ہوتے ہیں۔

اللہ انہیں صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔ آمین

رہی بات! ملک مقبول احمد صاحب کی کتابوں اور تخلیقی کام کی تو میں کیا اور میری بساط کیا، من آنم کہ من دانم......؟؟

سمندر کی گہرائی تو کوئی غواث ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو ان کی علم دوستی اور کتاب کلچر کو فروغ دینے کے حوالے سے کوششوں اور کاوشوں کا مداح ہوں۔

میری ذاتی زندگی بھی کتابوں کی محبت سے لبریز ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ آم ہوں، بہت سے ہوں اور میٹھے ہوں...... مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کہوں گا...... کتابیں ہوں، بہت سی ہوں اور اپنی ہوں...... ملک مقبول احمد میرے اس شوق اور محبت سے خوب آگاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ کتابوں کے بزنس مین ہونے کے باوجود اپنے ادارے کی شائع شدہ ہی نہیں دوسرے اداروں کی بھی قابل مطالعہ کتب مجھے بھجواتے رہتے ہیں بلکہ بالکل میرے بڑے بھائی محترم اعزاز احمد آذر کی طرح جن کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر اچھی کتاب میرے مطالعہ میں ضرور آئے۔ چنانچہ وہ ہر اچھی کتاب پڑھنے کے بعد مجھے ضرور یاد کرتے ہیں جو ان کی بے پایاں محبتوں کی دلیل ہے۔ یہیں میں مختصر سا تذکرہ ان کے مطالعہ کے رجحان اور شوق کا بھی کرنا چاہوں گا۔ ملک صاحب کتاب بینی یوں کرتے ہیں کہ خود کتاب کو بھی تسکین ہوتی ہوگی دانشور دوست ڈاکٹر اجمل نیازی کہا کرتے ہیں کہ کتاب کو بھی علم ہوتا ہے کہ اسے کون پڑھ رہا ہے۔ چنانچہ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں اچھی کتابیں ملک صاحب کے ہاتھوں اور مطالعہ میں آکر بھی خوش ہوتی ہوں گی کہ انہیں ایک کتاب دوست پڑھ رہا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ اُن کی اس کتاب دوستی اور کتاب کلچر کو پروان چڑھانے کی کوششوں کو بارآور کرے۔ آمین

............☆☆............

جمیل اطہر
روزنامہ ''جرأت'' لاہور

جناب مقبول احمد ملک

جناب مقبول احمد ملک لاہور کے ناشرین کتب میں ممتاز و منفرد مقام کے مالک ہیں۔ انہوں نے شبانہ روز محنت اور جدوجہد سے اپنے اشاعتی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کو صف اوّل کے اشاعتی و طباعتی اداروں میں لا کھڑا کیا ہے۔ اب وہ خود ایک انشا پرداز اور ادیب و مصنف کی حیثیت میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی کئی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں اور قبول عام کے مرتبہ پر سرفراز ہیں۔ میں ان کے نام اور کام سے تو ایک عرصہ سے متعارف چلا آ رہا تھا مگر ان سے میرا تعارف اور روبرو ملاقات ان کی شہرہ آفاق کتاب ''نیا علم شفا بخشی'' کے ذریعے ہوئی۔ انہوں نے اس طریق علاج سے جس استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ استفادہ کیا اس سے ان کو بارگاہ الٰہی سے مختلف امراض سے صحت کاملہ میسر آئی اور وہ اس علاج کی بدولت ایک قوی الجثہ شخص سے نہایت چاک و چوبند اور دبلے پتلے شخص بن گئے۔ حتیٰ کہ ان کے پرانے احباب کو انہیں نئے حلیے میں دیکھ کر تعجب ہونے لگا اور تفصیل جان کر وہ ان پر رشک کرنے لگے۔ وہ علم و عمل کے بحر بے کراں کے شناور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دل آویز شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ اور ان کی مجلس میں شریک ہونے والا ان سے کچھ نہ کچھ اور بعض صورتوں میں بہت کچھ سیکھ کر اٹھتا ہے۔ یہ بات میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بناء پر لکھ رہا ہوں، میں انہیں ادبی دنیا کے محسنوں میں شمار کرتا ہوں کیونکہ ان

کے تعاون اور اعانت کے بغیر بہت سے ادیبوں اور مصنفوں کی تصانیف اور شاعروں کا کلام لوگوں تک نہ پہنچ پاتا۔ اس بناء پر ہمیں ان کی زیادہ سے زیادہ تعظیم اور قدر کرنی چاہیے اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی کی دولت سے مالا مال طویل زندگی سے نوازے اور ان کا چشمہ فیض ہمیشہ جاری رہے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆

غلام نبی اعوان

پروفیسر میجر (ریٹائرڈ)

186۔نور سٹریٹ افشاں کالونی، راولپنڈی کینٹ

قابلِ صد احترام ملک صاحب!

السلام علیکم!

جب ''منشایئے'' موصول ہوئی تو تصدیق بلکہ توثیق ہوگئی کہ کمترین کا نام ''نمبو نچوڑوں'' کی فہرست میں آ گیا ہے۔شکریہ ادا کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ میرے اندر کا خبیث اچانک چھلانگ لگا کر سامنے آ گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا...... ''اوئے بھولیا جٹا کملے ہو گئے؟۔ملک مقبول کا شکریہ ادا کرنے چلے ہو؟ اوئے کبھی بھلا مانس لوگوں کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ایسے لوگ تو پیدا ہی خدمتِ خلق کے لیے ہوتے ہیں۔یار کسی ایسے شخص کا شکریہ ادا کرو جس کا نفس تمھارے کلماتِ تشکر سے پھولے نہ سمائے۔اور وہ نخوت وغرور سے روایتی جملہ کہے کہ شکریئے کی کوئی بات نہیں یہ تو میرا فرض تھا،لیکن ملک صاحب کو تم نے جب بھی توصیف وتعریف کا ٹیلیفون کیا، وہ مارے انکسار کے اور بھی ''نینویں'' ہو جاتے ہیں اور اُن کی آواز کی باڈی لینگویج بتاتی ہے کہ وہ تعریف پر شرماتے اور محجوب سے ہو جاتے ہیں۔ یار! ملک تو جماندرو نیک نفس آدمی ہے۔اُسے خدا جانے ماں نے کیسی کیسی آیات پڑھ کر دودھ پلایا ہے کہ اُن کی ناں کہنے اور کاٹا مار دینے والی صلاحیت ہی ختم ہوگئی ہے۔تمھارا نام رجسٹر پر چڑھ گیا ہے۔اب آندھی آئے یا طوفان تمہارے نام پر کاٹا نہیں پھر سکتا۔

اب جود وسخا کے چشمے جاری وساری اور رواں دواں رہیں گے۔ کاہے کو شکریئے مہربانی کے جھنجھٹ پالتے ہو۔ مزے کرو اور شکریئے کے الفاظ نئی مچھلی پھنسانے کو بچا کر رکھو"...... دور ضمیر کے ایک کونے سے ہانپتا کانپتا اور لاٹھا ٹیکتا اک باوا میرے قریب آیا اور اپنی نحیف و نزار آواز میں کھانستا ہوا گویا ہوا "اوئے! اس خبیث شیطان کی بات پر کان نہ دھرنا۔ یہ اچھے لوگوں کو زیادہ بھٹکاتا ہے۔ تمہاری رگوں میں نجیب الطرفین خون ہے۔ اعوانوں کا خالص خون اور سلطان باہوؒ کے الوہی نغمے ہی تو تمہارا فخر ہیں۔" اوئے ان چِٹّیا کم عقلا! تمہیں توفیق ہو تو جا کر ملک کی زیارت کر آؤ۔ دھوپ گرمی اور بیماری کا مت سوچو۔ یہ چراغِ زیبا لے کر ڈھونڈے جانے والے لوگ ہیں۔ ویلا مت خراب کرو۔ ملک مقبول جیسے لوگ کے بارے میں کہا گیا ہے:

مت سہل ہمیں جانو' پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

ابھی کل پرسوں تم حمید کاشمیری کا قصہ پڑھ رہے تھے اور تمہارے آنسوؤں سے کتاب کا صفحہ تر ہو گیا تھا۔ رحمت کا ایک فرشتہ اُترا اور آناً فاناً بیمار حمید کاشمیری کو مالی پریشانی سے نکال گیا۔ وہ فرشتہ کون تھا؟ او کملیا! یہی اپنا ملک مقبول تھا کہتے ہیں کہ یہ دُنیا اللہ کے نیک بندوں کے وجود سے قائم ہے۔ جس دن مقبول جیسے لوگ پیدا ہونا بند ہو گئے تو قیامتِ کبریٰ کی تمام نشانیاں مکمل ہو جائیں گی۔ اوئے بھولیا! خدا جانے کتنے بے بس اور سفید پوش ہاتھ جھولیاں اُٹھا اُٹھا کر ملک کو دُعائیں دیتے ہوں گے اور خدا جانے کتنے گھروں کے چولھے اس شخص کے دم سے روشن ہیں۔ روزِ حشر خدا جانے کس کس کونے سے اُٹھ کر مخلوقِ خدا ملک مقبول کی مغفرت اور بخشش کے لئے التجائیں کر رہی ہوں گی۔ ملک مقبول دست بستہ حاضر ہو گا۔ اُس کے ہاتھ میں "پیغمبر عالمؐ" ہو گی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی ہو

گی۔تم نے وہ کتاب بار بار پڑھی ہے اور ہمیشہ روئے ہو کہ ایسی سعادت تمہارے حصے میں کیوں نہ آئی۔کوئی زیبائی سی زیبائی ہے۔ایسا کارنامہ تو کوئی پروانۂ رسالت اور عاشقِ رسول ﷺ ہی کرسکتا ہے۔اس کو بنانے سنوارنے کے عمل میں اللہ کا یہ درویش وفورِ جزب وشوق میں خدا جانے کتنے مسجد نبوی اور روضۂ رسول ﷺ کے طواف کر بیٹھا ہوگا۔ملک مقبول احمد بازی لے گیا اور سبقت مار گیا۔غیب کے علم تو خدا جانتا ہے مگر میرا ایمان کہ اکیلی ''پیغمبر عالم ﷺ'' اُس کی شفاعت کی ضمانت کے لئے کافی ہے۔خلقِ خدا سے پیار کا عالم دیکھو کہ اُس نے تم جیسے نکھد،ان پڑھ،کم مایہ،بے توفیقے اور ننگِ اسلاف بندے کو گلے لگا کر یار بیلی بنالیا ہے۔''

باوے نے بوڑھی کھانسی کا کھنگورا مارا اور آہستہ آہستہ مڑنے لگا۔میں ابھی اُس نحیف ونزار باوے کی گفتگو کے ٹرانس میں تھا کہ وہ اک دفعہ پھر مخاطب ہوا۔''اوئے جاہلا! اس خیال سے زیادہ پھُنڈ نہ جانا کہ تم اعوان اور ملک مقبول بھی اعوان۔یہ تمہاری خود ساختہ اعوان کاری مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہے۔کوئی ایک نیکی ملک مقبول والی کر پاؤ تو تب کہیں اُس کے پاؤں میں بیٹھنے کے قابل ہو سکے گا۔''

ملک صاحب!موبائل پر تو رسید دے چکا ہوں۔تحریر رسید حاضر ہے۔شکریہ۔

☆☆☆

تنویر ظہور

''مقبول احمد، مقبول اکیڈمی اور مقبولیت''

روز نامہ جنگ لاہور میں میری ملازمت 27 برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران میں زیادہ عرصہ ادبی ایڈیشن سے منسلک رہا۔ پاکستان اور ہندوستان کے بے شمار ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے انٹرویوز کیے، ادبی خبریں شائع کیں۔ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور ناشروں سے ملاقاتیں رہیں۔ مختلف اداروں سے میری اب تک 21 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اشاعتی اداروں میں مقبول اکیڈمی بہت بڑا نام ہے۔ اس ادارے کے سربراہ محترم ملک مقبول احمد ہیں۔ میں اکثر چوک اردو بازار (سرکلر روڈ) سے گزرتا ہوں تو مقبول اکیڈمی کے بورڈ پر نظر پڑتی ہے۔ کئی بار سوچا کہ ملک مقبول احمد صاحب کے نیاز حاصل کیے جائیں۔ ایک جھجک سی رہی کہ اتنے بڑے ناشر اور اب وہ ماشاءاللہ رائٹر بھی ہو گئے ہیں۔ اُن سے کیسے ملاقات کی جائے۔ مسعود کھدر پوش ٹرسٹ (دیال سنگھ مینشن) بھی اکثر جاتا ہوں۔ اپنا موٹر سائیکل مقبول اکیڈمی کے قریب ہی کھڑا کرتا ہوں۔ اس کے باوجود کبھی شوروم میں جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

اللہ بھلا کرے محمد آصف بھلی کا کہ وہ ملک مقبول احمد صاحب سے ملاقات کا

وسیلہ بنے۔ بھلی صاحب میرے پیارے دوست ہیں میں نے مقبول اکیڈمی کی طرف سے حال ہی میں شائع ہونے والی ان کی کتاب ''میرے قائد کا نظریہ'' پر تبصرہ پڑھا تو انہیں خط لکھا کہ آپ کی مذکورہ کتاب میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ دو ہفتوں تک ان کا جواب یا کتاب نہ ملنے پر میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے کہا آپ کا خط ملنے کے بعد میں آپ کو اپنی کتاب ''میرے قائد کا نظریہ'' ارسال کر چکا ہوں۔ دوبارہ بھیجنے سے بہتر ہے کہ آپ مقبول اکیڈمی جا کر ملک مقبول احمد صاحب سے دستی لے لیں۔

ملک مقبول احمد صاحب سے ملاقات کا سبب محمد آصف بھلی ہیں۔ ملک صاحب کی تصویریں اخبارات میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں، اس لیے جب میں مقبول اکیڈمی گیا تو ملک مقبول احمد صاحب کو فوراً پہچان لیا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور محمد آصف بھلی صاحب کی کتاب کی فرمائش کی۔ انہوں نے کمال مہربانی سے نہ صرف محمد آصف بھلی کی کتاب بلکہ اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' بھی عنایت کی۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے ملازم کو چائے اور بسکٹ لانے کو کہا۔ اخبارات و جرائد میں ''سفر جاری ہے'' پر اتنے تبصرے پڑھ چکا تھا کہ مجھے یہ کتاب پڑھنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ ویسے بھی مجھے یہ نام ''سفر جاری ہے'' بہت پسند آیا۔ سوانح حیات میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ میں اپنی سوانح حیات تو نہیں لکھ سکا البتہ میں نے نامور شخصیات کی سوانح حیات ریکارڈ کیں اور روزنامہ ''جنگ'' میں قسط وار شائع کیں۔ ان میں سے بعض شخصیات کی ازاں بعد کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں۔ مگر وہ خودنوشت نہیں تھیں۔ چونکہ میں نے ریکارڈ کی تھیں ،اس لیے میرے نام سے شائع ہوئیں مثلاً ''فرزند اقبال جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال' سابق چیف جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ' سابق چیف جسٹس سجاد علی شاہ' عزیز احمد مغل اور ڈاکٹر محمد انور چوہدری شامل ہیں۔

''سفر جاری ہے'' میرے لیے ایک بہت بڑا گفٹ ہے۔ اس وقت میری عمر 65 سال ہے۔ میں اپنا جریدہ ''سانجھاں'' کے نام سے 36 برسوں سے شائع کر رہا

ہوں۔ تبصرے کے لیے کتابیں اتنی تعداد میں ملتی ہیں کہ بقول عطاء الحق قاسمی' اکثر کتابیں سونگھ کر رکھ دیتا ہوں۔ ہر کتاب پڑھنے کے لیے اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ کچھ یہی کیفیت میری ہے۔ میں اپنے رسالے میں اکثر کتابیں بغیر پڑھے تبصرہ لکھ کر چھاپ دیتا ہوں۔

ملک مقبول احمد صاحب جس محبت' اپنائیت اور خلوص سے ملے' محسوس ہی نہیں ہوا کہ اُن سے پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔

''سفر جاری ہے'' لے کر گھر پہنچا تو کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا چلا گیا۔ یقین کریں کہ طویل عرصے بعد یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔

کتاب ''سفر جاری ہے'' پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ والدین نے ان کا نام ''مقبول'' ایسے ہی نہیں رکھ دیا تھا۔ جو قبول ہو وہی مقبول ہوتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پسندیدہ اور ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ اِس لیے مقبول اکیڈمی کو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' بھی بے حد مقبول ہوئی۔

شاید ہی کوئی معروف ادیب اور دانشور ہو جس نے ''سفر جاری ہے'' پر اپنی رائے نہ لکھی ہو۔

اس طویل فہرست میں مجھ جیسے عاجز اور خاکسار کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔

کتاب پڑھ کر میں نے سوچا کہ اتنے عظیم انسان، ناشر اور لیکھک سے میری ملاقات اتنی تاخیر سے کیوں ہوئی۔ ''سفر جاری ہے'' پڑھ کے پتہ چلا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے ڈگریوں کی ضرورت نہیں۔ اگر ڈگریوں سے بڑے آدمی پیدا ہونے لگیں تو ہر شخص ڈگریاں لے کر بڑا آدمی بن جائے۔ بڑا آدمی بننے کے لیے محنت کے علاوہ اچھے اور نیک لوگوں کی مصاحبت بہت ضروری ہے۔ مدرسہ کی تربیت ہی کافی نہیں۔ اہل نظر اور اچھے لوگوں کی رہنمائی بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ملک مقبول احمد خوش قسمت ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں شریف' عظیم' نیک' محنتی اور صراط مستقیم

دکھانے والے لوگ میسر آئے۔ جس سے انہیں حوصلہ ملا۔ انہوں نے کتابیں پڑھیں اور شائع کیں۔ اس سے ان کے حوصلے بلند ہوئے۔

گو انہیں بعض ''وکھری ٹائپ کے لوگوں'' سے بھی واسطہ پڑا۔ جس کا اظہار انہوں نے کتاب میں کیا ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارے۔ مقبول صاحب کا یہ بہت بڑا ظرف ہے کہ جن لوگوں نے ان کو نقصان پہنچایا' ان کے نام شائع نہیں کیے۔

ملک مقبول احمد صاحب نے ایک اچھے اور محبت کرنے والے باپ کی حیثیت سے اپنے بچوں سے پیار کیا، ان کی تربیت کی اور اپنی منزل تک پہنچایا۔

ملک صاحب کی اولاد میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے باوجود اپنے والد محترم کے کاروبار میں شامل ہوئی اور اس کو آگے بڑھایا۔

ملک مقبول احمد صاحب اس وقت ماشاء اللہ 80 برس سے متجاوز ہو چکے ہیں، اس کے باوجود مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ دن رات کام' کام اور صرف کام۔

سچے اور حق گو انسان ہیں۔ انہوں نے ''سفر جاری ہے'' میں اپنے خیالات کو بلا جھجک پیش کیا ہے۔

ملک صاحب کو دعاؤں پر یقین ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور صرف اپنے خدا سے مانگتے مانگتے میں صغرسنی سے کبرسنی اور اب بڑھاپے میں داخل ہو گیا ہوں۔ ہر دور میں اللہ کریم میری ''بے جی'' کی اور میری دعائیں قبول کرتا اور مجھے آنے بہانے دیتا رہا۔ بلاشبہ مجھے گوناگوں صعوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن مایوسی کا ایسا وقت کبھی نہیں آیا کہ میں کتابوں کی اشاعت سے ہاتھ کھینچ لیتا''

اس موقع پر مجھے منیر نیازی کا یہ شعر یاد آیا۔

آس نئیں میری ٹٹن دیندا ایس جہان دا والی
میریاں مدداں کر دی رہندی اک مخلوق خیالی

ملک مقبول احمد صاحب کو اپنی بیگم کے ہمراہ حج اور عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ یقیناً یہ سفرِ سعادت ہے۔

کتاب میں اس مقدس سفر اور دربار نبیؐ میں حاضری کو عقیدت سے بیان کیا ہے۔

جو لوگ حوصلہ اور ہمت ہار بیٹھے ہیں "میں سمجھتا ہوں کہ وہ "سفر جاری ہے" کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ان کا حوصلہ بلند ہوگا' ہمت بڑھے گی اور وہ مایوس نہیں ہونگے۔

مایوسی تو ابلیسیت ہے۔ ابلیس کے تو معنی ہی رحمت خداوندی سے مایوسی اور ناامیدی ہے۔

جو انسان قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے وہ ان تمام سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے جو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس لیے ابلیس کو محروم و ناامید کہا گیا ہے۔

ملک مقبول احمد صاحب نے قرآن کی اس آیت پر عمل کیا "لاتقنطوا منِ رحمۃ اللہ (اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو)

یہی ملک مقبول احمد صاحب کی کتاب

"سفر جاری ہے" کا سبق ہے

ہفت روزہ "سانجھاں" لاہور

عبدالقیوم اعوان
مکان نمبر R-856 محلہ عید گاہ نزد مکی مسجد اٹک شہر

جناب ملک مقبول احمد صاحب

السلام علیکم!

امید ہے بفضل خدا آپ بخیر و عافیت ہوں گے ''شناسائی کا نسخہ اور گرانقدر اور ایمان افروز اسلامی تعلیمات کے کتابچے ارسال کرنے کا دلی شکریہ۔

آپ کی سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' نے جس طرح متعدد اہلِ قلم کو متحرک کیا ہے، اس کی مثال دنیائے ادب میں خال خال ہی ملتی ہے۔ محبت کے ناطے اہلِ قلم کو سوانح عمری نذر کرنا آپ کا ایسا عاجزانہ عمل تھا کہ جس نے بھی اس کا مطالعہ کیا، وہ اپنے تاثرات اور جذبات کی یورش سے بے تاب ہو کر اس پر اپنے خیالات کو زبان دینے پر مجبور ہو گیا۔ اور یوں آپ کی اہل قلم نے بھرپور پذیرائی کی آپ کے سادہ لیکن دلکش اسلوب اور سچائی نے اہلِ قلم کو اتنا متاثر کیا کہ جو لطف، جو انبساط اور جو بے پایاں خوشی سوانح عمری کے مطالعہ نے انہیں عطا کی، اس کا اظہار کر کے ہی وہ آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کر سکتے تھے۔

آپ کی شخصیت، کردار اور حیثیت کی خصوصیات اپنی جگہ، لیکن اگر ''سفر جاری ہے'' میں خلوص، سادگی اور سچائی کے ساتھ ساتھ تحریر میں انسانی جذبات، احساسات اور خیالات، فکر و فن کا حامل متوازن انداز، گرفت میں لینے والا خوبصورت رواں دواں اسلوب، منظر کشی کی سحر خیز رعنائی کی کشش، انسانی اقدار کی صالح لہریں تا بہ حدِ امکان موجزن ہونے سے زیادہ۔ ''ان بے نام مکروہ چہروں'' کے کالے کرتوتوں کے آپ

کے مہذب اندازِ بیان کی بجائے جواباً دلآزاری کے حامل پتھروں کی بارش ہوتی تو پھر آپ کی سوانح عمری کی کشش ضرور داغدار ہو کر ماند پڑ جاتی کہ پڑھنے والوں کو نازیبا تحریر کے حوالے سے منفی پیغام جاتا۔ کیوں کہ یہ عیب میں نے چند سوانح عمریوں میں مطالعے کئے ہیں۔

آپ نے زندگی کے مثبت اور منفی حالات اور واقعات کو متوازن بنا کر، ایسے سادہ لیکن دل کو چھو لینے والے لفظوں کے ہار پہنائے ہیں کہ اہلِ قلم پذیرائی کے لیے بے ساختہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے پر مجبور ہو گئے۔ آپ کی ذہنی راست بازی کے طفیل صحیح سمجھ بوجھ نے سوانح عمری کو ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں کی دشوار گزار راہ سے محفوظ رکھ کر، صراطِ مستقیم کا ازلی سچائی کا راستہ اپنانے کی بدولت ہی عزت کی مسند کے حقدار ٹھہرے۔

یہ اٹل حقیقت ہے کہ تمام اہلِ قلم اپنی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے باوصف، مختلف اصنافِ ادب پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اور ہر ایک کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کوئی تحریر یا کتاب اتنی محترم اور قابلِ قبول ثابت ہو کہ اسے دنیائے ادب میں ہمیشہ قابل توجہ بنائے اور زندہ رکھ سکے۔ مختصر سا ایک مزاحیہ مجموعہ ''پطرس کے مضامین'' احمد شاہ بخاری پطرس نے یادگار چھوڑا اور اردو ادب میں امر ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اردو ادب کے دربار میں آپ کی سوانح عمری نے بھی سرخرو کر دیا ہے، جو آپ کا نام اس صنف ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کے ساتھ عمرِ دراز عطا فرمائے تاکہ علم و ادب کی خدمت جاری رکھ سکیں۔ آمین!

............☆☆............

ندیم اُپل

روزنامہ ''آفتاب'' لاہور

بامقصد کتاب چھاپنا صدقہ جاریہ ہے

فروغ ادب میں جہاں ہمارے ماضی کے ادیبوں اور شاعروں نے بہت زیادہ کام کیا اور محمد طفیل نے ''نقوش'' اور احمد ندیم قاسمی نے نقوش کا اجراء کر کے ادب کی جو خدمت کی اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممتاز مفتی اشفاق احمد مرزا ادیب اور انتظار حسین جیسے لوگوں نے اپنی لازوال اور پھولوں جیسی صدابہار تحریروں سے ادب کی دنیا کو مہکایا وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

ہمارے ہاں جہاں ادیبوں نے ادب کو زندہ رکھا وہاں کچھ اشاعتی ادارے بھی ایسے ہیں۔ جنہوں نے اس کام کو عبادت سمجھ کر کیا ہے اور عوام تک ایسے کمال فن افراد کے فن پاروں اور قادر تخلیقات کو پہنچایا ہے۔ جو عام حالات میں کتب بینی کے شوقین حضرات کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔ جی ہاں ہماری مراد پاکستان کے ایک بڑے اشاعتی ادارے مقبول اکیڈمی سے ہے۔ جس کے روح رواں ملک مقبول احمد نے مذہب علم و ادب سیاست، سیاحت اور سماجی موضوعات پر ایسی ایسی نادر کتب شائع کی ہیں جو آج دنیائے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ملک مقبول احمد کئی دوسرے حریف پرنٹرز اور پبلشرز کی طرح حادثاتی طور پر اس فیلڈ میں نہیں آئے بلکہ انہوں نے عملی زندگی کے سفر کی ابتدا ہی قلم و قرطاس سے شروع کی۔

سب سے پہلے انہوں نے قوم کے مستقبل یعنی بچوں کے لیے سبق آموز کہانیوں کی مختصر ننھی مُنی کتابیں متعارف کروائیں۔ان کے اندر ادب کے مطالعہ کی ایک ایسی روح پھونکی کہ یہی مطالعہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا اور آج یہی بچے جبکہ شعور کو پہنچ چکے ہیں۔ کتب بینی کے شوق کے سبب اپنے گھروں میں بڑے بڑے کتب خانے اور ذاتی لائبریریاں بنائے بیٹھے ہیں۔ ملک مقبول احمد اپنے ادارے کے زیر اہتمام شائع ہونے والی ہر کتاب کا مسودہ بڑی احتیاط سے پڑھتے اور ایڈٹ کرتے ہیں اور ان کی اولین ترجیح یہی ہے کہ وہ ایسی تحریریں شائع کریں جن سے وطن کی مٹی کی خوشبو آئے دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقبول اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابیں ہر طرح کا مزاج اور ذوق رکھنے والے قارئین کی ذہنی طبع تفریح کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی بھی کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں بعض اشاعتی ادارے ایسے بھی ہیں جو راتوں رات امیر بننے کے لیے ادب میں معاشرتی غلاظتیں ڈال کر حرام کمائی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں مگر مقبول اکیڈمی کے روح رواں ملک مقبول احمد کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ ان کے ادارے نے اب تک مختلف موضوعات پر جو ہزاروں کتابیں شائع کیں ان سے علم کی خوشبو آتی ہے۔

☆☆☆

خرقہ پوش صحافی آئی۔ یو جرال
110 سیکٹر E/5 تھوتھال، میر پور۔ آزاد جموں کشمیر (پاکستان)

بلند نگاہ درویش ملک مقبول احمد!

ملک کے ممتاز پبلشر اور مقبول اکیڈمی کے روح رواں ملک مقبول احمد کے فن و شخصیت کے بارے میں لکھنا مجھ جیسے چالیس سالہ صحافتی تجربہ رکھنے والے طالب علم کے لیے بہت محال ہے لیکن آپ کو بتاتا چلوں کہ میں نے اپنی اس ستر سالہ عمر میں ایسے ہی لوگوں کی تلاش و جستجو میں لگن سے میں نے زندگی گزاری ہے۔ بقول فیض صاحب:

ان ہی کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

(فیض احمد فیض)

اور بقول کسے:

تنہا تنہا، جُدا جُدا، ایک ایک
آدمی وقت کے جزیرے ہوتے ہیں

اسی تناظر میں میں اپنے خود سے بھی اکثر پوچھتا ہوں کہ مجھے خود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا (Parental Muslim) اُمتی ہونے کا اعزاز حاصل تو ہے اور جو میرا فخر و اعجاز بھی لیکن میں کس زمانہ کی پیداوار ہوں؟ وہی زمانہ جس کے بارے میں فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ اُن کا مقصد اُن کا پیٹ ہو گا اور
دولت اُن کی عزت ہو گی۔عورت اُن کا قبلہ ہو گی اور روپیہ اُن کا دین
ہو گا اور وہ بدترین لوگ ہوں گے اور آخرت میں اُن کا حصہ نہیں
ہو گا۔'' (واللہ عالم)

اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ ملک مقبول احمد سے ملاقات کا وسیلہ اُن کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' سے ۲۰۰۸ء عیسوی میں ہوا اور دوسری بالمشافہ ملاقات ۸ ستمبر ۲۰۱۱ء عیسوی کو ہوئی جب میں لاہور گیا پروفیسر محمد خالد کا لاہور میں مہمان ٹھہرا۔ ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کو جستہ جستہ پڑھتا رہا۔ میں نے عادت سی بنالی ہے کہ جب میں ایک اچھی کتاب پڑھنا شروع کرتا ہوں تو میں فقراء کی اس دُعا کا ورد بھی شروع کر دیتا ہوں......

''یا اللہ! میری طبیعت میں ٹھہراؤ دے کہ
جہاں بے بس ہوں، مان لوں
ہمت دے کہ جو بس میں ہے کر ڈالوں
سمجھ دے کہ دونوں کا فرق جان لوں''

تو میں نے دیکھا، جانا اور پایا کہ ملک مقبول احمد ایک بلند نگاہ درویش صفت ادیب ہے جو نا اُمیدی اور مایوسی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا بلکہ میانہ روی، ایمانِ کامل اور توکل کی پختہ کاری کے باعث اسی عہد میں زندگی کے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے جو اُردو ادب میں بھی اپنی تمام صلاحیتوں اور سچائیوں کے باوصف کمال کے مصنف اور ادیب قرار پاتے ہیں اور جہانِ اُردو میں بھی ایک بلند مرتبہ قلمکار اور تخلیق کار نظر آتے ہیں۔ جس کی تصدیق آپ کی کتاب ''ملک مقبول احمد کے نام اہل قلم کے خطوط'' اور دوسری کتاب ''پذیرائی'' سے بخوبی ہوتی ہے۔ گویا، ہم نے جانا کہ انہوں نے ہر آن اور شان سے

نا اُمیدی اور مایوسی کا خاتمہ کر کے بلندیوں کو چھوتے رہنے کا سبق سیکھ لیا ہے۔ بقول استاد دامنؔ رحمۃ اللہ:

بندہ کرے تے کیہہ نئیں کر سکدا؟
منیا وقت وی تنگ توں تنگ آوٗندا
رانجھا تخت ہزاریوں ٹُرے تے سہی
پیراں ہیٹھ سیالاں دا جھنگ آوٗندا

دنیا اور بالخصوص پاکستان (اُستاد دامنؔ رحمۃ اللہ) میں بہت کم لوگ ہیں۔ جن کے پاس ماضی اور حال کا شعور ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے ''رانجھا'' ملک مقبول احمد کی شاہکار تخلیقات سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی اور حال کا ادراک ان میں بدرجہ اُتم موجود ہے جو انہوں نے اُردو ادب کی تاریخ کی گواہی بھی دی ہے اور اردو گردی میں تبدیلیوں کے شریک کار بھی۔ اللہ کے فضل سے ملک مقبول احمد کے پاس قوتِ ایمانی اور بصیرت و بصارت بھی ہے اور اس کے امتزاج سے اُبھرنے والی ان کی تخلیقات بھی ہیں۔ یعنی وہ اپنی تخلیقی کاوشوں کو صرف اور صرف فضل باری جانتے ہوئے اور سمجھتے ہیں۔ گویا کہ انہیں اپنی ذات کی نفی کا ادراک ہے۔ جیسے محمد بخشؒ نے فرمایا:

اُچا ناں رکھایا جس نے، چلھے دے وچ سڑیا
نیواں ہو کے لنگھ محمد، لنگھ جئیں گا اڑیا

(He who is named Uchcha (Pincer)
burns in the fire:
O my dear Mohammad! be humble
and bow, you will pass through easily.
(Prof. Saeed Ahmed Farani (Kummi)

ملک مقبول احمد کو اس حوالے سے بھی دیکھا ہے کہ آپ نے چپکے چپکے سے اپنے

دل کو ہلکا کرنے کے لیے اپنے اندر کے ادیب کی رائے لانے کے منتظر رہے ہیں اور زمانہ کی سختیوں کو برداشت کر کے زندگی نے انہیں گزارا ہے۔ ان کی سوچ اور فکر و عمل کا یہ نسخہ کیمیا کسی سے کم تر عمل ہے؟ کہ ملک مقبول احمد اپنی اولاد کو بھی ''سیدھی راہ'' پر گامزن کرنے میں کامیاب و کامران ہوئے ہیں۔

ملک مقبول احمد کی تمام مذہبی اور ادبی تخلیقات کو میں گزشتہ چار سال سے ''کھب'' کے پڑھ رہا ہوں چنانچہ محسوس کیا ہے کہ ان کی تحریروں میں بڑے بڑے لفظوں کا استعمال ہی نہیں کیا۔ جو کہ اُردو ادب میں ایک اعلیٰ روایت ہے۔ جس کا بیّن ثبوت ہمارے عالم فاضل ادیبوں اور دانشوروں کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔

جیسے کہ ہمارے اساتذہ کرام نے بھی فرمایا:

''بڑے لفظ بڑے معانی پیدا نہیں کرتے، چھوٹے لفظوں سے بھی بڑی بات کہی جا سکتی ہے۔ اصل سچائی تو اُس سوچ اور خیال کی ہے جو ان لفظوں کے پیچھے متحرک ہوتا ہے اور کچھ لکھنے یا کہنے پر مجبور کرتا ہے۔''

اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ملک مقبول احمد نے چھوٹے لفظوں کے استعمال سے لفظ فہمی کے ابلاغ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ جس سے نئی نسل کی بھی ہمّت افزائی ہوئی ہے۔

ملک مقبول احمد کی تحریروں کو assimilate کرتے ہوئے مجھے آج کنفیوشس بہت یاد آئے جنھوں نے لکھا تھا......

''میں وہ نہیں ہوں جسے پیدائشی طور پر علم عطا کیا گیا ہو، میں ماضی کے حالات پڑھنے کا شوقین ہوں اور علم کو ماضی میں دریافت کرتا ہوں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تاریخ کو ماضی پرستی قرار دیتے ہیں اور پھر یہ

دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ تاریخ خود کو ماضی کے خول میں بند کر دیتی ہے، اس لیے توجہ حال اور حال میں سے مستقبل کو تلاش کرنے پر مرکوز کرنا چاہیے لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ ماضی کی غلطیوں سے بچنا بھی تو ضروری ہوتا ہے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ماضی کا بغور مطالعہ نہ کیا جائے۔ یہی وہ نکتہ ہے۔ جس کی بنیاد پر تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے مطالعہ کے دوران کوئی ''عینک'' استعمال کر لی جائے تو پھر...... تاریخ کا تجزیہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی تاریخ کے سبق کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ تاریخ اسی صورت میں فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ جب اس کا غیر جانبداری اور کھلے ذہن کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد لکھا جائے۔)

- تاریخ کو جاننا اور سمجھنا آسان بھی نہیں کیونکہ ہر علم ہر آدمی کے لیے نہیں ہوتا...... تاریخ میں جھانکنے کی وہی کوشش کریں گے جنہیں تاریخ سے دلچسپی ہو گی یا پھر وہ کسی حوالے سے کوئی نئی تاریخ رقم کرنے کی خواہش رکھتے ہوں گے یا پھر ماضی سے حال اور پھر حال سے مستقبل کی طرف سفر کرنا چاہتے ہوں گے۔

کوئی بھی سوچ، کوئی بھی نظریہ اُس وقت تک ''عوام'' کا حصہ نہیں بنتا جب تک اس میں عام آدمی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی شامل نہ ہو بلکہ جب تک وہ اس کو جاری معاشرتی و معاشی جبر سے رہائی کی نشاندہی نہ کرے اور ''سٹیٹس'' کو توڑنے کے امکانات نہ کرے۔ اس لیے ہمیں بھی ان ساری باتوں کو ذہن میں رکھ کر اپنا تجزیہ و احتساب کرنا چاہیے اور دیکھنا، جاننا اور سمجھنا چاہیے کہ معاملات کے بارے میں ہمارا رویہ کیا

ہے؟ کیا ہمارے معاملات عام آدمی کے جذبات واحساسات سے ہم آہنگ ہیں۔؟ اور اگر نہیں ہیں تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیۓ؟؟ کچھ تو کرنا پڑے گا ورنہ! یہ اُکتاہٹ، یہ بے زاری، یہ بیگانگی، یہ بے حسی میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے اور اب یہ حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔ کوئی تو ہمارا سیاسی و تاریخی ریکارڈ مسلمہ قلم بند کرے گا۔

میرے نزدیک ملک مقبول احمد نے ماضی کی تاریخ کو حال کی ''عینک'' سے دیکھا ہے اور اپنے مستقبل کی منزل کو پالینے کا تعین کیا ہے۔ اس کا ادراک مجھے کچھ یوں ہوا کہ جب میں نے بلّہ عارفہ کے کلام جس کا منظوم ترجمہ غلام رسول طاؤس پانہانی نے کیا۔ للہ عارفہ فرماتی ہیں......

کیا اٹکل سے اندھے کی مانند ٹٹولتے پھرتے ہو
دانا ہو تو سیدھے اپنے اندر داخل ہو جاؤ
دل ہی تو اللہ کا گھر ہے دل سے وہ کہاں جائیگا
میں نے دل کی بات کہی ہے تم سے، اس کو سچ مانو

دراصل ملک مقبول احمد نے ماضی کی ''عینک'' سے حال کے آئینہ میں ہم عصروں کو یہ بتانے کی ایک کوشش سی کی ہے۔ یعنی وہ حقیقت کی راہ پر چل کر حقیقت جان گئے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو ایک جرمن فلسفی رل کے (Rilke) نے ان لفظوں میں ادا کیا تھا......

''انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اُس کے سامنے موجود نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اُوپر تن سکتا ہے۔''

ہم نے ان کی تحریروں سے بطور خاص یہ اخذ کیا کہ ملک مقبول احمد ریا کی بات کبھی نہیں کرتے۔ ان کی تازہ ترین خاکہ نگاری کی کتاب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں دیکھا،

پڑھا اور سمجھنے کی کوشش میں جو ہم ''غرق دریا'' ہوئے تو جانا کہ انہوں نے خاکہ نگاری کی صنف کے میدان کو بھی فتح کرنے میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔ یعنی ہمارے اپنے پبلشر پلس ادیب درویش نے خاکہ نگاری کے صنف میں بھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے آگے نظر آتے ہیں اور پھر جب ہم ملک مقبول احمد کی کتاب ''پذیرائی'' کی مطالعاتی زیارت کرتے ہیں تو سعید بدر کا یہ حوالہ کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:

''یعنی اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ خزانہ جو تمہارے اندر موجود ہے، اُسے باہر لائیے! خواہ وہ گیت ہے یا نغمہ، کوئی نالہ دردناک ہے، یا کوئی آہِ سوزناک، یا فغاں دلدوز ہے یا آفتاب اقبال کا خبرناک ہے۔ یعنی جو کچھ بھی ہے اُسے ورطۂ تحریر میں لائیے اور اپنے اہل وطن اور اہل عالم کو پیش کر دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک مقبول احمد کی جانب سے شائع کردہ سرگزشت زندگی کی اشاعت کا علم ہوا تو بے حد خوشی ہوئی۔''

اس پر مستہزاد وطن پاک کے تمام اہل فکر ونظر اور عالم و فاضل دانشوروں نے ان کی خاکہ نگاری کے آسان مگر سادہ اسلوب کو بے حد سراہا ہے۔ یعنی ان کے مقبول اور ہر دلعزیز ہونے کے راز کو ظاہر کر دیا ہے۔ یعنی مُجھ سے اچھا ملک مقبول احمد یہ لکھنے والے اور مجھ سے اچھا آپ (ملک) کو سمجھنے والوں سے وفاؤں کو حیا ملے گی اور وقت کی حقیقی لہروں پر چلتے چلتے کئی اور قلم اُٹھیں گے اور کئی اور لفظوں کے موتی بکھیریں گے ملک مقبول احمد جی!

بقول زہری کنجاہی:

''الفاظ بھی مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں جب الفاظ کے ذریعے حقیقت بیان کی جائے تو وہ الفاظ بھی جاوید ہو جاتے ہیں مگر جھوٹ

اورلغویات کو بیان کرنے والے الفاظ کہاں زندہ رہتے ہیں۔ الفاظ کی حُرمت ایسے ہی ہے جیسے کسی صاحب وقار کی عزت وقدر اس کو جاننے والے اور سمجھنے والے کے دل میں ہو۔ الفاظ زندگی سے مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں کیونکہ زندگی کا تانہ الفاظ بنتے ہیں۔ اگر کوئی لفظ اپنا وجود چھوڑ دے تو پھر زندگی کا تانہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہ الفاظ ہمیشہ سچائی پر رہتے ہیں اور یہ مرنے کے بعد بھی اس شخص کی گواہی دیتے ہیں مگر جن کے الفاظ زندگی سے ربط نہیں رکھتے۔ پھر وہ زندہ بھی نہیں رہتے کیونکہ الفاظ کی اہمیت قلم سے ہے اور قلم اگر مضبوط ہاتھ میں ہو تو پھر اس کے لفظوں کی طاقت بھی ہوتی ہے اور مضبوطی صرف اور صرف سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔"

ملک مقبول احمد کے فن وشخصیت کے بارے میں ہمیں نے کیا حق سچ کی گواہی دی ہے۔ میاں محمد بخشؒ نے بہت پہلے فرمایا تھا:

درد منداں دے سخن محمد دیہن گواہی حالوں
جس پلے پھل بدھے ہوون آوے باس رومالوں

Translation

(The Words of compassionate people
stand witness to their Personality.
The handkerchief filled with flowers
exccist fragrance.
(Prof. Saeed Ahmed Farani)

اور آخر میں

وارثؔ شاہ جدوں رب دی مہر ہوندی

حکم ہوندا اے نیک ستاریاں نوں

Translation

(Waris Shah, when Allah is
kindly disposed, stars
are also ordained accordingly

(Prof. Saeed Ahmed Farani)

☆☆☆

سفرِ آرزو پر ایک نظر

ملک مقبول احمد کا شمار ملک کے معروف ناشروں میں تو پہلے ہی ہوتا تھا۔ جب انہوں نے اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کے عنوان سے تحریر کی تو ادباء کی صف میں بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' اتنی پذیرائی، مقبولیت اور حوصلہ افزائی ہوئی کہ پروفیسر جمیل آذر نے اس سے متاثر ہو کر ایک ضخیم کتاب ''راہ نوردِ شوق'' کے عنوان سے تحریر کر دی۔ پروفیسر جمیل آذر کو اس آپ بیتی میں اپنا گاؤں، اپنے بچپن کے واقعات اور بچپن میں ساتھ کھیلنے والے اپنے دوست دکھائی دیتے تو اُن کا رہوار قلم تیزی سے صفحۂ قرطاس کے سینے پر دوڑنے لگا اور راہ نوردِ شوق عالم وجود میں آئی۔ جمیل آذر کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے بہت سے معروف ادباء نے اس پر مضامین تحریر کیے۔ اس طرح ''پذیرائی'' اور ''شناسائی'' کے عنوان سے دو کتابیں منصۂ شہود پر نمودار ہوئیں۔ جس سے ملک مقبول احمد کا حوصلہ بلند ہوا اور انہوں نے اپنے جسم کی تمام توانائیاں تصنیف پر صرف کرنا شروع کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے متعدد کتب تصنیف و تالیف کر ڈالیں۔ اس طرح ملک مقبول احمد ایک مقبول مصنف بن کر اردو ادب کے افق پر ابھرے۔ جب سے انہوں نے اپنے جسم پر ادبی چولا پہنا ہے بحیثیت مصنف ان کی شہرت ملک اور ملک سے باہر پھیل گئی ہے۔ آج کل ان کی تحریر کردہ کتاب ''سفرِ آرزو'' میرے مطالعہ کی زینت بنی ہوئی ہے۔ یہ غالباً ان کی سولہویں یا سترہویں کتاب ہے۔ اتنے قلیل عرصے میں اتنی زیادہ کتابیں تحریر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر ملک صاحب کی لگن اور محنت نے مشکل کام کو آسان بنا دیا ہے۔

یہ کتاب بھی انہوں نے دوستوں کے تقاضے پر تحریر کی ہے۔ یہ ان کا دوسرا سفرنامہ

ہے اس سے پہلے ''سیاحت نامہ ترکی'' تحریر کر چکے ہیں۔ جسے اہل قلم حضرات نے پسندیدہ نظروں سے دیکھا ہے۔ ''سفرِ آرزو'' دوسرے حج کے سفرناموں سے اس لیے مختلف اور ممتاز ہے کہ اس کتاب میں ملک صاحب نے ان شہران بے مثال اور جلال و جمال کی تفصیل با کمال روداد تحریر کی ہے۔ انہوں نے ''سفرِ آرزو'' میں مختلف مقامات پر تاریخی پس منظر بیان کر کے ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، اس طرح فریضہ حج ادا کرنے والے نئے حاجیوں کو قدم قدم پر رہنمائی کی ہے جس سے حج کے دوران پیش آنے والی مشکلات آسانی میں بدل جاتی ہیں۔ ملک مقبول احمد پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''میں حج کو ایک روحانی سفر تعبیر کرتا ہوں۔ اس انوکھے سفر کو میں نے تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور روحانی طور پر طے کیا ہے اور اسی پس منظر میں سپرد قلم کیا ہے۔''

ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی آسان، سلیس اور رواں زبان میں تحریر کی ہے۔ ان کے انداز بیان میں قاری اس درجہ کھو جاتا ہے کہ کتاب ختم ہونے کی اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ ''سفرِ آرزو'' میں بھی انہوں نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ انہوں نے دو حج اپنی اہلیہ کے ساتھ ادا کیے اور تیسرے حج کے موقع پر ان کی بیوی گھٹنوں کی شدید تکلیف کی وجہ سے نہ جا سکیں اور ملک صاحب کو اکیلے ہی فریضہ حج ادا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں انہوں نے متعدد عمرے بھی کیے ہیں۔ ملک صاحب جدہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جدہ سے مکہ مکرمہ تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہماری بس دوپہر کے اڑھائی بجے مکہ مکرمہ کی حدود میں داخل ہو گئی اور چکر کاٹتی ہوئی مکتب نمبر ۱۳ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔''

ملک صاحب نے جب بیت اللہ کا دیدار کیا تو ان پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے ان کی زبانی سنیے:

''بیت اللہ کے جلال و جمال کو اپنی آنکھوں، اپنے دل اور اپنی روح میں اترتے

محسوس کیا۔ بیت اللہ حرم شریف کے وسط میں پروقار خاموش جلال و جمال کے ساتھ سیاہ طلسمی غلاف اوڑھے اپنے مقفل طلائی دروازہ حجر اسود کے نور اور حطیم کو اپنی آغوش میں لیے نقطہ پرکار حق بنا ایستادہ ہے۔ بیت اللہ اور مسجد الحرام کا فرق واضح ہے۔ تمام نمازی بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں یوں یہاں صفیں دائرے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور یہ خوبصورت صفیں اپنے اندر حسن رکھتی ہیں۔''

ملک صاحب نے ''سفرِ آرزو'' میں بعض مقامات کو اتنی تفصیل اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ جو لوگ حج کی سعادت سے محروم ہیں انہیں یہ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود ان مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ جو لوگ صفا اور مروہ کے بارے میں پڑھتے ہیں تو صفا اور مروہ کی اصل حقیقت ان کے سامنے کھل کر آ جاتی ہے۔ ملک صاحب نے اس مقام کو بھی بیان کیا ہے جس تھوڑے سے حصے کو حاجی صاحبان تیز رفتاری سے طے کرتے ہیں۔

اس کتاب ''سفرِ آرزو'' میں مدینے کی گلیاں اور محلے کے نام سے ایک باب عنوان درج ہے۔ ملک صاحب ایک سیلانی شخص ہیں چنانچہ ان کے دل میں مدینے کی پرانی گلیاں اور محلے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو مدینے کی پرانی گلیوں اور محلوں نے انہیں اپنی طرف کھینچا تو وہ وہاں پہنچ گئے۔ مدینے کی پرانی گلیوں اور محلوں کے بارے میں ان کی زبانی سینے:

''مدینے کی پرانی گلیاں بالکل ہمارے لاہور کی لوہاری گیٹ کے اندر کی گلیوں کی طرح تنگ تھیں۔ چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی کہیں ایک منزلہ اور کہیں دو منزلہ عمارتیں تھیں۔ جو اپنی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ یہاں جگہ جگہ بلیوں کا دیدار ہو جاتا لیکن مجھے کہیں بھی کوئی کتا وغیرہ نظر نہیں آیا۔''

ملک صاحب نے جنت البقیع کی زیارت کی تو انہوں نے ''سفرِ آرزو'' میں جنت البقیع کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"جنت البقیع مسجد نبوی ﷺ کے باہر بائیں جانب مدینہ منورہ کے قبرستان کو کہتے ہیں۔ جنت البقیع میں مشرقی دیوار کے قریب دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ لیکن اس پر کوئی تختی نصب نہیں ہے۔ اسی قبرستان میں سیدنا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اوران کے نزدیک ابوسعد بن معاذ رضی اللہ عنہ دفن ہیں۔ جنوب کی جانب حضرت محمد ﷺ کی رضائی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی قبر مبارک ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر رحمت العالمین ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک ہے۔ تھوڑا آگے مغرب کی جانب حضرت نافع قاری مدینہ اوران کے شاگرد حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہم کی قبریں ہیں۔ شمال کی جانب حضرت محمد ﷺ کی صاحبزادیاں حضرت زینب، حضرت ام کلثوم اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا آسودہ خاک ہیں۔ ان کے قریب ہی امہات المومنین یعنی ازواج مطہرات حضرت ام سلمہ، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا آسودہ خاک ہیں۔"

شمال کی جانب حضرت محمد ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبر مبارک ہے اور ان کے ساتھ ہی حضرت امام حسن، حضرت زین العابدین، حضرت امام باقر، حضرت امام جعفر صادق، رحمت عالم ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہم کے مزارات اطہر ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس قبرستان میں دس ہزار صحابہ اکرام رضوان اللہ اجمعین مدفون ہیں۔

میں نے یہ تمام معلومات ملک صاحب کے "سفرِ آرزو" سے حاصل کی ہیں۔ ملک صاحب نے اتنی تفصیل سے اس قبرستان پر روشنی ڈالی ہے کہ ایک عام قاری کو بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ملک صاحب کے ساتھ ان مزارات اور قبور کی زیارت کر رہا ہو۔

افتخار مجاز

515/E نظام بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

محترمی ومکرمی

تسلیمات!

اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کے صدقے آپ کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔ آمین

حضور اکرم ﷺ کے بارے میں آپ کی تصنیف پر تبصرہ نظر نواز ہوا۔ آخر میں رقم تھا کہ یہ کتاب بلا معاوضہ تقسیم کی جا رہی ہے اور یہی جملہ میرے لیے وجہ حیرت بنا کہ آخر یہ کیونکر ممکن ہوا کہ ایک بہت بڑے کاروباری ادارے کے سربراہ، کسی کتاب کی مفت تقسیم کی طرف آ نکلے؟ میری دانست میں تو یہ حبِ نبی ﷺ اور تعلیمات نبوی کا ہی اعجاز ہے، بہرطور میں آپ کی رائے جاننے کا خواہشمند ہوں۔

پانچ سات روز پہلے خطوط پر مشتمل آپ کی ایک کتاب کی اشاعت کی خبر بھی پڑھی تھی اور اس سے پہلے بھی آپ کی کتاب کا تذکرہ بہت سننے میں رہا، پھر جناب اظہر جاوید، جناب انور سدید، جناب اے حمید سے باتیں ہوئیں تو آپ کا تذکرہ اور محبتوں بھری شخصیت ضرور زیر بحث آ جاتی ہے کہ یہ اور ہمارے دیگر احباب سبھی آپ کی محبتوں کے حصار میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت کے ساتھ سلامت رکھے۔ آمین

برسوں پہلے ٹیلی ویژن (تب صرف پی ٹی وی ہی ہوا کرتا تھا) کے لئے کتابوں کے بارے میں ایک پروگرام کے ضمن میں آپ کے نیاز حاصل ہوئے تھے۔ تب آپ نے محترم ڈاکٹر ارشد صاحب سے بھی ملوایا تھا۔ بہرطور شومئی قسمت کہ اسی شہر لاہور کا مکین ہونے کے باوجود دوبارہ آپ تک رسائی حاصل نہیں کر سکا، لیکن آپ سے ملاقات کی

خواہش و آرزو ہے۔

اِن دنوں حسن اتفاق کیلئے کہ پھر ''کتاب'' کے نام ہی سے ایک ہفتہ وار پروگرام پی ٹی وی سے کر رہا ہوں! ممکن ہو تو نیاز ضرور بخشیں، آپ کی محبت، شفقت اور پیار کے لئے حاضری کا خواہشمند ہوں۔

بہت احترام کے ساتھ

نیاز کیش

افتخار مجاز

اور ہاں! وہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں اپنی کتاب ضرور بھجوایئے گا۔

امین راحت چغتائی

258، سٹریٹ 01، علامہ اقبال ایونیو
گلریز ڈاک خانہ، چکلالہ ائیر فیلڈ، راولپنڈی۔46000
30دسمبر 2009

مخدومی ملک مقبول احمد

سلام مسنون!

مغلوں کے مرشد شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاریؒ پر ہرات (396ھ تا 481ھ) نے صد میدان کے چھیاسیویں میدان میں ''انبساط'' کا باب باندھا ہے اور فرماتے ہیں کہ انبساط سے مراد حضوری سے مطلع ہونا اور آرزوئے دیدار ہے۔ پھر طالبان دیدار بھی تین قسم کے لوگ بیان فرماتے ہیں۔ اوّل وہ لوگ جو حضور ﷺ کی اس دعا کے مطابق کہ ''اے اللہ! میں تیرے رخ کی جانب لذتِ نگاہ کا طلب گار رہوں۔'' دعا کرتے ہیں، لیکن اِس زمرے میں بھی داخل ہونے کی کچھ شرائط ہیں یعنی (الف) مقامِ دیدار کی طرف رجوع (ب) خود کو (عجز و انکسار کے تحت) دیدار کے قابل نہ سمجھنا اور (ج) اتباعِ رسول ﷺ۔
دوم: وہ لوگ جو غافل ہیں مگر دیدارِ الٰہی کے آرزومند۔ وہ ایک عادت کے تحت ذاتِ باری کے متلاشی ہیں۔ سوم: وہ لوگ جنہیں قلبی انبساط میسر اور اُن کا نفس فانی ہو چکا ہے۔ دل میں آتشِ عشق فروزاں ہے اور جن کی روح آرزو کے ساتھ یک جان ہے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ فی الحقیقت دیدار کے اہل یہی لوگ ہیں۔

اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے ''قرآن پڑھنا سیکھئے'' مرتبہ مصباح الحق، ''القرآن'' علامہ احمد دیدات کی کتاب کا ترجمہ، ناشر مقبول اکیڈمی لاہور، ''پیغمبر عالم ﷺ'' مرتبہ ملک مقبول احمد اور ''اربعین'' شاہ ولی اللہؒ، ناشر مقبول اکیڈمی لاہور، ایسی دیدہ زیب اور

ہدایت پہنچانے والی قیمتی کتابیں بھیجنے والا شخص بلاشبہ قلبی انبساط پا چکا ہے۔ اُس کا نفس فانی نہ ہو چکا ہوتا تو وہ ایسی کتابوں کی اشاعت پر زرِ کثیر کیوں خرچ کرتا اور اس صحت اور وقت نظر کے ساتھ سیرت پر ایسی عمدہ جامع و مختصر کتاب کیسے لکھتا!

ملک صاحب! میں آج آپ کو زندگی میں پہلا باقاعدہ خط لکھ رہا ہوں۔ صورت آشنا اب بھی نہیں ہوں۔ ہاں تصویر آشنا ہوں۔ ارشاد کی تعمیل میں تاخیر یوں بھی ہوئی کہ پچھلے دنوں میری دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا اور کچھ عرصے کے لیے لکھنا پڑھنا احتیاط کے طور پر موقوف ہو گیا۔ الحمدللہ، بینائی بحال ہو گئی۔ اس کے بعد کچھ وقت معطل شدہ مصروفیات کی بحالی کی نذر ہو گیا۔ اب فرصت یک نفس ملی تو آپ سے مخاطب ہوں۔ مگر بات کیا کروں۔ آپ تو میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہے۔ میرے شیخ تو کہتے ہیں کہ مذکورہ شرائط کے مطابق ایسا شخص ''مقامِ انبساط'' پر فائز ہوتا ہے۔ اُس کا نفس فانی ہو چکا ہوتا ہے اور آپ ہیں کہ دنیا میں بھی ہیں اور دنیا کے طلب گار بھی نہیں ہیں۔ مگر اپنے حوالے سے ادیبوں سے خط بھی لکھوا رہے ہیں۔ اُن کی تحریریں اور تصویریں چھاپ کر اُن کی تحلیل نفسی بھی کیے جا رہے ہیں۔ چپکے چپکے اُن کی اعانت غیر مجرمانہ کے مرتکب بھی ہو رہے ہیں۔ بیچ میں اپنی بھلمنساہٹ کا ثبوت دینے کے لیے اپنی سفید ریش والی تصویر بھی جڑ دیتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پہلی بار بوڑھے ہوئے ہیں۔

معاً خیال آیا کہ امین راحت چغتائی بھی تو اُسی جشن انبوہ میں شامل ہو رہا ہے۔ یعنی ''اِک دسترس سے تیری حالیؔ بچا ہوا تھا'' ...... لیکن وہ بھی کہاں بچا۔ ''مدلل مداحؔ'' اور ''بھلا مانس غزل گو'' کے طغرے سینے پر سجائے سو رہا ہے۔

آیئے ہم سب حضور ﷺ کی اس دعا کے اتباع میں ہاتھ اٹھائیں کہ ......

''اے اللہ! میں تیرے رخ کی جانب لذتِ نگاہ کا طلب گار ہوں۔'' والسلام

پروفیسر جمیل آذر

مکرمی و محترمی برادرم ملک مقبول احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

آپ کو ''سفرِ آرزو'' کی تصنیف واشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔آپ نے اسے خونِ جگر اور بے حد عقیدت وخلوص کے ساتھ رقم کیا ہے اس میں آپ نے عمرہ وحج کے نہ صرف تمام مناسک کو ترتیب وار پیش کیا ہے بلکہ ان تمام مناسک اور مقدس مقامات کا نہایت دلنشیں انداز میں پیش منظر بھی رقم کر کے عام قارئین کی دلچسپی اور گرانقدر معلومات کا سامان مہیا کر دیا ہے۔

اب چند گزارشات ہیں۔سعی کے موقع پر جو صفا و مروہ کے درمیان کی جاتی ہے سے اس کی مختصر سی دعا کو عربی میں ضرور لکھیے جو یہ ہے:۔

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّکَ انتَ الا عزّو الاکرَمُ

عربی کے الفاظ کا اپنا لطف و تقدس ہے بیشک ان الفاظ سے نورانی لہریں نکلتی ہیں جو روح میں اُترتی ہیں۔

مواجہہ شریف کے سامنے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام پیش کرتے ہیں اسی جگہ حضرات شیخینؓ وسلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔آپ سے التماس ہے کہ وہاں بھی پورا

سلام پیش کریں۔

میرے برادرِ نسبتی نیاز محمد خاں نے اس کتاب کو پڑھ کر بڑا عمدہ تبصرہ کیا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے کہ ایک مرتبہ شروع کر دیں تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اسی طرح میری بیگم (مرحومہ) کی بہن نے اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ میں تو خود پڑھتا گیا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے خطبہ حجتہ الوداع کے آخری الفاظ نے تو مجھے ایسے ہی آبدیدہ کر دیا جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ رو پڑے تھے۔

مجھے یقین کامل ہے آپ کی یہ سعی مشکور بارگاہ الٰہی میں ضرور قبول ہوگی اور آپ کے لیے توشہ آخرت ثابت ہوگی۔ آپ نے یقیناً متعدد کتابیں شائع کیں ہیں لیکن یہ کتاب یقیناً بے مثل ہے ڈسٹ کور خوبصورت ہے۔ پہلی ہی نظر میں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ تاہم اگر سامنے سے ہاتھ ہٹا دیئے جائیں تو میری دانست میں زیادہ جاذبِ نظر ہوتا۔ آپ نے اس کتاب کی بہت کم قیمت رکھی ہے آج کل بڑے اخراجات آتے ہیں۔ اللہ آپ کے رزق میں برکت کرے اور آپ کو سدا صحت مند اور خوش وخرم رکھے یہ عاجز بندہ تو آپ کے لیے ہر نماز کے بعد دل سے دعا کرتا رہتا ہے ابھی ابھی صبح کی نماز پڑھ کر آیا ہوں نہ جانے کیوں قلم برداشتہ یہ چند سطور لکھنے بیٹھا گیا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کس طرح میری روح میں بس گئے ہیں۔ اللہ سدا آپ کو اپنی عافیت میں رکھے۔

آپ کا مخلص دعا گو،
جمیل آذر

سعید بدر

۲۸ مارچ ۲۰۱۱ء

عزت مآب فضیلت درجات محترم ملک مقبول احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر دلی رنج پہنچا۔ اپنی آنکھوں کے اضطراب اور آپریشن کے باوجود، جی چاہا کہ عیادت کے لیے پہنچوں۔ یہ صرف چاہنے یا ارادے کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اسلامی اور اخلاقی فریضہ بھی تھا کیونکہ حضور پُرنور رسالت مآب نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''بیمار کی عیادت ضرور کرو۔'' لیکن کنوینس کا بندوبست نہ ہوسکا۔ اب اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ آپ کی صحت یابی اور شفائے کاملہ و عاملہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا رہوں۔ حضور نبی اکرم و محتشم کا ارشاد عالیہ ہے کہ ''بیماری گناہوں کے کفارے کا سبب بن جاتی ہے۔''

ایک دفعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبۂ جمعہ میں ارشاد فرمایا کہ:

''جس پر ایک سال بیماری یا آزمائش نہ آئے تو وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فراموش کردیا ہے۔''

ایسی اور بھی متعدد حدیثیں موجود ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی لغزشوں کو معاف کرنے کے کیا سامان کر رکھے ہیں۔ اس کا کوئی فعل حکمت و دانش سے خالی نہیں، اس کی رحمت وسیع و بے پایاں ہے۔ وہ حسن و جمال اور جاہ و جلال کا پیکر ہے۔ ہم سب اُسی کی رحمت کے اُمیدوار ہیں۔ وہ رحمت

فرمادے تو بیڑا پار ہے۔ ہم ہی کمزور بندے ہیں کہ اس کی بے شمار نعمتوں اور رحمتوں کی قدر نہیں کرتے۔ چند لمحے ہوا نہ ملے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ چند گھنٹے پانی میسر نہ آئے تو بولو رام ہو جائے غرضیکہ کیا کیا شمار کیا جائے اس کے احسانات وانعامات کی فہرست طویل اور لامتناہی ہے۔

آپ نیک اور پاکباز انسان ہیں۔ ہمیشہ منکسر المزاج رہ کر زندگی بسر کی۔ حتی الوسع کسی کا دل نہیں دکھایا۔ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

یعنی دل کو ہاتھ میں لیں، کسی کا دل نہ دکھائیں۔ کیونکہ ہزاروں کعبوں سے ''ایک دل'' کہیں بہتر ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے کسی کا دل دُکھایا اس نے کعبہ گرا دیا یا کم از کم اس کی دیوار ڈھادی۔

آخر میں ایک بار پھر دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد صحت عطا فرمائے اور آپ اپنے مشاغل میں مصروف ہوں۔ آپ بہت باہمت انسان ہیں کہ دوستوں اور احباب کا خیال رکھتے ہیں۔ یہی اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ یہ خط ایک آنکھ بند کر کے لکھا ہے۔

☆☆☆

غلام نبی اعوان

پروفیسر میجر (ریٹائرڈ)

186 نور سٹریٹ افشاں کالونی، راولپنڈی کینٹ

محترم ملک صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کی محبت کی غماض کتابیں کیا ملیں گویا دبستاں کُھل گیا۔ انسان زندگی بھر اپنی آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا بوجھ کندھے پر لادے پھرتا ہے۔ عمر کے مختلف حصوں میں درج بالا جذبوں کی نوعیت گرچہ تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن ان خواہشوں کی تکمیل کا بوجھ کبھی کم نہیں ہوا اس دفعہ آپ کی عنایات کو موصول کرنے پر ذہنی کیفیت کا موڈ کچھ اور طرح سے تھا۔ مجھے ہسپتال میں مختلف مشینوں کی جانچ پڑتال سے گزارا گیا۔ تو طبیعت پر نقاہت سی طاری تھی۔ وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی۔ گھر واپس پہنچا تو جہاں ایک طرف زندگی کے گھنے اور ڈھلتے سایوں کا احساس تھا تو وہیں آپ کے بھیجے ہوئے بنڈل کو منتظر پا کر اک اُداس سی خوشی بھی چہرے پر عود کر آئی۔ جیسے میں نے اُوپر عرض کیا کہ بعض خواہشات کی تکمیل کے لئے انسان ساری عمر آرزوئیں پالتا ہے اور عملیت پسند اس تکمیل کی خاطر تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔ میں بڑا قانع شخص ہوں۔ بچپن میں اک سائیکل کی آرزو رہی۔ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اپنے اردگرد کتابیں دیکھنے کا خواہش مند رہا۔ اپنا ایک کمرہ ایک چارپائی۔ لکھنے کی ایک میز اور اردگرد بکھری ہوئی کتابیں۔ پینتالیس سال یہ آرزو خواب بن

کر میرے نہاں خانۂ دل میں پھیکے پھیکے سے رنگ بکھیرتی رہی۔ گزشتہ تین چار سالوں میں
اس آرزو کی کوئی شکل وصورت نکلنا شروع ہوئی۔ میری اس درینہ خواہش کی تکمیل کا پہلا پتھر
ملک مقبول صاحب نے اپنی محبتوں اور عنایتوں سے رکھا اور اس بابرکت آغاز کی ''بونی''
سے میں جل تھل ہو گیا اور ایسے ایسے دوستوں نے کتابیں بھیجنا شروع کیں۔ جن سے تیس
چالیس سال سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ زندگی کے ان زوال پذیر لمحوں میں یہ خواہش اس طرح
پوری ہوئی کہ مقبول اکیڈمی میرے بستر پر پھیلی ہوئی ہے۔ سرہانے کے ساتھ دینی لٹریچر ہوتا
ہے۔ اور اس پوری اکیڈمی میں سے جب جی چاہتا ہے۔ کوئی سے من پسند کتاب اُٹھا کر علم و
ادب کے گلستانوں میں جا نکلتا ہوں۔ اگر ملک مقبول نہ ہوتے تو بستر پر بکھری کتابوں کے
درمیان سونے جاگنے کی بچگانہ سی خواہش کبھی پوری نہ ہو سکتی۔ ملک صاحب! آپ مجھ جیسے
فقیر سے دوستی کر کے دانستہ گھاٹے کے سودے کر رہے ہیں۔ دُعا کہ مولا پاک اُخروی زندگی
میں آپ کو دُگنے منافع سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

اس دفعہ عنایات میں تھوڑی سی تشنگی رہی۔ آپ کے دستخط اس دفعہ کسی کتاب پر
نہیں تھے۔ یہ دستخط میری آرزو کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ ''شناسائی'' میں آخر تک فقیر کا کہیں
نام نظر نہیں آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ شاید ابھی تک میری نیازمندی کے رنگ کچے ہیں اور
دربارِ مقبول میں رسائی کے لئے دیر لگے گی۔

بہت بہت شکریہ ملک صاحب!

☆☆☆

غلام نبی اعوان

محترم ملک صاحب!

السلام علیکم اور تسلیمات!

میں اک دفعہ پھر حاضر ہو گیا ہوں۔ اگر آغاز میں آپ نے بے نیازی اور بے رُخی دکھائی ہوتی۔ مجھے اتنی عزت و توقیر نہ بخشی ہوتی اور اک لاڈلے بچے کی سی میری فرمائشیں پوری نہ کی ہوتیں تو آج آپ کو میرا خط پڑھنے کے لیے اپنا قیمتی وقت بھی ضائع نہ کرنا پڑتا۔ آپ سے محبت اور عقیدت کا سفر ''سفر جاری ہے'' سے شروع ہوا۔ میں نے دستخط کے ساتھ کتاب عنایت کرنے کی فرمائش کر دی۔ آپ نے انتہائی شفقت و مروت سے اک خوبصورت سا بنڈل مجھے بھجوایا۔ کتابوں میں آپ کی خود بینی کے علاوہ دین و دنیا اور آخرت سنوارنے کی کتابیں بھی تھیں۔ میں بہت حیران ہوا۔ اپنی چونسٹھ سالہ زندگی میں اخلاق و مروّت اور خاندانیت کی ایسی اعلیٰ مثال نہیں دیکھی تھی، پھر چند ہی دنوں بعد مجھے ''مشاہیر کے خطوط'' ملی۔ آپ نے اس عاجز کے دو خط بھی شامل کر دیے تھے۔

ملک صاحب! ادب کی دنیا کی خاک چھانتے ہوئے نصف صدی ہونے کو ہے۔ مگر تخلیق و تحریر تو دور کی بات ہے، ابھی تک قرطاس و قلم کا سلیقہ بھی نہیں آیا۔ چھ کتابیں لکھ ماریں لیکن لگتا ہے کہ اک تشنگی سی تشنگی ہے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ کہہ پایا ہوں نہ لکھ

پایا ہوں۔ آپ کی ''مشاہیر کے خطوط'' پر بڑے بڑے اور جغادری اہل قلم کے تبصرے
چھپے۔ میں بھی زلیخا کی طرح اُون کی اٹی لے کر یوسف کی خریداری کے لیے بازارِ مصر پہنچا
پہلی دفعہ مجھے اپنی اس تحریر سے اک تشفی اور اطمینان سا محسوس ہوا کیونکہ میں نے خلوصِ دل
سے ایسے ایسے پہلو آپ کی کتاب سے تلاش کیے جن کی طرف میرے موقّر و معتبر تبصرہ
نگاروں کی یا تو نظر نہیں گئی یا انہوں نے دانستہ اغماض برتا کہ خود وہ بھی زد میں آتے تھے۔
چار پانچ صفحات کا یہ تبصرہ میرے دل کی آواز تھا اور کئی جرائد میں شائع ہوا۔ مجھے محسوس ہوا
کہ یہ آپ کی محبت اور شرافت تھی جو اس تحریر کا موجب بنی۔ یوں لگا جیسے یہ مضمون میری آج
تک کی ساری لکھت پڑھت پر حاوی ہے۔

میں اک دفعہ پھر حاضر ہو گیا ہوں۔ آج کل ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کی بڑی
دھوم مچی ہے۔ آپ نے بہت سے احباب کو فیض یاب کیا ہوگا۔ میں آپ کا اک گمنام
عقیدت مند ہوں۔ آپ کو شاید یاد بھی نہیں ہوگا کہ آپ کا ایک بے نام چاہنے والا ادھر بھی
رہتا ہے۔ اس لیے پوری رام لیلا اُوپر لکھنا پڑی۔ آپ کا دوش نہیں۔

کس کس کو دیپک پیار کرے جب لاکھ پتنگے جلتے ہوں

آپ کے حسنِ سخا یعنی ترسیلِ کتاب کا منتظر رہوں گا۔

کارلائقہ سے یاد فرمائیں۔

آپ کا خلوص کیش۔

غلام بن اعوان

☆☆☆

غلام نبی اعوان

مکرمی مقبول صاحب

السلام علیکم!

زکوٰۃ کا مہینہ ہے، آپ جیسے سخی لوگ اپنے رزق حلال کی کمائی میں سے مسکینوں، غریبوں اور تہی دست لوگوں کو شکرانۂ رب کے طور پر حصّہ دیتے ہیں اور اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ کچھ ادبی مساکین و یتامیٰ بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں ہر وقت ادب زکوٰۃ کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن کی نظریں آپ جیسے مالدار ادبی و علمی شخصیت کی طرف سوالی رہتی ہیں۔

آپ کتابوں پر کتابیں ادب کے میدان میں لا رہے ہیں اور زکوٰۃ کا ایک مستحق دوسروں سے آپ کے جود وسخا کی کہانیاں سُن سُن کر اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے رہے جا رہا ہے۔ دراصل مجھے لگتا ہے کہ علمی مستحقین زکوٰۃ کی اک لمبی فہرست ہے اور ان لوگوں کو یاد گیری کے بغیر آپ مستفیض کرتے رہتے ہیں اور میرے جیسے کم سواد اوران پڑھ بندے کو آگے بڑھ کر خیرات کے لیے اپنا دامن پھیلانا پڑتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ دو ہزار پانچ سو ستر مستفیضین کے آخر میں اکہتر واں نام اس مسکین، یتیم و یسیر شخص کا بھی درج کر دیں تاکہ آئندہ جب بھی لمحۂ جود وسخا آئے تو اس لسٹ میں آپ کو فدوی کی سوالی آنکھیں بھی ادب کی بھوک برساتی ہوئی نظر آئیں اور آپ دان دے ڈالیں۔ ''آپس کی باتیں'' کا بڑا شہرہ ہے۔ آپ کے دستخط کے ساتھ ایک کتاب کا سوال ہے۔ خدا آپ کو دونوں جہان کی خوشیاں نصیب کرے۔

☆☆☆

پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ

ایم۔اے (اردو، تاریخ) ایم ایڈ۔ایم۔او۔ایل۔ایم فل
بھمبر آزاد کشمیر (براہ گجرات)

مکرم ومحترم ملک صاحب!

السلام علیکم! خیریت کا طالب بخیریت ہے، یاد آوری کا شکریہ، یاد آوری اور اتنے خوبصورت تحفے ''برسبیل گفتگو'' کے ساتھ برسبیل گفتگو کا نفسِ مضمون ''ڈاکٹر انور سدید'' کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ یقین جانیے یہ بڑے خاصے کی چیز ہے، ڈاکٹر صاحب نے ادب کے ہر پہلو پر بڑی محققانہ گفت گو کی ہے اور آپ نے اسے بڑی دیدہ زیب گٹ اپ میں محفوظ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئندہ جس بھی صنف پر کوئی قلم اٹھائے گا وہ اس کتاب کا مطالعہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا اور اگر آگے بڑھانے کی جسارت کرے گا اور اس سے دامن بچائے گا تو اس کی کاوش تشنہ ہی رہے گی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ان کی کتاب ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کے حوالے سے ایم فل اُردو میں سمجھنے کی کوشش کی تھی اور اس کے استفادے کے بعد ''تحریکات ادب اُردو'' لکھی تھی جو میری ایک طالب علم یعنی طالبانہ کوشش تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ (ملک مقبول احمد صاحب) پیدائشی ادیب ہیں اور آپ سیانے ادیب ہیں کہ آپ نے اس وقت ادب لکھنا شروع نہیں کیا جب تک بڑے ادیبوں کو پڑھ نہیں لیا اور ان کی کاوشوں کو خوب صورت انداز میں طبع کر کے محفوظ نہیں کر لیا۔ آپ جیسے ادب شناس ناشر اور تاجران کتب سے کتاب کی طباعت یقیناً مشکل مرحلہ رہا ہوگا لیکن آپ کے ادارے ''مقبول اکیڈیمی'' سے منسلک ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کتاب بتاتی ہے کہ آپ کا انتخاب

کس قدر ''مردم شناس'' اور ادب شناس تھا۔اس سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ آپ کس قدر اپنے احباب کا خیال رکھتے ہیں اور انہیں عزت دیتے ہیں۔

آپ کی تازہ تالیف ''بر سبیل گفتگو'' وصول ہوئی اس کے انتساب میں آپ نے جس خوب صورت جملے کے ساتھ مجھے یاد کیا ہے اس سے آپ کا بڑا پن اور کھل کر سامنے آگیا ہے میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔دعاؤں میں یاد رکھیے گا کہ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائیں یا اس میں اصالتاً حاضر ہو کر ممنونیت کا اظہار کروں گا۔انشاءاللہ! آپ کی کتب پر دو تبصرے ارسال خدمت ہیں۔آپ کے رفقائے کار کو بھی ''السلام علیکم!'' والسلام

☆☆☆

رئیس الدین رئیس

۱۷۲۵/۱۰۔دہلی گیٹ،علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱۔یوپی (انڈیا)

المحترم المکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

کل کی ڈاک میں آپ کی محبتوں،شفقتوں کا خزانہ مجھے ملا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔اس عنایت کا بھی شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری حقیرسی تحریرکو اپنی گرانقدر کتاب ''شناسائی'' میں جگہ دے کر میری عزت افزائی فرمائی،جزاک اللہ

''شناسائی'' کے تینوں حصے بہت اہم اور ادب میں آپ کے بیش بہا اضافے کی تائید کر رہے ہیں۔اللہ سے دعا گو ہوں کے مزید بلندیاں آپ اور آپ کے قلم کو عطا فرمائے۔

اس کے علاوہ جو اہم ترین ذریعہ نجات آخرت کی کتب آپ نے مرحمت فرمائی ہیں وہ میری روح میں تازگی اور سرشاری کا سبب ہیں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العالمین آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے اور مجھے ہر کتاب کے ورق،ورق،سطر،سطر سے استفادہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔دل میں ایک تمنا تڑپ کی صورت میں ہر لمحہ رہتی ہے کہ پروردگار مجھے بھی حج وعمرہ کی سعادت عطا فرمادے شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں مالی اعتبار سے بہت زیادہ کمزور ہوں اور صرف دعا ہی کرسکتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ جب اللہ کی رحمت عطا پر آئے گی تو میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی خاک کو چوم کر آنکھوں سے

لگا سکوں گا عمر کا 64 واں سال ہے صحت اشارہ کرتی ہے کہ اب زیادہ وقت نہیں ہے مگر

اک آس بندھی رہتی ہے آنکھوں میں مسلسل
جو خواب کے صحراؤں میں کھونے نہیں دیتی
ہر صبح کا انجام اندھیرا سہی لیکن!
سورج کی لگن رات میں سونے نہیں دیتی

جدہ میں ہر سال مشاعرہ ہوتا ہے اور بانئ مشاعرہ تمام مسلم شعراء کو اپنے اخراجات پر عمرہ کراتے ہیں مگر مشاعروں میں بھی گروپ بازی عام ہوگئی ہے اور میں نے کسی گروپ میں خود کو کبھی نہیں رکھا اور نہ ہی مشاعرے کے حصول کے لیے کسی سفارش کا سہارا لیا ہندوستان کے تو ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اکاڈمیوں کے اہم مشاعروں میں شرکت رہتی ہے مگر جدہ کا مشاعرہ میرے لئے ایک مشاعرہ نہیں بس ذریعۂ سعادتِ عمرہ ہے۔ دیکھئے کب اللہ بلاتا ہے۔

آپ سے دعاؤں کی دست بستہ گزارش ہے۔ مخلصین کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام و دعائیں۔ کارلائقہ سے یاد فرمائیں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اللہ آپ کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔

............☆☆............

مولانا عبدالقیوم حقانی
القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، نوشہرہ (خیبر پی کے)

مخدوم مکرم و معظم جناب ملک مقبول احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! مزاج شریف!

کل دوپہر کو ڈاک سے ''سفر جاری ہے'' اور دیگر دینی کتب موصول ہوئیں عنایت، یادفرمائی اور علمی سوغات کے عطیہ پر شکر گزار ہوں۔

تب سے اب تک کتاب میرے ساتھ رہی کل اسلام آباد ہوٹل میں دفاع پاکستان کونسل کا اجلاس تھا تب بھی میں اپنی سیٹ پر آپ کے ساتھ مشغول رہا۔ تقریر کے لیے مجھے پکارا گیا تو میرے منہ سے پہلا جملہ یہی نکلا کہ ''سفر جاری ہے اور جاری رہے گا منزل قریب ہے سفر کی سمت درست ہے'' اس سے بات آگے بڑھائی۔

میں نے کتاب اس لئے منگوائی تھی کہ جاری سفر کا لائحہ عمل طریق کار اور اہداف پڑھ کر کچھ آداب سفر سیکھ لوں۔ آج صبح کتاب مکمل کر لی۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی | مرا با جان جاں ہمراز کردی

میں نے بہت کچھ سیکھا سب سے بڑھ کر مقصد سے لگن' ہدف سے محبت' حوصلہ، صبر اور استقامت اور ان سب سے بڑھ کر اللہ کی ذات پر اعتماد اور اپنے قوت بازو کی محنت۔

میں نے عرض کیا تھا مجھے کتاب V-P کر دیں، آپ نے ہدیہ بھیج دیا اب میرے لئے پھر خط لکھنا اور طلب مشکل ہو گئی۔ مجھے ذاتی طور پر ''سفر جاری ہے'' طرز کی سوانحات سے لگاؤ ہے محنت، مشقت، ریاضت اور مجاہدہ طبعی افتاد ہے از راہ کرم وعنایت اس نوعیت کی جتنی کتب بھی آپ کے ادارے نے چھاپی ہوں بذریعہ V-P بھیج دیں۔ اس کو حسنِ طلب پر ہرگز حمل نہ کریں کہ میں بھی اسی راہ کا مسافر ہوں۔ اگر V-P نہ بھیج سکیں تو پھر معذرت قبول فرماویں۔ اپنے ادارے کی تعارفی فہرست کتب بھی بھجوا دیں احسان ہوگا۔ ''بے جی'' کے نام انتساب پر مسرت ہوئی میں بھی اپنی ''اماں جی مرحومہ و مغفورہ'' بھیج رہا ہوں ایک نسخہ بابر مقبول کو ایک نسخہ آپ کی نواسی ماریہ، کو پیش کر دیں اور ایک نسخہ آپ کی خدمت میں، بغرض اصلاح پیش خدمت ہے۔ ہاں عزم و ہمت کے حوالے سے ''سراغ زندگی'' بھی بھیج رہا ہوں۔

ایک گزارش یہ بھی ہے کہ سفر جاری کا سستا ایڈیشن بھی چھاپا جا سکتا ہے شروع کی تقاریظ، آخر کے تبصرے وانٹرویوز وغیرہ نکال کر اصل کتاب عمدہ کار ڈکور چڑھا کر اپنے ادارہ کی زکوٰۃ کی رقم سے طلباء میں مفت تقسیم کی جائے یا والدہ مرحومہ کی جانب سے ایصال ثواب کے لئے دینی مدارس میں مفت تقسیم ہو، عزم، ہمت، محنت، مشقت، کام اور کردار کا فروغ ہوگا جو آپ کے لیے اور آپ کے والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا۔

☆☆

عباس خان

واجب الاحترام ملک صاحب!

السلام علیکم!

آپ کی کتاب "۵۰ نامور ادبی شخصیات" مجھے ڈاک سے مل گئی ہے۔ کچھ گھنٹوں کو چھوڑ کر جو زندگی کے اہم ترین دوسرے امور سر انجام دینے کے لیے ضروری ہیں، یہ اس وقت سے اب تک میرے ہاتھوں میں ہے۔ میرے دل میں جشن برپا ہے اور میرا دماغ خیالات کی آماجگاہ ہے۔

فردوسی شاہنامہ میں رُستم کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

منم کردہ اِی رُستم داستاں
وگرنہ ژلے بُود، در سیستاں

میں نے تمہاری داستاں لکھ کر تمہیں رُستم بنا دیا ہے ورنہ تم تو سیستان کے علاقے میں ایک آوارہ حیوان کی طرح تھے۔

برٹرینڈ رسل کو زندگی میں یہ اعزاز بھی ملا کہ وہاں کی زندہ مصنفین کی لائبریری میں اُس کے تذکرے کے لیے پچاس صفحے مختص ہوئے۔

شیکسپیئر نے اپنے اوپر بیتنے والے وقت کا ذکر کیوں کیا ہے،

William Shakespeare-Sonnet#30

When to the sessions of sweet silent thought,

I Summon up rememberance of thingspast,
I sigh the lack of many a thing I sought,
And with old woes new wail my dear time`s waste,
Then can i drown an eye, unused to flow,
For precious friends hid in death`s dateless night,
And weep afresh love`s long-since-cancelled woe,
And moan th` expense of many a vanished sight;
Then can i grieve at grievances foregone,
And heavily from woe to woe tell o`er
The sad account of fore-bemoaned moan,
Which i new pay as if not paid before.
But if the while i think on thee, dear friend,
All losses are restored and sorrows end,

اتھاہ خاموشی تنہائیوں کے ساتھ مل کر جب مجھے یادوں کے ہجوم کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔تو اپنی اُن محرومیوں کا تصور کر کے، جن سے مجھے واسطہ پڑا میں آہوں میں ڈوب جاتا ہوں۔انہی لمحات میں پھر اُن دوستوں کے بچھڑنے کا غم مجھے پاش پاش کر دیتا ہے جو رات جیسی تاریکیوں میں گم ہو گئے۔تاریکیاں جہاں وقت کی رفتار رسائی حاصل کرنے سے بے بس ہے۔ساتھ ساتھ اُن لمحات کا اندوہ جو اسی طرح ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔محرومیوں، اُداسیوں اور اذیتوں کی یورش سے بچ نکلنے کی اچانک مجھے وہ صورت نظر آتی ہے۔جو آپ کے قرب سے وابستہ ہے۔یہ جان کر کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔میں ہر محرومی، ہر اُداسی اور ہر اذیت کو شکست دے دیتا ہوں۔

رومن سلطنت جب اپنے عروج پر تھی تو تمام راستے روم کو جاتے تھے۔

مجھ جیسے افتادۂ خاک کو آپ نے نامور بنا دیا ہے۔اس اہم ترین کتاب میں اتنے بڑے صاحبان علم کے ساتھ آپ نے میرے لیے سوا تین صفحے مختص کر دیئے ہیں۔آپ کے اس کرم نے محرومیوں، اُداسیوں اور اذیتوں کو جو کہ میرا گھیراؤ کئے رکھتی ہیں۔مجھ سے کوسوں

دور کر دیا ہے۔اب تمام اہل قلم کے راستے آپ کی طرف صرف جاتے ہیں۔

خلیل جبران لکھتا ہے ''میں کبھی لاجواب نہیں ہوا سوائے اُس شخص کے سامنے جس نے مجھ سے پُوچھا تُم کون ہو۔''

سرکار! مجھ سے بھی کسی آدمی کو بطور آدمی کے پہچاننے کی کبھی غلطی نہیں ہوئی سوائے آپ کے۔آدمی کے رُوپ میں آپ کون ہیں؟ خدارا ظاہر کر دیجئے۔

3،اپریل،2011ء

☆☆☆

عباس خان

57 گارڈن ٹاؤن، شیر شاہ روڈ ملتان

3 دسمبر 2009ء

عزت مآب ملک مقبول احمد صاحب!

السلام علیکم!

آپ کی کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' مجھے مل گئی ہے۔ میں گھر سے باہر ایک ''بیاباں'' میں تھا۔ کتاب گھر کے پتے پر پہنچی۔ کافی دنوں بعد گھر لوٹا تو اس سے شرف یاب ہوا۔ یوں آپ کی خدمت میں اعترافِ عطا پیش کرنے میں دیر ہوئی ہے۔

آپ تو کمالات دکھائے جا رہے ہیں۔ آپ نے ایک جہان کو گرویدہ بنا رکھا ہے۔ یہ جہان اُن لوگوں کا ہے جو تہذیبوں کی پیدائش کا سبب بن کر اُس یوٹوپیا کی یاد دلاتے ہیں جو تھامس مور کے دل کی آواز تھی۔ ان لوگوں کے دلوں میں جگہ پانا کارِفرہاد سے کم نہیں۔

''پذیرائی'' اور ''اہل قلم کے خطوط'' کو سامنے رکھ کر آپ کی آپ بیتی کی جلد دوم تیار کی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ یہ جہاں بہت عجیب ہے۔ اس لئے کہ نہ قفس ہے اور نہ آشیانہ۔ اُن کے اس مشاہدے کا خیال جب بھی میرے دل میں آیا میں مغموم ہو گیا۔ اس غم کو کم کرنے کا ایک طریقہ مجھے میسر ہو گیا ہے۔ یہ ہے اس جہان میں موجود آپ جیسی شخصیات کا قرب۔

اللہ پاک آپ کو معہ اقرباء عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین

آپ کے کرم کے تابع

عباس خان

ڈاکٹر سلیم اختر

''الجودت'' 569۔سی III جہاں زیب بلاک،

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

محترم ملک مقبول احمد

تسلیم!

شرمندگی کے احساس سے معذرت نامہ لکھ رہا ہوں کہ آپ تشریف لائے اور میں غسل خانہ سے جلد نہ نکل سکا لہٰذا آپ ملاقات کے بغیر تشریف لے گئے۔ دراصل اب کرنے کو کچھ نہیں اس لئے رات ایک دو بجے سے پہلے سوتا نہیں اور صبح نو دس سے پہلے جاگتا نہیں۔ اتوار کو مزید تاخیر ہو جاتی ہے کہ اتوار تو ہوتی ہی سونے کیلئے ہے۔ جب کالج جاتا تھا تو ساری عمر پہلا پیریڈ پڑھایا اور انتشار حالات سے قطع نظر کلاس میں بھی لیٹ نہ ہوا لیکن اب دس بجے سے پہلے اٹھا نہیں جاتا یہ ہیں ریٹائرمنٹ کے مزے۔

کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' کے ساتھ مزید کتابوں کے تحفہ کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ آپ ہمیشہ ہی بڑے دیدہ زیب انداز میں کتابیں شائع کرتے ہیں۔ اور یہ کتاب بھی آپ کی جمالیاتی حسن کی آئینہ دار ہے۔ دیباچہ نگار کی حیثیت سے اس کتاب میں میری شمولیت باعثِ عزت ہے جس کے لیے شکریہ۔

آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' کے بعد ''اہل قلم کے خطوط'' آپ کی شخصیت کا وہ رخ دکھاتے ہیں جو آپ کے مصنفین کی تحریروں سے اجاگر ہوتا ہے آپ بیتی ایک محنتی اور صاحبِ کردار شخص کی جدو جہد کی داستان ہے تو خطوط کے ذریعہ سے آپ کی دیانتداری، نیک نیتی، دل نوازی اور دل داری کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس شخص میں یہ سب صفات موجود ہوں اس کے بھلا مانس ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اللہ آپ کو رحمت و سلامتی سے خوش و خرم رکھے۔ آمین

قاضی عبدالقدیر خاموش

سیکرٹری جنرل PDF

محترم جناب ملک مقبول احمد صاحب!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ':

مزاج گرامی؟

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور قومی خدمات سرانجام دینے میں مصروف عمل ہوں گے۔ آپ کا اور آپ کے ادارے کا تعارف تو بچپن سے ہی ہو گیا تھا اور آپ کے ادارے کی شائع شدہ کئی تاریخ ساز کتب پڑھنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ برادرم عزیز احمد اعوان سیکرٹری جنرل تعمیر پاکستان پارٹی کے ذریعہ آپ کی تصنیف پیغمبر عالم ﷺ تحفہ میں ملی۔ اتنی خوبصورت کتاب میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس وقت صرف اُردو زبان میں 5 ہزار سے زائد سیرت النبی ﷺ کی اُردو میں کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان تمام کتب میں سے آپ کی کتاب سب سے جامع اور سب سے خوبصورت کتاب ہے۔ یہ آپ کی رسالت دو عالم ﷺ سے انتہائی عقیدت اور محبت کا عملی ثبوت ہے۔ جس طرح جناب ولی محمد رازی صاحب کی سیرت النبی ﷺ کی کتاب ہادی عالم جو تقریباً 4 سو صفحات پر مشتمل ہے بغیر نقطوں کے ہے۔ یہ اُن کی ایسی بے مثل مایۂ ناز کتاب ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کتاب پر انھیں صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے آپ نے بھی اِسی طرح انتہائی مدلل جامع خوبصورت کتاب پیغمبر عالم ﷺ شائع کر کے کمال کر دیا ہے۔ ہم آپ کو اس لازوال کارنامہ سرانجام دینے پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور دُعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا خاص فضل جاری رکھے اور اِسی طرح آپ نیک کام کرتے رہیں۔

والسلام

قاضی عبدالقدیر خاموش

حافظ حسین احمد حقانی

جامعۃ الاسلامیۃ الفریدیہ
کانگڑہ شبقدر فورٹ ضلع چارسدہ

14 فروری 2010ء

مکرمی و معظمی جناب الحاج ملک مقبول احمد صاحب مدظلہ العال

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ

تین چار دن پہلے ہمارے شیخ و مرشد شیخ الحدیث مولانا مفتی ایاز احمد حقانی صاحب مدظلہ نے آپ کی مؤقر کتاب پیغمبر عالم ﷺ کو مدرسہ میں طلباء کو صبح درس قرآن شریف کے بعد سپیکر کے ذریعہ سے سبقاً سبقاً طلباء و طالبات کو ختم فرمایا پشتو زبان میں حضرت اقدس بہت اچھے انداز سے پڑھا رہے تھے۔

جس دن کتاب مبارک ختم ہوا۔ حضرت نے اپنے جیب خاص سے شیرینی منگوائی اور طلباء میں تقسیم فرمائی۔ آپ کے لئے بہت دعائیں کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

حضرت صاحب فرمارہے ہیں کہ اس مبارک کتابوں کا پشتو میں ترجمہ ہم کرینگے اگر ملک صاحب اس کو اچھے انداز سے اپنے ادارے سے چھاپ دیں تو بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ پشتون حضرات میں بھی اس مبارک کتاب کی اشاعت ہوگی اور صدقۂ جاریہ رہیگا۔

100 کتب اگر مشکل نہ ہو تو ارسال فرمادیں۔ مدارس میں عمل شروع کرائیں گے۔ آپ کا سفرنامہ حج، اہل قلم کے خطوط، سفر جاری ہے و دیگر کتب مدرسہ کی لائبریری کے لئے بھی ارسال فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت نصیب فرماوے۔ آمین

حافظ حسین احمد حقانی

میاں محمد سعید شاد

408۔رحمانپورہ کالونی، لاہور

برادر جاں جناب ملک مقبول احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیز واقارب اور دوست احباب اپنے عزیزوں کی یاد میں سالگرہ کا کیک ذبح کر کے کھاتے ہیں۔اچھی بات ہے محبت، پیار، خلوص اور ادب وآداب کے لحاظ سے اچھی رسم ہے مگر اصل بات بے لوث محبت اور دلی خلوص کی ہے۔اللہ تعالیٰ صحت وتندرستی کے ساتھ آپ کی عمر دراز کریں۔قرطاس وقلم طباعت واشاعت کی خدمات یقیناً مخلوق خدا کے لیے سودمند ہیں۔میں عمر زیست کے 82 سال گزار چکا ہوں۔قرآن کریم میں شاید دو جگہ طول عمر کے بارے میں آیا ہے (i) سورۃ نحل آیت نمبر 70 (اور تم میں سے کوئی لوٹا دیا جاتا ہے ناکارہ عمر کی طرف جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باخبری کے بعد چیزوں سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ (ii) سورۃ یٰس آیت نمبر 68 ''جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اس کی ساخت کو ہم الٹ کر ہی دیتے ہیں۔کیا یہ حالت دیکھ کر انہیں عقل نہیں آتی، ہم جیسے بوڑھوں کی شکل وصورت میں عجیب وغریب تغیر وتبدل واقع ہو جاتا ہے۔شیخ سعدیؒ نے انسانی زندگی کے پانچ دور گنوائے ہیں۔(i) بچپن (ii) لڑکپن (iii) جوانی (iv) بڑھاپا اور (v) پیر فرتوت۔(وہ شخص جو کبڑا ہو جائے)۔کسی نے کہا ہے

عمر زیست کا ایک باب اور ختم ہوا
شباب ختم ہوا، ایک عذاب ختم ہوا

ہمارا حال تو یہ ہے کہ:

زندگی بھر سب کو میں تنہا لگا
مر گیا تو پھر میرا میلا لگا

آپ تو ابھی جوان ہیں۔ ہمیں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ میری طرف سے بھی مبارک قبول فرمائیں۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار عقیق کٹا تب نگیں ہوا

☆☆☆

نیا علمِ شفا بخشی......از......لوئی کوہنی

مقبول اکیڈمی، چوک اُردو بازار (سرکلر روڈ) لاہور نے گزشتہ صدی کے مقبول ماہر صحت ''لوئی کوہنی'' کی مشہور کتاب ''دی نیو سائنس آف ہیلنگ'' (The New Science of Healing) کے اُردو ترجمہ (از: سروتر یہ کرشن سروپ) ''نیا علم شفا بخشی'' کی تلخیص بہت خوبصورت انداز سے شائع کی ہے یہ تلخیص اکیڈمی کے بانی ملک مقبول احمد نے خود کی ہے۔ پیشِ نظر کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے اب تک دوسو ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اسؔ کا ترجمہ دنیا کی 25 مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے ملک مقبول احمد نے جس اُردو ترجمہ کی تلخیص کی ہے یہ 1931ء میں آٹھویں مرتبہ شائع ہوا تھا جبکہ اس کا پہلا ایڈیشن 1904ء میں شائع ہوا تھا۔ فاضل تلخیص نگار کا کہنا ہے کہ ''اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جملہ امراض خواہ ان کے نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں ایک ہی سبب سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور ان کا علاج بھی ایک ہی طریقہ سے ہے اور یہ طریقۂ علاج قوانینِ قدرت پر مبنی ہے لہٰذا ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر ایک شے جو ہم معدہ میں داخل کرتے ہیں وہ ہضم کرنی پڑتی ہے۔ تندرست معدہ بھی غذا کی ایک خاص مقدار ہی ہضم کر سکتا ہے اس سے زیادہ ہر شے خواہ کتنی ہی لذیذ اور اچھی ہو اس کے لئے زہر ہے اگر وہ ہضم نہ ہو تو۔

جسم میں فاسد مادہ کی موجودگی کا نام ہی مرض ہے اگر اس فاسد مادہ کو جسم سے معقول طریقہ سے خارج کر دیا جائے تو مرض خود بخود دور ہو جائے گا اور جسم اپنی اصل حالت میں آ جائے گا دائمی تندرستی اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے لئے کھانے پینے میں اعتدال نہایت ضروری ہے۔" کتاب میں پانی سے علاج اور احتیاطی تدابیر کی خوب کثرت ہے نیز کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے جو بالکل درست ہے کہ اس کے مندرجات کے مطابق عمل کرنے سے ہر شخص خواہ کسی بھی تکلیف میں مبتلا ہو تندرستی حاصل کر سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مفید، دیرپا، مؤثر اور فطری طریقۂ علاج پر اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے جس پر فاضل تلخیص نگار مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں خدا ان کی اس سعی کو مشکور فرمائے۔

ماہنامہ "سوئے حجاز" لاہور

04-10-2011

............☆☆............

انوار فیروز

پاکستان میں کتاب پڑھنے کا شوق کم سے کم ہوتا جارہا ہے اس کا اندازہ اسی بات سے کیجیے کہ 18 کروڑ کی آبادی کے ملک میں کتاب زیادہ سے زیادہ ایک ہزار شائع ہوتی ہے جہاں تک ادبی رسائل کا تعلق ہے ان کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ حکومت انہیں اشتہار نہیں دیتی اور ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت رسالے خرید کر پڑھنا نہیں چاہتی۔ بہر حال اس صورتحال میں ہم چند کتابوں اور رسالوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

شناسائی کے نام سے مقبول اکیڈمی لاہور کے مالک ملک مقبول احمد نے ایک کتاب مرتب کی۔ ملک مقبول احمد اپنے آپ کو ادیب نہیں لیکن انہوں نے ''سفر جاری ہے'' کے نام سے اپنی خودنوشت لکھی تو وہ بہت مقبول ہوئی۔ پھر پذیرائی لکھی۔ پروفیسر جمیل آذر نے ملک صاحب کے بارے میں راہ نوردشوق لکھی۔ اس کے بعد ملک صاحب نے اپنا ترکی کا سیاحت نامہ شائع کیا۔ مختلف لوگوں نے ان کی کتابوں کے بارے میں جو مضامین لکھے وہ انہوں نے شناسائی میں شامل کیے۔ ساتھ ہی لکھنے والوں کا تعاون اور تصویر بھی شائع کی۔ شناسائی کے حصہ اول میں ''سفر جاری ہے'' حصہ دوم میں پذیرائی اور رسوم میں محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان، بانو قدسیہ، محمد آصف بھلی، جبار مرزا، محبوب الرسول قادری، علامہ عبدالستار عاصم، پروفیسر شبیر زاہد،

شفیع ہمدم، انوار فیروز، صائمہ نورین بخاری، عنبرین تبسم شاکر، شاہد بخاری، گوہر ملیسانی، پروین طارق، دردانہ نوشین خان، ایم آر شاہد، صابر آفاقی، شہزاد منیر احمد، رئیس الدین رئیس، علامہ ایاز ظہیر ہاشمی، حافظ حسنین احمد، سید سلیمان گیلانی، عبدالقیوم، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگوں کے مضامین شامل ہیں جنہوں نے ملک مقبول احمد کو بلاشبہ ایک اچھا ادیب اور ناشر قرار دیا ہے۔

☆☆☆

کوائف

ملک مقبول احمد

• • •

نام: ملک مقبول احمد

والد کا نام: ملک لال دین

تاریخ پیدائش: 22 جنوری 1930ء بروز بدھ

بمقام: ڈیووال تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ

قبیلہ: اعوان

تعلیم: باجڑہ گڑھی اور رسُول پور بھلیاں ضلع سیالکوٹ میں ورنیکلر مڈل تک۔

ملازمت: ٹیچرز ٹریننگ (نارمل) سکول نارووال میں ایک سال کی ٹریننگ کے بعد گورنمنٹ سکول کلوئے ضلع سیالکوٹ میں بحیثیت اوّل مدرس (ہیڈ ماسٹر) 2 سال ملازمت کی۔

ادارت: ☆ پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' لاہور تقریباً چار سال تک باقاعدگی سے شائع کیا۔ اس میگزین کے ادبی نگران احسان دانش صاحب تھے۔

☆ ماہنامہ ''نئے زاویے'' لاہور تقریباً ایک سال تک شائع کیا۔

عملی زندگی: ☆ رسالہ پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' لاہور

☆ ماہنامہ ''نئے زاویے'' لاہور

☆ ''پی آئی بی سی پبلشنگ ہاؤس''

☆ ''پی' آئی' بی' سی پرنٹنگ پریس''

☆ ''بستان ادب'' پبلشنگ ہاؤس

☆ ''مقبول پیپر اینڈ بورڈ ملز''

☆ ''مقبول اکیڈمی'' پبلشرز، بک سیلرز

☆ ''خورشید مقبول پرنٹنگ پریس''

شادی: ☆ اپنے خاندان میں ہوئی۔

اولاد: ☆ دو بیٹے ڈاکٹر ظفر مقبول، ڈاکٹر ارشد مقبول اور ایک بیٹی ڈاکٹر شہنیلا وحید ہیں۔ تینوں ڈاکٹر ہیں (الحمد للہ)

☆ تینوں نے تھوڑا عرصہ گورنمنٹ سروس کی اور پھر میرے ساتھ پبلشنگ کے کاروبار میں شامل ہو گئے۔

تصنیفات و تالیفات:

1- ''سفر جاری ہے'' (خودنوشت) / 2007ء

2- ''پذیرائی'' (''سفر جاری ہے'' پر لکھے گئے مشاہیر کے مضامین) / 2007ء

3- ''پیغمبر عالم ﷺ'' (سیرت) / 2008ء

4- ''اہل قلم کے خطوط'' (مصنفین کے ادبی خطوط) / 2009ء

5- ''گلشن ادب'' (میگزین ''چودھویں صدی'' سے انتخاب) / 2010ء

6- ''گمشدہ افسانے'' (میگزین ''چودھویں صدی'' سے انتخاب) / 2010ء

7- ''ارمغانِ غزل'' (میگزین ''چودھویں صدی'' سے انتخاب) / 2010ء

8- ''نیا علم شفا بخشی'' (ڈاکٹر لوئی کوہنی کی کتاب کے اردو ترجمہ کی تلخیص) / 2010ء

9- ''سیاحت نامہ ترکی'' (سفرنامہ) / 2011ء

10- ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' (خاکے) / 2011ء

11- ''شناسائی'' (''سفر جاری ہے'' پر لکھے گئے مشاہیر کے مضامین) / 2011ء

12- ''آپس کی باتیں'' (ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز کا انتخاب) / 2012ء

13- ''برسبیلِ گفتگو'' (ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز کا انتخاب) / 2012ء

14- ''سفرِ آرزو'' (حج کا سفرنامہ مع تاریخی پس منظر) / 2012ء

15- ''تعلیماتِ قرآن'' (منتخب قرآنی آیات کا اردو ترجمہ) / 2012ء

16- ''ذوقِ نظر'' (پروفیسر جمیل آذر کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب) / 2013ء

17- ''ادب شناسی'' (میری مرتب کتب پر لکھے گئے مشاہیر کے تبصرے) / 2013ء

تالیفات: جو شائع کر کے فی سبیل اللہ تقسیم کی جا رہی ہیں۔

1- ''پیغمبر عالم ﷺ''

2- ''خطبہ حجتہ الوداع''

3- ''احکام القرآن''

4- ''قرآنی دُعائیں''

5- ''رہنمائے حج عمرہ''

6- ''تحفۂ حدیث''

7- ''صلّو علیہ وآلہٖ''

اعزازات: ☆ ''قرآن وامن کانفرنس'' منعقدہ 20 فروری 2010ء میں رضویہ ٹرسٹ کا لائف اچیومنٹ ایوارڈ۔ (صدارت:۔ امیر محبت خان مری)

☆ قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کا علمی اورادبی خدمات پر ''گولڈ میڈل'' (صدارت:۔صاحبزادہ مفتی محمد وحید قادری)

☆ عظیم آرافاؤنڈیشن کی طرف سے ''گولڈ میڈل'' (صدارت:۔ڈاکٹر انور سدید)

☆ پاکستان رائیٹرگلڈز پنجاب کا ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایوارڈ'' (صدارت:۔ماجد یزدانی)

☆ علی اکبر گروپ آف انڈسٹریز کی طرف سے ادبی خدمات پر ''گولڈ میڈل'' (صدارت:۔ سعد اکبر خان)

☆ خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ایک سو سے زیادہ مشاہیر اہلِ قلم نے بیش قیمت مضامین لکھے اور خراجِ تحسین پیش کیا۔

☆ مقبول اکیڈمی کے زیر اہتمام اب تک ڈیڑھ ہزار سے زیادہ علمی، ادبی اور تاریخی کتب شائع کی ہیں (الحمدللہ)۔

☆ پروفیسر جمیل آذر نے اپنی کتاب ''راہ نوردِ شوق'' میں میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ایک دلآویز، سادہ مگر پُرتاثیر طویل انشائی تنقیدی جائزہ پیش کیا۔

☆ ''نشاطِ سفر'' میری کتاب ''سیاحت نامۂ تُرکی'' پر ایجوکیشن یونیورسٹی لاہور کی طالبہ سیّدہ حلیمہ احمد نے ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی زیرنگرانی ایم اے اردو کا مقالہ تحریر کیا۔

☆ مقبول اکیڈمی نے معروف ادیب ڈاکٹر انور سدید اور اے حمید کی سب سے زیادہ کتابیں شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

احسانات: ☆ میگزین ''چودھویں صدی'' کی اشاعت میں جناب احسان دانش نے میری رہنمائی کی۔

☆ مقبول اکیڈمی کے قیام اور کاروبار کے آغاز میں جناب رئیس احمد جعفری، جناب قمر نقوی، جناب احسان الحق سلیمانی، جناب عبدالعزیز خالد، مولانا حامد علی خان، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، جناب میرزا ادیب اور جناب اے حمید نے میرے ساتھ پُرخلوص تعاون کیا۔

☆ ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، جناب علی سفیان آفاقی، پروفیسر جمیل آذر، جناب محمد آصف بھلی، جناب سعید بدر، جناب اظہر جاوید، ڈاکٹر صفدر محمود، جناب قاضی ذوالفقار احمد جناب ظفر علی راجا، سید واجد رضوی، سید قاسم محمود، ڈاکٹر تنویر حسین، پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد، محترمہ عذرا اصغر، محترمہ بلقیس ریاض، پروفیسر محمد مظفر مرزا، علامہ عبدالستار عاصم اور جناب ناصر نقوی نے ادبی اور اشاعتی سفر میں اپنی گراں قدر معاونت سے سرفراز کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔

ملک مقبول احمد

- پذیرائی
- سفر جاری ہے
- اہل قلم کے خطوط
- شناسائی
- گلشنِ ادب
- ارمغانِ غزل
- گمشدہ افسانے
- آپس کی باتیں
- برسبیل گفتگو
- سیاحت نامہ ترکی
- نیا علم شفا بخشی
- ۵۰ نامور ادبی شخصیات
- سفرِ آرزو
- تعلیماتِ قرآن
- پیغمبر عالم ﷺ
- صلو علیہ و آلہ
- احکام القرآن
- قرآنی دُعائیں
- رہنمائے حج و عمرہ
- تحفۂ حدیث
- خطبہ حجتہ الوداع

آپ میرے ساتھ ضرور اتفاق کریں گے کہ مقبول اکیڈمی
لاہور کے ناشر ملک مقبول احمد قدرت کا کرشمہ ہیں اور یہ
کرشمہ اس وقت ظہور میں آیا جب ملک صاحب کے باطن
سے اچانک ایک ادیب نکل آیا اور وہ ملک کے بے شمار نامور
ادیبوں، افسانہ نگاروں، شاعروں اور دانشوروں کی کتابوں کو
زیور طباعت سے آراستہ کرنے اور اشاعت کی کامیاب
منزل سے گزارنے کے بعد اپنی کتابیں بھی چھاپنے لگے اور
دیکھتے ہی دیکھتے متعدد ضخیم کتابوں کے مصنف اور مولف بن گئے اور اپنی خرگوش رفتاری سے ساری
زندگی ادب کی ریاضت کرنے والے ادیبوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس حقیقت کی صداقت ان تبصروں سے بھی ہمارے سامنے آتی ہے جو زیر نظر کتاب میں
پیش کیے جا رہے ہیں۔ فن اور شخصیت کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کے متعدد ادیبوں پر نظر
افروز کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی ادیب کو اپنی کسی ایک معروف ترین تصنیف پر اتنی
بڑی تعداد میں تبصرے نصیب نہیں ہوئے جتنے ملک مقبول احمد کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں اور تبصروں کی
یہ کتاب بھی اولیت کا درجہ رکھتی ہے اور مطالعہ کا انوکھا مواد فراہم کرتی ہے۔ دعا ہے کہ ان کا گلشن ادب
مہکتا رہے۔ (آمین)   ڈاکٹر انور سدید